کہاں سے لاؤں اُنھیں

مظہر محمود شیرانی

مظہر محمود شیرانی کی دیگر کتابیں

تصانیف

- حافظ محمود شیرانی کی علمی و ادبی خدمات (جلد اوّل و دوم)
- بے نشانوں کا نشاں (خاکے)

تالیفات

- مقالاتِ حافظ محمود شیرانی (جلد اوّل تا دہم)
- حافظ محمود شیرانی کی علمی و ادبی خدمات (جلد اوّل و دوم)
- مکاتیبِ حافظ محمود شیرانی
- حافظ محمود شیرانی (کتابیات)
- جادۂ نسیاں از حکیم سید محمود احمد برکاتی
- مشاہداتِ فرنگ از حکیم سید محمود احمد برکاتی
- منتخب مقالات از حکیم سید محمود احمد برکاتی

ترجمہ

- معرباتِ رشیدی

کہاں سے لاؤں اُنھیں

(خاکے)

مظہر محمود شیرانی

القا پبلیکیشنز
ریڈنگز کا اشاعتی ادارہ
لاہور

اشاعتِ اوّل
القا پبلیکیشنز 2011

یہ کتاب 'ریڈنگز' لاہور اور پاکستان کے دیگر نمایاں کتاب فروشوں کے ہاں دستیاب ہے
جن کی معلومات القا پبلیکیشنز کی ویب سائٹ پر موجود ہیں۔

'القا پبلیکیشنز' اور 'ریڈنگز' الان وتال پرائیویٹ لمیٹڈ کے ذیلی ادارے ہیں۔

انٹرنیشنل سٹینڈرڈ بک نمبر (ISBN)
978-969-947324-1

سرورق: مریم محمود

خطاطی: نوری نستعلیق (14)

طباعت
الکریم پریس، آؤٹ فال روڈ، لاہور

القا پبلیکیشنز

12-K، مین بلیوارڈ، گلبرگ 2، لاہور 54660
پاکستان

فون: 92 42 3575 7877
فیکس: 92 42 3575 5576
info.ilqapublications@readings.com.pk
www.ilqapublications.readings.com.pk

یہ لوگ تذکرے کرتے ہیں اپنے لوگوں کے
میں کیسے بات کروں اب کہاں سے لاؤں ''اُنھیں''

(احمد فراز)

فہرست

تمنا کا تیسرا قدم

مظہر محمود شیرانی اپنے کام کے تناظر میں

حافظ محمود شیرانی اور اختر شیرانی کے ناموں سے کون واقف نہیں ہے۔ والد نے تحقیق کو اپنا اوڑھنا بنایا تو بیٹے نے شاعری کو بچھونا۔ شرافت، خلوص، عزم دونوں ہی کی مشترک صفات رہیں۔ ٹونک اور لاہور کے ذکر کے بغیر دونوں ہی کی شخصیتوں کو جاننا ناممکن ہے۔ بظاہر دیکھنے میں دونوں الگ الگ دنیاؤں کے مسافر معلوم ہوتے ہیں مگر حقیقت حال یہ ہے کہ دونوں ریت پر ہوا سے مٹ چکے نشانوں کے متلاشی رہے۔ دونوں کی صفات کا پرتو مظہر محمود شیرانی کو وراثت میں ملا۔ دادا حافظ محمود شیرانی کی طرح نہ صرف محققانہ طبیعت پائی بلکہ ''اے عشق ہمیں برباد نہ کر'' جیسی شہرہ آفاق نظمیں لکھنے والے شاعر اختر شیرانی کی شیریں بیانی کا اعجاز بھی اِن کے حصے میں آیا۔ تاریخ اور فارسی زبان سے لگاؤ کی وجہ سے وہ اجداد سے منتقل ہونے والے علمی، فکری وادبی تسلسل کو آگے بڑھانے میں کامیاب رہے۔

حافظ محمود شیرانی اور اختر شیرانی کے خاندان کی تصویر، مظہر محمود شیرانی ۹ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو راجپوتانہ کی ریاست جودھ پور کے گاؤں شیرانی آباد میں پیدا ہوئے۔ دربار ہائی سکول ٹونک اور میونسپل ہائی سکول لاڑکانہ (سندھ) سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد پنجاب چلے آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ ۱۹۵۲ء میں آپ نے گورنمنٹ ہائی سکول شیخوپورہ سے میٹرک کیا اور پھر ۱۹۵۶ء تک اسلامیہ کالج ریلوے روڈ (لاہور) سے ایف اے اور بی اے کیا۔ تاریخ کے مضمون سے دلچسپی انہیں وراثت میں ملی تھی اب تاریخ میں ایم اے کرنے کے لیے ان کا مسکن گورنمنٹ کالج لاہور ٹھہرا۔ ۱۹۵۸ء میں ایم اے تو کرلیا مگر تاریخ سے دلچسپی انہیں فارسی کی پُرخار مگر دلچسپ دنیا تک لے آئی۔

گذشتہ ۱۰۰۰ سال سے یہاں فارسی ہی تو رائج تھی کہ جو بھی اس خطہ کی تاریخ کے مآخذ جاننا چاہتا ہے اسے اگر فارسی نہ آتی ہو تو وہ اکثر و بیشتر دلدلوں ہی میں گھرا رہتا ہے۔ اورینٹل کالج سے اس خانوادے کے تعلق کا ایک زمانہ گواہ ہے کہ اب انہوں نے اسی ادارے سے ایم اے فارسی کیا۔ بس گھڑا بھرنے جو دریا کنارے گئے تو پھر گھڑا بھول کر پانی کے اسرار کو جاننے ہی میں عمر گزار دی۔ فارسی کے ایسے اسیر ہوئے کہ تادم تحریر اسی دشت کے ہو کے رہ گئے۔

۱۹۶۰ میں گورنمنٹ کالج مظفر گڑھ میں فارسی پڑھانے لگے۔ ۱۹۶۳ میں شیخوپورہ آ گئے اور پہلے گورنمنٹ انٹر کالج شیخوپورہ اور بعد میں گورنمنٹ ڈگری کالج شیخوپورہ میں فارسی پڑھاتے رہے۔ ۱۹۶۹ میں فارسی کے مشہور استاد و دانشور ڈاکٹر ظہور الدین احمد صاحب انہیں گورنمنٹ کالج لاہور لے آئے کہ جب خود ظہور صاحب ریٹائرڈ ہونے کے نزدیک تھے۔ ٹرین یا بس میں روزانہ شیخوپورہ سے لاہور آنا تو ان دنوں جان جوکھوں کا کام تھا کہ اس سے جستجوئے علم میں یکسوئی نہ ہونے کا خدشہ لاحق ہوا۔ بس ظہور صاحب سے کہہ کہا کر دوبارہ تبادلہ گورنمنٹ ڈگری کالج شیخوپورہ کروانے ہی میں عافیت جانی۔ یہ بھی خوب رہا، لوگ تو گورنمنٹ کالج لاہور آنے کو ترستے تھے مگر قلندر صفت تو وہی کرتے ہیں جو من بھائے۔ بس شیخوپورہ میں بیٹھ کر اپنے دادا حافظ محمود شیرانی پر پی ایچ ڈی بھی شروع کر دی اور تحقیق و تالیف کا کام بھی کرتے رہے۔ ایسا کیوں نہ ہوتا، وہ تو بازار کے ہنگاموں سے دور بھاگے ہی اس لیے تھے کہ تحریر و تحقیق میں رچ جائیں۔ پی ایچ ڈی کی تکمیل کی کہانی تو ایسی ہے کہ اس پر وہ الگ کتاب بھی لکھ سکتے ہیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو شاید ہمارے ہاں اعلیٰ تعلیم کی معتبری اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر لے۔ خدا خدا کر کے ۸۰ کی دہائی میں جا کر کہیں پی ایچ ڈی ہوئی اس داستانِ کو وہ تاحال لوح دل میں محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ ۱۹۹۵ میں اسی کالج سے ریٹائرڈ ہوئے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ وہ تو کمبل کو کب کا چھوڑ چکے ہیں مگر کمبل ان کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ بس ۲۰۰۳ میں ۵۱ جلدوں پر مشتمل فارسی ڈکشنری ''لغت نامۂ دہخدا'' کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کی کشش انہیں دوبارہ گورنمنٹ کالج کھینچ لائی۔ ۶۷ سال کی عمر میں ماسوائے ہفتہ اور اتوار، ہر روز شیخوپورہ سے گورنمنٹ کالج لاہور آتے ہیں۔ وہ تمام عمر منزلِ مقصود سے بیگانہ رہے کہ ان کے ہاں شوقِ علم کے لامتناہی سفر کو ہی معتبری حاصل رہی۔ اب ذرا، ان کے کیے کاموں کی تفصیل بھی جان لیں کہ اس میں تالیف بھی ہے اور تحریر بھی، تراجم بھی اور مضامین بھی۔

مطبوعہ کتب

۱- مقالاتِ حافظ محمود شیرانی جلد اوّل (ترتیب وتدوین) - مجلسِ ترقی ادب، لاہور - ۱۹۶۶ء
۲- مقالاتِ حافظ محمود شیرانی جلد دوم (ترتیب وتدوین) - مجلسِ ترقی ادب، لاہور - ۱۹۶۶ء
۳- مقالاتِ حافظ محمود شیرانی جلد چہارم (ترتیب وتدوین) - مجلسِ ترقی ادب، لاہور - ۱۹۶۸ء
۴- مقالاتِ حافظ محمود شیرانی جلد سوم (ترتیب وتدوین) - مجلسِ ترقی ادب، لاہور - ۱۹۶۹ء
۵- مقالاتِ حافظ محمود شیرانی جلد پنجم (ترتیب وتدوین) - مجلسِ ترقی ادب، لاہور - ۱۹۷۰ء
۶- مقالاتِ حافظ محمود شیرانی جلد ششم (ترتیب وتدوین) - مجلسِ ترقی ادب، لاہور - ۱۹۷۰ء
۷- مقالاتِ حافظ محمود شیرانی جلد ہفتم (ترتیب وتدوین) - مجلسِ ترقی ادب، لاہور - ۱۹۷۶ء
۸- مقالاتِ حافظ محمود شیرانی جلد ہشتم (ترتیب وتدوین) - مجلسِ ترقی ادب، لاہور - ۱۹۸۵ء
۹- مقالاتِ حافظ محمود شیرانی جلد نہم (ترتیب وتدوین) - مجلسِ ترقی ادب، لاہور - ۱۹۹۹ء
۱۰- مقالاتِ حافظ محمود شیرانی جلد دہم (ترتیب وتدوین) - مجلسِ ترقی ادب، لاہور - ۲۰۰۷ء
۱۱- حافظ محمود شیرانی کی علمی وادبی خدمات جلد اوّل - مجلسِ ترقی ادب، لاہور - ۱۹۹۳ء
۱۲- حافظ محمود شیرانی کی علمی وادبی خدمات جلد دوم - مجلسِ ترقی ادب، لاہور - ۱۹۹۵ء
۱۳- مکاتیبِ حافظ محمود شیرانی (فراہمی اور ترتیب) - مجلس یادگارِ حافظ محمود شیرانی، لاہور - ۱۹۸۱ء
۱۴- حافظ محمود شیرانی (کتابیات) - مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد - ۱۹۹۱ء
۱۵- معربات رشیدی (ترتیب وترجمہ) - ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی - ۲۰۰۳ء
۱۶- بے نشانوں کا نشاں (خاکے) - اساطیر، مزنگ روڈ، لاہور - ۲۰۰۶ء
۱۷- جادۂ نسیاں از حکیم سید محمود احمد برکاتی (ترتیب وتعارف) - کتاب سرائے، لاہور - ۲۰۰۹ء
۱۸- مشاہداتِ فرنگ از حکیم سید محمود احمد برکاتی (ترتیب وتعارف) - ویسٹ پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور - ۲۰۱۰ء
۱۹- منتخب مقالات از حکیم سید محمود احمد برکاتی (ترتیب وتعارف) - ویسٹ پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور - ۲۰۱۱ء

تحقیقی مقالات

۱- حافظ محمود شیرانی اور بابائے اردو - قومی زبان بابائے اردو نمبر، کراچی - ۱۹۶۶ء

۲- مظہری کشمیری - تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند - پنجاب یونیورسٹی، لاہور - ۱۹۷۱ء

۳- غنی کشمیری - تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند، پنجاب یونیورسٹی - لاہور - ۱۹۷۱ء

۴- دیگر شعرائے کشمیر - تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند - پنجاب یونیورسٹی، لاہور - ۱۹۷۱ء

۵- حافظ محمود شیرانی کا مجموعہ مخطوطات - ماہِ نو، لاہور - ۱۹۸۰ء

۶- سوانح حافظ محمود شیرانی - عریبک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹیٹیوٹ جرنل، ٹونک، انڈیا - ۸۲-۱۹۸۱ء

۷- حافظ محمود شیرانی بحیثیت کتاب شناس - کتاب شناسی، اسلام آباد - ۱۹۸۶ء

۸- حرف حرف مے خانہ - غالب نامہ، غالب انسٹیٹیوٹ، نئی دہلی، انڈیا - ۱۹۸۶ء

۹- آرسی نامہ مولا شاہ - روزنامہ امروز، لاہور - ۱۹۸۹ء

۱۰- محمود شیرانی کا اسلوبِ نگارش - حافظ محمود شیرانی (تحقیقی مطالعہ) - غالب انسٹیٹیوٹ، نئی دہلی، انڈیا - ۱۹۹۱ء

۱۱- محمود شیرانی کا تحقیقی طریقِ کار - تحقیق، شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی، جام شورو - ۱۹۹۱ء

۱۲- تذکرۂ مخزن الغرائب و انیس العاشقین - تحقیق، شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی، جام شورو - ۱۹۹۲ء

۱۳- علامہ اقبال اور حافظ محمود شیرانی کے روابط - سہ ماہی اقبال، لاہور - ۱۹۹۷ء

۱۴- خورشید احمد خان یوسفی - لب جو، گورنمنٹ کالج، سانگلہ ہل - ۱۹۹۷ء

۱۵- ایران میں فارسی زبان و ادب کی تاریخ - ایران شناسی، لاہور - ۱۹۹۸ء

۱۶- دیوانِ غالب (فارسی) کے دیباچہ کا اردو ترجمہ - قومی زبان، کراچی - ۲۰۰۰ء

۱۷- پیش لفظ - کلیاتِ حضرت بلھے شاہ، لاہور - ۲۰۰۰ء

۱۸- اختر شیرانی (ایک باغ و بہار شخصیت) - سہ ماہی صحیفہ، لاہور - ۲۰۰۱ء

۱۹- حافظ محمود شیرانی کا وطن ''ریاست ٹونک'' - ارمغانِ شیرانی، شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور - ۲۰۰۲ء

۲۰ - یادگارِ اسلاف - سہ ماہی صحیفہ، لاہور - ۲۰۰۲ء

۲۱ - مولوی محمد شعیب مرحوم - بازیافت، شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور - ۲۰۰۲ء

۲۲ - تبصرۂ نصرت نامۂ ترخان - سہ ماہی فنون، لاہور - ۲۰۰۲ء

۲۳ - پیش لفظ (دیباچہ) - خصائص النبیؐ، لاہور - ۲۰۰۳ء

۲۴ - چہ دلاور است دزدے - تخلیق، لاہور - ۲۰۰۴ء

۲۵ - ڈاکٹر ضیا الدین دیسائی - مخزن، نمبر ۱۲، قائداعظم لائبریری، لاہور - ۲۰۰۶ء

۲۶ - مدرسۂ عبدالرب، دہلی - صحیفہ، لاہور - ۲۰۰۷ء

۲۷ - بادۂ خُمِ شیراز - مقدمہ شرحِ دیوانِ حافظ، لاہور - ۲۰۰۸ء

۲۸ - سانجھ بھئی چودیس - مخزن، نمبر ۱۵، لاہور - ۲۰۰۸ء

۲۹ - کون گلی گیو خان - مخزن، نمبر ۱۶، لاہور - ۲۰۰۸ء

۳۰ - سید عبدالرشید ٹھٹھوی - پیغام آشنا، نمبر ۳۲، اسلام آباد - ۲۰۰۸ء

۳۱ - بیادِ حمید احمد خان - پیغام آشنا، نمبر ۳۴، اسلام آباد - ۲۰۰۸ء

۳۲ - تزکِ بابری کی تازہ اشاعت - پیغام آشنا، نمبر ۳۵، اسلام آباد - ۲۰۰۸ء

۳۳ - گزشتہ لکھنؤ (مرتبہ محمد اکرام چغتائی) - مجلۂ تحقیق، اورینٹل کالج یونیورسٹی، لاہور - ۲۰۰۹ء

۳۴ - قصہ نواب کالے خان - مخزن، نمبر ۱۸، لاہور - ۲۰۰۹ء

۳۵ - علامہ سید وزیر الحسن عابدی - پیغام آشنا، نمبر ۳۹، اسلام آباد - ۲۰۰۹ء

۳۶ - کائناتِ غزل پر ایک نظر - پیغام آشنا، نمبر ۴۰، اسلام آباد - ۲۰۱۰ء

۳۷ - کیا عمارت قضا نے ڈھائی ہے - راوی، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور - ۲۰۱۰ء

۳۸ - محیط و محاط - قلم میرا دشمن، لاہور - ۲۰۱۰ء

۳۹ - ارمغان علم - مقدمہ، گوہر یکتا، راولپنڈی - ۲۰۱۱ء

۴۰ - کلیات مولانا عزیز الدین عظامی - کاوش، شعبہ فارسی، جی سی یونیورسٹی، لاہور - ۲۰۱۱ء

گفتنی

مختلف شخصیات پر میری تحریروں کا آغاز محض اتفاقیہ طور پر ہوا تھا۔ احمد عقیل روبی شیخوپورہ کالج میں تھے۔ کالج کا رسالہ ''مرغزار'' ان کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ انہوں نے فرمائش کی کہ میں اپنے والد مرحوم پر ایک مضمون لکھ دوں۔ ان کے اصرار پر میں نے ایک مختصر مضمون ''بھاء جی'' کے عنوان سے سپرد قلم کیا (یہاں یہ صراحت کر دوں کہ زیر نظر مجموعے کا پہلا مضمون ''شعلۂ مستعجل'' اس سابقہ تحریر سے مختلف اور زیادہ مفصّل ہے)۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا اور کالج کے ملازمت سے سبکدوش ہونے والے ساتھی تختۂ مشق بنتے رہے۔ یہ مضامین مزاحیہ رنگ میں تھے اور ''مرغزار'' میں چھپا کرتے تھے۔ پھر دھیان ایسے لوگوں کی طرف گیا جن سے زندگی میں میرا واسطہ رہا اور میں ان سے متاثر ہوا۔ ان میں میرے اساتذہ بھی ہیں اور محسن بھی، مشفق و مہربان بھی ہیں اور دوست بھی۔ ان کی یادیں میری زندگی کا قیمتی اثاثہ ہیں۔

یہ مضامین مختلف ادبی جرائد مثلاً ''فنون''، ''مخزن''، ''الحمرا''، ''پیغام آشنا'' وغیرہ میں چھپتے رہے ہیں۔ بعض غیر مطبوعہ بھی ہیں۔ گمنام لوگوں پر تحریروں کا مجموعہ ''بے نشانوں کا نشاں'' کے نام سے کئی برس پہلے چھپا تھا۔ زیر نظر مجموعے میں معروف شخصیات پر مضامین شامل ہیں۔

خاکوں اور شخصی مضامین کے بارے میں ایک اعتراض عام طور پر سننے میں آتا ہے کہ ان میں موضوع بننے والی شخصیت سے زیادہ اس پر لکھنے والا چھایا دکھائی دیتا ہے۔ یہ اعتراض درست نہیں۔ خاکوں کا معاملہ حصول اسناد کی خاطر لکھے گئے مقالات سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ وہاں جو

معروضیت پیش نظر ہوتی ہے یہاں اس کا التزام نہ تو ممکن ہے اور نہ مناسب۔ یہاں تو کسی شخص کی سیرت و کردار کو لکھنے والے کے انفرادی نقطۂ نظر سے دیکھا اور باہمی تعلقات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔ ایسی صورت حال میں یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی شخصیت پر قلم اٹھانے والا اپنے آپ کو اپنے موضوع سے الگ تھلگ رکھے اور محض ایک مبصر یا ناقد بنا رہے۔ ہاں شمولیت کے درجے میں کمی بیشی ہو سکتی ہے جس کا تعین موضوع بننے والے شخص اور اس پر لکھنے والے کے تعلقات کی نوعیت پر منحصر ہے۔ میرے نزدیک خاکے اور شخصی مضمون میں بنیادی فرق یہی ہے کہ اگر آپ اپنے موضوع سے زیادہ نزدیک رہیں گے تو آپ کی تحریر خاکے کی تعریف پر پورا اترے گی بصورت دیگر یہ محض تعارفی مضمون کہلائے گی۔ اس مجموعے میں آپ کو دونوں طرح کی مثالیں نظر آئیں گی۔

جن لوگوں کے ساتھ قرب دلی کے ساتھ بعد مکانی تھا ان کے بارے میں لکھتے ہوئے ان کے ایسے خطوط سے مدد لی گئی ہے جو میرے نام لکھے گئے جبکہ دو ایک مضامین میں ایسے خطوط سے بھی استفادہ کیا گیا ہے جو دوسروں کے نام لکھے گئے تھے۔ ان تحریروں کے عنوانات زیادہ تر متعلقہ شخصیت کے کردار کی مناسبت سے رکھے گئے ہیں۔ چند عنوانات کا تعلق اس شخصیت کی جدائی پر میرے جذبات کی نسبت سے دیا گیا ہے۔ مضامین کی ترتیب میں تاریخ وفات کا تقدم و تاخر ملحوظ خاطر رہا ہے۔

مظہر محمود شیرانی

شعلۂ مستعجل

اختر شیرانی (۱۹۰۵ء-۱۹۴۸ء)

درمیانہ قد، وجیہہ چہرہ، کسرتی جسم پر کھلے پائنچوں کا پاجامہ، قمیض اور شیروانی، پاؤں میں گرگابی یا پمپ شو، یہ تھے ہمارے والد اختر شیرانی جنہیں ہم پنجابی محاورے کے مطابق ''بھاء جی'' کہا کرتے تھے۔ ۴ مئی ۱۹۰۵ء کو جب وہ محلہ مہندی باغ (ٹونک) میں پیدا ہوئے تو ان کے والد حافظ محمود شیرانی بیرسٹری کی تعلیم کے لیے لندن جا چکے تھے۔ دادا نے اپنے ایک متوفی بیٹے کے نام پر محمد داؤد خان نام رکھا۔ علاوہ ازیں نو مختلف تاریخی نام نکالے گئے جن سے ظاہری و معنوی اعتبار سے سنہ ۱۳۲۳ھ برآمد ہوتا ہے۔ ان میں سے صرف ایک نام مسعود خسرو ایسا ہے جو آگے چل کر اختر نے اپنے بعض مضامین میں استعمال کیا۔ اگلے ہی سال یعنی ۲۹ جولائی ۱۹۰۶ء کو اختر کے دادا کا انتقال ہو گیا۔ اس سانحے کی اطلاع ملنے پر حافظ محمود شیرانی لندن سے وطن آئے اور چند ماہ ٹھہر کر دسمبر ۱۹۰۶ء میں واپس چلے گئے۔ پھر انہیں ۱۹۱۳ء کے موسم بہار میں آنے کا موقع ملا۔

چھ سات برس کا یہ عرصہ اختر کی سیرت کی تشکیل میں فیصلہ کن کردار کا حامل تھا۔ ماہرین نفسیات کی آراء کے مطابق انسانی شخصیت کا تین چوتھائی حصہ اس کے بچپن ہی میں مکمل ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عمر کے اس اہم ترین مرحلے میں اختر کا اپنے باپ کی محبت سے محروم رہنا ان کے مزاج کے اکثر نمایاں مظاہر کا ذمہ دار ہے۔ معروف صحافی نصر اللہ خاں مرحوم، اختر پر اپنے مضمون میں لکھتے ہیں: ''اختر سرتاپا پیار تھے، خلوص تھے۔ ان کا بچپن جوانی میں بھی ان پر مسلط رہا۔ وہی بھولپن، وہی بچوں ایسی معصوم معصوم سی شوخیاں، وہی ضد۔ بڑھاپا تو خیر ایسے لوگوں پر آتا

ہی نہیں ہے[1]۔"

صاف معلوم ہوتا ہے کہ بچپن کا وہ احساس محرومی تاحین حیات اختر کی شخصیت پر سایہ فگن رہا۔ اسی وجہ سے ان میں خود اعتمادی پیدا نہ ہو سکی اور قوت ارادی کمزور رہ گئی۔ نتیجہ یہ کہ وہ اپنے والد کے حسب منشا رسمی تعلیمی مدارج طے نہ کر سکے۔ ان کی مے نوشی کی عادت کو بھی اسی پس منظر میں دیکھنا چاہیے اور والد کے عتاب کے باوجود ان کے پرستش کی حد تک احترام کو بھی۔

ٹونک مشرقی علوم و فنون کا اہم مرکز تھا۔ ہند اسلامی تہذیب نے پہلے دہلی اور پھر لکھنؤ کی بربادی کے بعد جن مقامات پر بسیرا کیا ان میں حیدر آباد (دکن)، رامپور، ٹونک اور بھوپال کے نام نمایاں ہیں۔ اسی علمی فضا نے ٹونک میں حکیم سید برکات احمد، مفتی عبداللہ ٹونکی، مولانا محمود حسن خاں اور خود حافظ محمود شیرانی جیسی شخصیات کو جنم دیا۔

حافظ صاحب بیٹے کو بحر العلوم بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ متعدد اساتذہ اختر کی تدریس اور تربیت کے لیے مقرر کیے گئے۔ ایک وقت تو ان کی تعداد سات تک پہنچ گئی تھی۔ اردو، فارسی، دینیات اور ریاضی کے علاوہ خوش خطی، ورزش اور پیراکی کے الگ الگ استاد تھے۔ ان مساعی کے نتیجے میں اختر کی علمی استعداد بہت اچھی، خط بڑا پاکیزہ اور جسم گٹھا ہوا تھا۔ اسی دور میں اختر اپنے ایک استاد مولوی محمد صابر شاکر کی تشویق سے شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں حافظ صاحب نے بیٹے کو اپنی مادر علمی اورینٹل کالج، لاہور میں داخل کرا دیا جہاں انہوں نے منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحان پاس کیے اور پھر رسمی تعلیم چھوڑ کر شعر و ادب اور صحافت کو پیشہ بنا لیا۔ حافظ صاحب کو بیٹے کے تعلیم مکمل نہ کرنے کا ملال عمر بھر رہا۔ اس تکدر کا اظہار اس وقت ہوا جب اختر کی پہلی قابل ذکر نظم "جوگن"، انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی مجلّے "اردو"[2] (اورنگ آباد) میں شائع ہوئی اور مولوی عبدالحق مرحوم نے حافظ صاحب کو مبارکباد کا خط لکھا۔ خط پڑھ کر بڑے جھلائے اور بظاہر اپنی اہلیہ مگر درحقیقت اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہا "ہونہہ! سسرا شاعری کرنے چلا ہے۔"

غضب اس وقت ہوا جب حافظ صاحب کو ان کی مے نوشی کی خبر ہوئی اور اتنی تاخیر سے جب یہ عادت راسخ ہو چکی تھی۔ آئے تو جائے کہاں۔ گھر میں بھونچال سا آ گیا۔ خود اختر صاحب تو موجود نہ تھے اس لیے ان کی والدہ پر خوب ہی برسے۔ ان کا کہنا تھا کہ ماں کو بیٹے کی اس حرکت کا

یقیناً پہلے سے علم تھا اور انہیں جان بوجھ کر اندھیرے میں رکھا گیا۔ بہر حال سزا کے طور پر اختر صاحب کا گھر میں داخلہ ممنوع قرار پایا۔

ان دنوں حافظ صاحب ۱۸ فلیمنگ روڈ پر رہتے تھے۔ نیچے دکانیں تھیں اور اوپر جانے کا زینہ احاطے کے اندر ایک بغلی گلی کے آخر میں تھا۔ حافظ صاحب کی خواب گاہ تیسری منزل پر تھی اور اختر صاحب کا کمرہ دوسری منزل میں۔ اختر صاحب کو اس تازہ صورتحال کا علم نہ تھا۔ وہ حسب معمول آدھی رات کو گھر پہنچے۔ دستک کی آواز سن کر ان کی والدہ زینے سے اتریں اور دروازہ کھولے بغیر بیٹے کو باپ کا حکم پہنچایا۔ اس ڈھلتی رات میں شب بسری کے لیے کہیں جانا بے تکی بات تھی اس لیے اختر دروازے کے آگے بنی ہوئی چوکی پر بیٹھ گئے۔ ماں اپنی اکلوتی اولاد کی محبت کے باعث بند دروازے کے اندر کی طرف بیٹھ کر انہیں مے خواری سے اجتناب کی تلقین کرتی رہیں۔ وہ چاہتیں تو اختر کو ان کے کمرے میں جانے دیتیں اس طرح کہ حافظ صاحب کو کانوں کان خبر نہ ہوتی لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ بہرحال والدہ کی نصیحتوں کا یہ سلسلہ خاصی دیر جاری رہ کر اذان فجر کے قریب حافظ صاحب کی بیداری سے پہلے ختم ہوا۔ اختر صاحب کو والد کی سخت گیری کا اندازہ تھا اس لیے اسی دن اپنے رہنے کا کسی اور جگہ انتظام کر لیا۔

یہ واقعہ محترم پروفیسر سید محمد یونس حسنی صاحب نے اختر اپنے مقالے میں حکیم نیّر واسطی مرحوم کے حوالے سے درج کیا ہے[۲]۔ حقیقت یہ ہے کہ حکیم صاحب موصوف اختر سے اپنی محبت نیز اپنے شاعرانہ مزاج کے باعث اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے ضروری احتیاط ملحوظ نہ رکھ سکے۔ چنانچہ انہوں نے اس یک شبی واقعہ کو فعل ماضی مطلق کے بجائے ماضی استمراری میں بیان کیا نیز لفظ ''عموماً'' کے اضافے سے اسے دوام عطا کر دیا۔ پھر آگے چل کر

؎ خلقت شہر تو کہنے کو فسانے مانگے

کے مصداق، بعض خلاصہ نویسوں نے اس واقعہ میں مضمر شوہر کی اطاعت اور بیٹے کی محبت کے مثالی پہلو نظر انداز کر کے اس میں پائی جانے والی ڈرامائی کیفیت کو اپنے مضمون چمکانے کے لیے استعمال کیا۔ اسی طرح اختر کے سلسلے میں حکیم نیّر واسطی مرحوم کے بعض اور بیانات بھی ناقدوں کی نکتہ چینی کا نشانہ بنے۔

اختر صاحب اپنے رسالے کے دفتر میں رہتے تھے۔ ٹوہ لگائے رکھتے کہ بابا کب پرانی کتابوں اور سکوں کی جستجو یا کسی علمی کانفرنس میں شرکت کے لیے لاہور سے باہر جاتے ہیں۔ بس وہ لاہور سے نکلے اور انہیں گھر آنے کی چھٹی ملی۔ ہم بھائی بہنوں کے لیے مٹھائی اور کھلونے لاتے۔ بابا واپس آتے تو ہم کھلونے چھپا دیتے اور ان کے کالج جانے پر ہی نکالتے۔ ہمیں سمجھا دیا گیا تھا کہ اگر بابا ان کے بارے میں پوچھیں تو بھاء جی کا نام نہ لینا۔ ایک دن بابا کالج سے آکر دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے اور میں بے دھیانی میں ایک چابی والی موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔ بابا نے کنکھیوں سے دیکھ کر پوچھا! ''یہ کون لایا تھا؟'' اور میں نے بڑی معصومیت سے کوئی بچگانہ توجیہہ پیش کر دی۔ انہوں نے بڑے استعجاب سے کہا ''اچھا!'' اب میں سوچتا ہوں کہ اس ''اچھا'' میں کتنا تجاہل عارفانہ تھا۔

۱۹۴۰ء میں جب بابا ملازمت سے سبکدوش ہو کر ٹونک جانے لگے تو اختر صاحب بڑے گھبرائے۔ بابا کے قریبی دوستوں سے سفارش کروائی۔ بابا بہ مشکل اس پر آمادہ ہوئے کہ ''چلا چلے، لیکن میری نظروں کے سامنے نہ آئے۔'' باپ بیٹے نے یہ معاہدہ مرتے دم تک نبھایا۔ نہ باپ نے کبھی طلب کیا نہ بیٹے نے جرأت کی۔ آبائی حویلی کی اوپر کی منزل میں باپ اور نیچے بیٹا۔ بعض اوقات حافظ صاحب کوئی علمی مسئلہ چھان بین کے لیے کاغذ کے پرزے پر لکھ کر نیچے بھجوا دیتے۔ اختر صاحب اپنا سب کام چھوڑ چھاڑ اس پر توجہ دیتے اور مطلوبہ معلومات مہیا کر کے اوپر بھجواتے۔ ایسے موقعوں پر سفارتی فرائض میں انجام دیتا تھا۔

اختر صاحب بڑے وسیع المطالعہ شخص تھے۔ تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتیں بھی ان میں بہت تھیں اور ترجمے کے فن میں تو ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کے زیر ادارت شائع ہونے والے رسالوں میں ان کے علمی مضامین اور عوفی کی ''جوامع الحکایات'' کے انتخاب کا اردو ترجمہ جو انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی نے دو جلدوں میں چھاپا تھا، اس حقیقت کے گواہ ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی شاعرانہ شہرت نے باقی تمام پہلوؤں کو گہنا کر رکھ دیا ہے۔

جب حافظ صاحب کے ضیق النفس کے مرض میں شدت پیدا ہوئی تو سنہ ۱۹۴۳ء سے انہوں نے شہر سے دور دریائے بناس کے کنارے اپنی زرعی زمین پر ڈیرہ جما لیا اور اس طرح اختر صاحب کو زیادہ آزادی میسر آگئی۔ ٹونک میں میں نے ان کو بہت قریب سے دیکھا۔ وہ ہم بھائی بہنوں

سے بے انتہا پیار کرتے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے کبھی مجھے مارا یا جھڑکا ہو۔ کھانے پہننے کا شوق انہیں نہ تھا۔ ان کی ضروریات شراب کے علاوہ سگریٹ اور پان تک محدود تھیں۔ پان میں تمبا کو کبھی نہیں کھایا البتہ چونا اس کثرت سے کھاتے تھے کہ دیکھنے والوں کو تعجب ہوتا تھا۔ ان کی بادہ آشامی کا ڈھنگ بھی نرالا تھا۔ دو تین دن تک وہ جی بھر کے پیتے تھے اور اس میں صافی و دردی کی قید نہ تھی۔ تیسرے چوتھے روز اس کا ردعمل شروع ہوتا۔ معدہ مزید شراب قبول کرنے سے انکار کر دیتا۔ قے آنے لگتی۔ دو تین روز تک خمار اور اعضا شکنی میں مبتلا رہ کر طبیعت بحال ہو جاتی۔ اب ہفتے عشرے کے لیے شراب حرام ٹھہرتی۔ پائیں باغ کے سامنے ان کا کمرہ تھا۔ پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھتے، آگے میز رکھے لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے۔ کوئی کتاب پڑھتے ہوئے گود میں تکیہ رکھ کر اس پر کہنیاں ٹکا لیتے تھے۔ ان دنوں میں جنہیں ''ایام مسترقہ'' کہنا چاہیے وہ گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ مجھے خاص ہدایت تھی کہ ملاقات کے لیے آنے والوں سے کہہ دوں کہ گھر پر نہیں ہیں۔ البتہ چند لوگوں کو استثنا حاصل تھا۔ نوشت و خواند سے اکتاتے تو باغ میں پودوں کو پانی دینے لگتے۔ یہ وہی باغ تھا جس کے بارے میں انہوں نے لاہور سے ٹونک آنے پر نظم ''پھر کھڑا ہوں بادل سرشار پائیں باغ میں'' لکھی تھی۔

ان ایام میں خندہ روئی اور خوش مزاجی ان پر غالب رہتی۔ ہم بچوں سے ہنسی مذاق کرتے اور پھلجھڑیاں سی چھوڑتے رہتے۔ ایک دن سہ پہر کی چائے میں ذرا تاخیر ہوئی۔ انہوں نے یاد دلایا۔ ہماری والدہ نے کہا: ''پانی رکھا ہوا ہے، جوش نہیں آیا۔'' بولے ''جوش کی کیا ضرورت ہے جب اختر موجود ہے۔'' فسادات کے زمانے میں لاہور کے اخبارات میں کسی غلط فہمی کی بنا پر ان کے قتل کی خبر چھپ گئی۔ لاہور کے بعض دوستوں نے اس حوالے سے خیریت دریافت کی۔ والدہ سے کہنے لگے: ''بھئی آج اچھے اچھے کھانے پکاؤ اور ہمارا فاتحہ دلواؤ۔'' خاص خاص مقامی دوستوں کو بڑے شگفتہ رقعے لکھ کر بھیجتے۔ ''جوامع الحکایات'' کے ترجمے کے ضمن میں حکیم ظہیر میاں[۵] کو ایک رقعہ میں لکھتے ہیں: ''پیارے ظہیر! میری کتاب میں چند قرآنی آیات اور عربی کے اشعار استعمال ہوئے ہیں...... آج یا تو خود آؤ یا مولوی ذفیر[۶] سے کہو کہ اپنی ڈاڑھی کے مشک اذفر سے مشام کتاب کو معطر کریں۔ عربی اشعار ان کے بس کی بات نہیں لیکن آیات کو وہ ضرور درست کر سکیں گے......'' ایک بار درد سعیدی صاحب کو رات کے کھانے پر بلانے کے لیے یہ رقعہ لکھا:

''ہوا ہے مخالف، خفا ہے زمانہ
مگر درد کھانا یہیں آج کھانا''

یہ رقعہ ڈیوڑھی کا پرانا ملازم دھولیا یا عتیق گاڑی بان لے کر جاتے۔ کبھی کبھی مجھے بھی ساتھ بھیجا جاتا بالخصوص حکیم ظہیر میاں کے پاس، جب ان سے کوئی دوا منگوانا ہوتی۔ جوارش کمونی اکثر منگواتے تھے۔

حویلی کے استعمال نہ ہونے والے حصوں اور کھلے صحن میں ہم بہن بھائی ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہوئے مرغیوں کے چوزے نکلواتے۔ جب یہ چوزے بڑے ہو جاتے تو ان کا مالک بھاء جی سے سودا طے کرتا۔ ظاہر ہے کہ یہ سودا اُدھار کی بنیاد پر چکتا تھا اور کھانے میں سب ہی شریک ہوتے تھے۔ اب منی آرڈر کا انتظار شروع ہوتا اور تاخیر کے ساتھ ساتھ موعودہ رقم میں سود در سود کا اضافہ بھی جو یک طرفہ ہوا کرتا تھا۔ پیسوں میں اس اضافے کی اطلاع انہیں وقتاً فوقتاً کر دی جاتی تھی۔

''ابے سود کھاتا ہے!''

''جی! آپ سے سود نہ لیں گے تو اور کس سے لیں گے؟''

''اچھا یہ بات ہے! آئندہ تمہاری مرغیاں خریدنا بند۔''

''جی پہلے پچھلا حساب چکا دیں، پھر کوئی فیصلہ کریں۔''

اس نوک جھونک کے بعد روایتی سود خوروں کی طرح ہم انہیں مزید مرغیاں خریدنے پر آمادہ کر لیتے۔ اکثر اوقات وہ ڈاک خانے جا کر منی آرڈر وصول کر لیا کرتے تھے۔ ہاں اگر کوئی غیر متوقع منی آرڈر ڈاکیہ گھر لے آتا تو ہمارے پو بارہ۔ اپنا مطالبہ وصول کر کے ہی چھوڑتے۔

یہ پرسکون وقفے اچانک ختم ہوا کرتے تھے۔ ایک شام وہ چپکے سے گھر سے نکل جاتے۔ واپس آتے تو نشہ میں دھت، ڈیوڑھی کے باہر گھر میں محفل جمتی۔ شعر و ادب کا ذوق رکھنے والوں کے علاوہ رنگ رنگ کے لوگ جمع ہو جاتے، ان میں رند و زاہد اور عالم و عامی کی قید نہ تھی۔ مولانا قاضی عمران خاں ؒ مرحوم نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے والد مولانا مفتی عرفان خاں مرحوم و مغفور، ناظم محکمہ شرع شریف بھی کبھی کبھی اختر صاحب کی ان محفلوں میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ اللہ اللہ!

قربان جائیے اس ادب دوستی، قدردانی اور وسیع المشربی کے۔ غرض مونڈھوں، کرسیوں، چارپائیوں پر بھانت بھانت کا آدمی بیٹھا ہے اور اختر صاحب بلبل ہزار داستان بنے ہوئے ہیں۔ شعروادب کے موضوعات پر گفتگو ہو رہی ہے۔ اساتذہ کے اشعار زیر بحث ہیں۔ زباندانی کے نکات اور تاریخی واقعات پر رائے زنی کی جا رہی ہے اور دنیا بھر کے موضوعات۔ قاری جمیل صاحب بڑے خوش الحان تھے۔ اگر وہ موجود ہوتے تو ان سے سورہ یٰسین سنانے کی فرمائش کر دیتے۔ اب قاری صاحب تلاوت کر رہے ہیں اور اختر صاحب کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔ یہ اس محفل کا آخری آئٹم ہوتا تھا کیونکہ اس کے بعد کسی قیل وقال کی گنجائش ہی نہ رہتی تھی۔

ان محفلوں میں اختر صاحب اپنا کلام تو کجا ایک شعر تک سنانے کے روادار نہ تھے۔ نہ ہی کوئی شخص وہاں پینے پلانے کا تصور کرسکتا تھا۔ ان کا اپنا یہ حال تھا کہ کلال کے ہاں سے پی آئے اور ایک اڈھا شیروانی کی جیب میں چھپا لائے۔ اسے ڈیوڑھی کے بھاری بھرکم دروازے کے ایک پٹ کی آڑ میں رکھ دیتے۔ وقفے وقفے سے اٹھ کر دروازے کی اوٹ میں جاتے اور گھونٹ لے لیتے۔ اٹھنے سے پہلے مجمع پر نظر ڈال کر ''میں ابھی حاضر ہوا'' کہا، اگر میں نظر پڑ گیا تو کسی بہانے مجھے گھر کے اندر بھیج دیتے۔ میں سمجھ جاتا اور وہاں سے کھسک لیتا۔ انہیں اس بات کا بڑا خیال رہتا تھا کہ میرے بچوں کو کہیں مجھ سے نفرت نہ ہو جائے۔ اصل میں ان کی یہ محفلیں بادہ نوشی اور شعر فروشی کی مجلسیں نہ تھیں۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ان کی شخصیت میں ایک مقناطیسی کشش تھی اور یہ کشش عبارت تھی علم وفن، آداب واخلاق، شرم وحیا، خلوص ووفا، مودّت ومروت اور سب سے بڑھ کر دوسروں سے ہمدردی کرنے اور ان کے چھوٹے چھوٹے غم بانٹ لینے سے۔ رات دس گیارہ بجے محفل برخاست ہوتی۔ وہ اٹھ کر اندر آتے اور چند لقمے کھا کر سو رہتے۔

ان کی آمدنی محدود تھی اور اخراجات بھی۔ کھانا گھر سے مل جاتا تھا۔ اپنے لیے کپڑا انہوں نے شاید ہی کبھی خریدا ہو۔ ان کا لباس تیار کروانا ان کی والدہ کی ذمہ داری تھی۔ جیب خالی ہونے کی صورت میں (اور یہ اکثر ہوتا تھا) سگریٹوں تک کی فرمائش انہی سے کی جاتی تھی۔ ہاں نقد پیسے وہ اس ڈر سے کبھی نہ دیتی تھیں کہ شراب پر صرف ہوں گے۔ ماں آخر ماں ہوتی ہے۔ ایک بار بیٹے کے لیے کرتا سلوایا اور پہناتے وقت بڑے چاؤ سے اپنی طلائی گھنڈیاں، جن میں تہری زنجیریں

پڑی ہوئی تھیں، لگا دیں۔ وہ باہر نکلے۔ کسی ضرورت مند نے سوال کیا۔ انہوں نے زنجیریں نوچ کر اس کو بخش دیں۔ نتیجہ یہ کہ گھنڈیاں بحق سرکار ضبط ہو گئیں اور سیپ کے بٹن ٹانک دیے گئے۔

اصل میں وہ کسی کو دکھ یا تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جب کبھی کسی رسالے یا ریڈیو سٹیشن سے روپیہ آتا تو اس کا ایک حصہ شراب اور سگریٹ پر صرف ہوتا اور باقی سائلوں کے کام آتا۔ مے خانے سے گھر تک راستے ہی میں پیسے ختم ہو جاتے۔ واپسی پر اگر اتفاق سے شیروانی اتار کر کھونٹی پر ٹانگی اور خود باہر جا بیٹھے تو ہم بڑے تجسس اور اشتیاق سے تلاشی لیتے۔ منی آرڈر فارم کا پرزہ تو اکثر نکلتا باقی مال گاؤ خورد، ہاں دو چار آنے ریزگاری کی قسم نہیں۔

خرابی اس وقت ہوتی جب ان کی جیب خالی ہوتی اور کوئی سوال کر بیٹھتا۔ ایک بار حسب معمول دادی جان نے ان کے لیے بوسکی کی دو قمیصیں سلوائیں۔ پہلے ہی دن قمیض پہن کر باہر گئے۔ کسی شخص نے اپنے بوسیدہ کپڑے دکھا کر کچھ پیسے طلب کیے۔ جیب میں کچھ تھا نہیں۔ چنانچہ نئی قمیض اتار کر اسے دے دی اور بنیان پر شیروانی پہن کر گھر آ گئے۔ دادی جان نے آڑے ہاتھوں لیا کہ قمیض میں نے بنوائی تھی۔ تم دے ڈالنے والے کون تھے؟ بیٹے نے معصومیت سے کہا: ''امی! اس آدمی کی قمیض تار تار تھی۔ جب اس نے سوال کیا تو میں انکار نہ کر سکا۔'' اور دادی جان کا آخری فقرہ مجھے خوب یاد ہے: ''بیٹا! کسی دن پاجامہ اتار کر نہ دے آنا۔''

پاجامے کی نوبت تو خیر نہ آئی مگر ایک موقع پر تھوڑی سی کسر رہ گئی جب وہ سلیپر پاؤں میں ڈالے باہر نکلے۔ کسی سائل نے، جو ننگے پاؤں تھا، امداد کی التجا کی۔ یہ اس کو ساتھ لگا لائے۔ ڈیوڑھی میں پہنچ کر سلیپر اس کے حوالے کیے اور آپ گھر میں داخل ہو گئے۔

ایک بار مجھے ایک ہوائی بندوق لے کر دی۔ بندوق پا کر میں اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھنے لگا۔ پڑھائی سے فارغ ہو کر باغ میں فاختاؤں کو نشانہ بناتا لیکن یہ حرکت فلک پیر کو ایک آنکھ نہ بھائی۔ چند ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ کسی اللہ کے بندے نے مانگ لی۔ جب بندوق لینے اندر آئے تو میں بہت مچلا مگر یہی کہتے رہے کہ ہم تمہیں اور لے دیں گے۔

ڈاکٹر یونس حسنی صاحب نے اپنے مقالے میں یہ واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ''ٹونک میں کسی نے نشے کی حالت میں ان سے ایئر گن چھین لی۔ پھر یہ تمام عمر اسے ڈھونڈتے رہے[۵]۔''

اس ضمن میں گزارش ہے کہ چھیننے کی بات درست نہیں ہے اور تاعمر ڈھونڈنا تو درکنار، کسی

دی ہوئی چیز کو واپس طلب کرنا بلکہ اس کا تصور بھی اختر صاحب کے مزاج سے بعید تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایئر گن کا قصہ انہوں نے اگلے ہی لمحے فراموش کر دیا تھا البتہ میں کچھ عرصے تک یہ توقع لگائے رہا کہ وہ مجھے حسب وعدہ دوسری بندوق لے دیں گے۔

یہ دردمندی، وسیع القلبی اور کشادہ دستی اختر صاحب کی فطرت ثانیہ تھی۔ نہ صرف یہ کہ وہ کسی سائل کا سوال رد نہیں کر سکتے تھے بلکہ ازخود بھی ضرورت مندوں کی امداد پر آمادہ رہتے تھے۔ مجی احمد ندیم قاسمی صاحب، ریاض شاہد[9] مرحوم کے حوالے سے لاہور کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جو یوں ہے کہ اختر صاحب ریڈیو سٹیشن سے تانگے میں بیٹھ کر موہنی روڈ اپنے کسی دوست کے پاس جا رہے تھے۔ راستے میں کسی وجہ سے تانگے والے کا چالان ہو گیا۔ آگے بڑھے تو اختر صاحب کو ایک جگہ ریاض شاہد نظر پڑے۔ انہیں بھی ساتھ بٹھا لیا اور موہنی روڈ پہنچ گئے۔ دروازے پر دستک دے کر اختر صاحب نے جیب سے سو روپے کا ایک نوٹ نکالا جو شاید انہیں ریڈیو سٹیشن سے ملا تھا۔ انہوں نے یہ نوٹ تانگے والے کی طرف بڑھایا اور بولے: ''تانگے والے! مجھے بڑا افسوس ہے کہ تمہارا چالان ہو گیا۔ یہ پیسے تم رکھ لو۔'' ان دنوں میں سو روپے بڑی رقم تھی اور تانگے کا کرایہ چار آنے۔ لہٰذا تانگے والا گھبرا گیا۔ اس اثنا میں وہ دوست گھر سے نکلا۔ اس نے یہ صورت دیکھی تو جیب سے دس روپے نکال کر تانگے والے کو دینا چاہے لیکن اختر صاحب نہ مانے اور تانگے والے کو ان سے سو روپے لیتے ہی بنی۔

اختر کی شرم و حیا کا عالم یہ تھا کہ کسی واقف کار کی مالی امداد کرتے ہوئے اس سے آنکھ نہیں ملا سکتے تھے۔ ''نقوش'' والے محمد طفیل صاحب نے اپنے مضمون[10] میں نازش مرحوم[11] کا بیان کردہ ایک واقعہ درج کیا ہے۔ ہوا یہ کہ اختر کے کسی دوست کی نوکری چھوٹ گئی اور بے روزگاری کے ہاتھوں فاقوں تک نوبت پہنچ گئی۔ انہیں معلوم ہوا تو بے تاب ہو گئے۔ کسی نہ کسی طرح تین سو روپے فراہم کیے اور نازش کو ساتھ لے کر دوست کی قیام گاہ پر پہنچے۔ خود نیچے ٹھہر گئے اور نازش سے کہا کہ یہ روپے اوپر جا کر دے آؤ۔ نازش نے کہا کہ آپ اپنے ہاتھ سے کیوں نہیں دیتے؟ کہنے لگے: ''مجھے ایسا کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔''

سنہ ۴۶-۱۹۴۵ء میں جدن بائی نے بمبئی میں ایک فلم ''رومیو جولیٹ'' بنائی تھی جس میں ان کی بیٹی اور اس دور کی معروف اداکارہ نرگس نے جولیٹ کا کردار ادا کیا تھا۔ جدن بائی کو اس فلم کے گانوں میں شامل کرنے کے لیے اختر صاحب کی ایک نظم ''تمہیں ستاروں نے بے اختیار دیکھا

ہے'' پسند آ گئی۔ انہوں نے باقاعدہ لکھ کر اجازت طلب کی اور یہ بھی دریافت کیا کہ وہ اس کا کیا معاوضہ قبول کریں گے؟ اختر صاحب نے بلا معاوضہ اجازت دے دی۔ جدن بائی بڑی وضع دار خاتون تھیں۔ انہوں نے نظم کی فلم میں شمولیت کے ساتھ ہی ایک تولہ وزنی طلائی انگوٹھی اختر صاحب کے لیے اور ڈیڑھ تولہ وزن کے طلائی کانٹے ان کی بیگم کے لیے خاص طور پر بنوا کر بھجوائے۔ انگوٹھی پر اختر کے پہلے حرف (A) کا بڑا خوبصورت مونوگرام کندہ تھا۔ اس دن شام کے وقت انگلی میں ڈال کر نکلے۔ واپس آئے تو انگلی خالی تھی۔

اختر صاحب کے پرستار مختلف شہروں سے تحائف بھجوایا کرتے تھے۔ جب تک یہ چیزیں عزیزوں اور دوستوں میں تقسیم نہ ہو جاتیں انہیں چین نہ آتا تھا۔ ایک بار مراد آباد سے بڑے نفیس نقشین عطر دانوں اور گلدانوں کا ہدیہ آیا۔ ان میں سے صرف ایک عطر دان گھر والوں نے رکھ لیا۔ کچھ دن بعد کوئی عزیزہ ملنے آئیں۔ اختر صاحب نے اپنا مخصوص جملہ ''ہم تمہیں اور منگوا دیں گے'' کہتے ہوئے وہ عطر دان اس عزیزہ کو دے ڈالا۔

اگر کوئی شخص ان کے ساتھ کچھ حسن سلوک کرتا تو اسے کبھی فراموش نہیں کرتے تھے اور کوشش کرتے کہ اس سے بڑھ کر حسن سلوک کا مظاہرہ کریں۔ میں دربار ہائی سکول، ٹونک میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ ایک دن ماسٹر محفوظ صاحب ہمیں ریاضی پڑھا رہے تھے کہ کسی شخص نے ان کو باہر بلایا۔ وہ گئے اور ذرا دیر بعد سگاروں کا ایک خوبصورت ڈبہ ہاتھ میں لیے واپس آئے۔ تدریس کا سلسلہ دوبارہ شروع کرنے سے پہلے بے اختیار سے ہو کر کہنے لگے: ''یہ اختر شیرانی صاحب بھی کیسے بااخلاق آدمی ہیں۔ چند روز قبل ایک محفل میں انہوں نے سگریٹ نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن جیب خالی تھی۔ اتفاق سے میں نے دیکھ لیا اور ان کی خدمت میں سگریٹ پیش کر دیا۔ اب یہ دیکھو اتنے قیمتی سگاروں کا ڈبہ انہوں نے مجھے تحفے میں بھجوایا ہے۔''

کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ اختر صاحب اپنی محدود اور بے قاعدہ آمدنی کے باوجود ایسی کشادہ دلی اور فراخ دستی کا مظاہرہ کیسے کر لیتے تھے؟ تاہم جیسا کہ اوپر بیان کردہ واقعات سے اندازہ ہوتا ہے معاملہ بیش و کم کا نہیں بلکہ انداز چشم کرم کا تھا۔ ان کی اس بذل و عطا کی عادت سے حافظ صاحب بھی باخبر تھے۔ اس لیے جب ۱۹۴۵ء کے آخر میں ان کی صحت تیزی سے گرنے لگی تو انہوں نے اپنے طلائی اور نقرئی سکوں کا گراں قدر مجموعہ اونے پونے فروخت کر دیا اور

اس سے حاصل ہونے والی بائیس ہزار روپے کی رقم رتلام والے[۱۲] سیٹھوں کے ہاں ہمارے نام جمع کرادی۔

اختر صاحب نے مدت العمر کوئی ملازمت نہیں کی اس لیے باقاعدہ آمدنی کی صورت کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی۔ لاہور سے جو ادبی رسالے وہ نکالتے تھے وہ بھی اپنا خرچ ہی پورا کر پاتے تھے۔ اس دور سے متعلق اختر صاحب کی شفقت اور ہمدردی کا ایک واقعہ محترم احمد ندیم قاسمی صاحب نے سنہ ۱۹۶۰ء کے اوائل میں مجھے سنایا تھا[۱۳]۔ پورے چھتیس برس تک میں نے اس روایت کو اپنے تک محدود رکھا لیکن ۱۴ جنوری ۱۹۹۶ء کو جب قاسمی صاحب گورنمنٹ کالج شیخوپورہ میں ''بزم شیرانی'' کے افتتاح کے لیے تشریف لائے تو اپنے صدارتی خطاب میں انہوں نے یہ واقعہ جلسۂ عام میں بیان کیا۔ یہ صدارتی خطبہ کالج کے رسالے ''مرغزار'' (شمارہ اپریل ۹۶ء) میں شائع ہو چکا ہے۔ اس واقعے میں جہاں اختر صاحب کے اوصاف حمیدہ کی جھلک نظر آتی ہے وہاں اس کے اعلان سے خود قاسمی صاحب کی عظمت کردار کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ اس لیے میں یہاں اسے بیان کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

یہ سنہ ۳۶-۱۹۳۵ء کا ذکر ہے۔ قاسمی صاحب تعلیم سے فارغ ہو کر بے روزگاری کے دن گزار رہے تھے اور ریلوے روڈ پر اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ایک کرائے کے کمرے میں رہتے تھے۔ اختر صاحب کو جب ان کی بے کاری کا علم ہوا تو بقول قاسمی صاحب: ''وہ ایک ایسے وقت میں جب ہم دونوں بھائی موجود نہ تھے اور کمرہ مقفل تھا تشریف لائے اور اپنے محیر العقول حد تک خوبصورت خط میں ایک چٹ دروازے کے اندر ڈال گئے۔ اس میں لکھا تھا کہ جب تک تمہیں کوئی معقول ذریعۂ معاش نہیں ملتا تم میرے مہمان ہو اور تم میرے حساب میں ریلوے روڈ کے عرب ہوٹل میں صبح شام کا کھانا کھاؤ گے اور ساتھ ہی ناشتہ بھی وہیں کرو گے۔ میں نے ہوٹل کے مالک سے کہہ دیا ہے، بغیر کسی تکلف کے وہاں جانا شروع کر دو۔''

قاسمی صاحب اختر صاحب کے احترام کے باعث اس مخلصانہ پیشکش کو رد نہ کر سکے اور یہ سلسلہ چند ماہ جاری رہا۔ قاسمی صاحب فرماتے ہیں کہ کوئی دو ماہ گزرنے کے بعد میں نے یہ بات نوٹ کی کہ جب میں کھانا کھانے جاتا ہوں تو کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا ہوٹل کا مالک مجھے ایک خاص انداز سے دیکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی نظروں سے میں مضطرب ہو جاتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کیونکہ اختر

صاحب ہوٹل کا بل ادا کرنے میں تساہل سے کام لیتے ہیں اس لیے اس کے مالک پر میرا کھانا بار گزرتا ہے۔ ایک روز جب میں دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا، ہوٹل کا مالک کاؤنٹر سے اٹھ کر میرے پاس آ بیٹھا۔ میں نے بمشکل کھانا ختم کیا اور ہاتھ دھونے کے لیے اٹھا تو وہ بولا: ''آج آپ میرے ساتھ چائے پئیں گے۔'' میں نے کہا: ''میں چائے کا عادی نہیں ہوں۔'' اس پر کہنے لگا: ''آج تو میری خوشی کی خاطر آپ کو چائے پینا ہوگی۔'' مجھے مانتے ہی بنی۔ چائے پینے کے دوران میں وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا: ''میں آپ کا بڑا ممنون ہوں۔ آپ کو پتا ہے کہ اختر صاحب اپنا بل ادا کرنے میں لاپروائی کے عادی ہیں لیکن جب سے آپ کھانا کھانے لگے ہیں، وہ باقاعدگی سے مہینے کی پہلی تاریخ کو آ کر ادائیگی کر دیتے ہیں۔''

اختر کے نمایاں شاگردوں میں احمد ندیم قاسمی صاحب، ن م راشد، شورش کاشمیری، مرزا ادیب، کنیز فاطمہ حیا اور عزیز جہاں بیگم ادا (جعفری) کے نام لیے جاتے ہیں۔ دراصل اختر صاحب شاعری میں روایتی استادی شاگردی کے قائل نہ تھے۔ لاہور کے زمانہ قیام میں بہت سے نومشق شعرا اپنے ظرف کے مطابق ان سے مستفید ہوتے تھے۔ متعدد نوجوان شاعروں کا کلام ان کے زیرادارت شائع ہونے والے رسالوں میں چھپتا تھا اور یوں اصلاح کی ایک صورت خودبخود پیدا ہو جاتی تھی۔ اس ضمن میں قاسمی صاحب فرماتے ہیں: ''اختر سے مجھے باقاعدہ تلمذ تو حاصل نہیں تھا مگر وہ میرا نومشقی کا کلام شائع کرتے ہوئے کسی شعر میں کوئی ایک آدھ تبدیلی کر دیتے تھے۔ اس سے میں اپنی اصلاح کر لیتا تھا[۱۴]۔''

قمر تسکین اپنے ایک مضمون میں یہ دلچسپ اطلاع فراہم کرتے ہیں: ''۱۹۴۲ء[۱۵] کا ذکر ہے۔ راقم الحروف، ظفر چودھری اور اختر شیرانی مرحوم اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ کے بالمقابل عرب ہوٹل میں بیٹھے گپ شپ میں مصروف تھے کہ سانولے رنگ کا ایک نوجوان داخل ہوا اور اختر مرحوم کو سلام کر کے بڑے ادب سے ان کے قریب بیٹھ گیا اور اس نوجوان نے ایک کاغذ اختر مرحوم کی طرف بڑھا دیا۔ اختر نے فوراً ہی جیب سے قلم نکالا اور اصلاح شروع کر دی۔ اختر کو اس نوجوان کی غزل میں ایک شعر سخت ناپسند تھا، اس لیے انہوں نے اس شعر کو حذف کر کے اس کی جگہ ایک اور شعر لکھا۔ پھر اپنے شاگرد کو حذف کردہ شعر کی اغلاط سے واقف کیا اور اس کی جگہ جو شعر لکھا تھا وہ پڑھا:

اے دوست ہم نے ترکِ تعلق کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

اختر کے اس نوجوان شاگرد کا نام ناصر کاظمی تھا اور متذکرہ شعر ناصر کاظمی کی غزل میں استاد کا عطیہ تھا۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ یہ شعر اس غزل کی جان قرار پایا ہے[۱]۔''
اصلاح کا سلسلہ کسی حد تک ٹونک میں بھی جاری رہا بلکہ عطایا میں خاصا اضافہ ہو گیا۔ پھر عالم مستی میں بعض لوگ ان کا تازہ کلام بھی ہتھیا لیتے تھے، تبرکاً اپنے پاس رکھنے کی خاطر یا مشاعروں میں پڑھنے کی غرض سے۔ اسی طرح اختر کا بہت سا کلام منتشر اور ضائع ہو گیا۔ میں فروری ۱۹۹۶ء میں ٹونک گیا ہوا تھا اور اختر صاحب کے جگری دوست صاحبزادہ حامد سعید خاں[۲] ساحل مرحوم کے فرزند محمد رشید خاں عرف محمد میاں کے ہاں قیام پذیر تھا۔ ایک دن ایک صاحب، جن کا نام پیر مقصود علی خان تھا، آئے اور صاحب خانہ کی فرمائش پر ترنم کے ساتھ نعتیں سنانے لگے۔ محمد میاں نے ان سے پوچھا: ''آپ کو اختر شیرانی کی بھی کوئی نعت یاد ہے؟'' انہوں نے اثبات میں جواب دیا اور یکے بعد دیگرے تین نعتیں سنائیں جن میں اختر تخلص بھی موجود تھا۔ ایک کا مطلع یاد ہے:

بارِ عصیاں سے نہیں اٹھتا قدم سیدنا
وقتِ امداد ہے ہو جائے کرم سیدنا

میں نے اس سے پہلے یہ نعتیں نہ کبھی سنی تھیں نہ کہیں پڑھی تھیں۔ میں نے جب محمد میاں سے اس بات کا ذکر کیا تو انہوں نے بتایا کہ یہاں ٹونک میں بہت سے لوگوں کے پاس اختر مرحوم کا ایسا کلام موجود ہے جو ان کے مجموعہ ہائے کلام میں شامل نہیں بلکہ ایک صاحب کے پاس تو اختر کی ایک پوری بیاض ہے جس کے مندرجات کو وہ مشاعروں میں اپنے نام سے پڑھا کرتے ہیں۔ تاہم بہت سے لوگوں کو اس کی حقیقت کا علم ہے۔ نعتوں کے ذکر سے یاد آیا کہ اختر صاحب عشق رسول اکرمؐ سے سرشار تھے اور دل کی گہرائیوں سے نعت کہتے تھے۔ شورش کاشمیری مرحوم نے اختر کے عشق رسولؐ کا ایک ایمان افروز واقعہ بیان کیا ہے جو عرب ہوٹل میں پیش آیا تھا اور جس میں اختر صاحب نے مدہوش ہونے کے باوجود ایک گستاخ نوجوان کی سرزنش کی تھی۔ بقول شورش: ''پھر

بے اختیار رونے لگے۔ کہتے جاتے، ہم عاصیوں کا تو ایک ہی ٹھکانہ ہے، سرکار مدینہ، دربار مدینہ اور اس اشکبار حالت ہی میں انہوں نے یہ شعر کہہ ڈالے۔ معلوم نہیں یہ ارتجالاً تھے یا اس سے پہلے وہ یہ نعت کہہ چکے تھے[18] لیکن جب ایک ایک بند بول رہے تھے تو ان کے گالوں پر آنسوؤں کے قطرے عقیدت کے چراغ بن کر روشن تھے[19]۔''

ٹونک میں محافل میلاد کا بڑا رواج تھا بالخصوص خواتین میں۔ محلّہ شاگرد پیشہ کی ایک ادھیڑ عمر خاتون، بستی خالہ جو جگت خالہ تھیں اور ان کی ایک بہن ان محفلوں کی رونق ہوتی تھیں۔ کیا پختہ اور پاٹ دار آوازیں تھیں۔ اکثر میلاد خلیل[20] پڑھا جاتا تھا۔ ایک رات ہمارے ہاں زنانہ محفل میلاد تھی۔ گرمی کا موسم تھا اس لیے اوپر کی منزل پر اہتمام کیا گیا تھا۔ اختر صاحب نیچے صحن میں تھے۔ جب یہ نظم پڑھی جانے لگی کہ

خوب تو نے مجھ کو مولا رنگ دیا
او رنگیلے رنگ اچھا رنگ دیا

تو اختر صاحب بھنا گئے۔ بولے: ''یہ کیا پڑھا جا رہا ہے۔ نیلا رنگ دیا پیلا رنگ دیا۔'' پھر اسی وقت یہ نعت[21] لکھ کر دی:

سحر دم رحمت حق کا یہ مستانہ پیام آیا
مبارک اہل ایماں کو کہ وہ خیرالانام آیا
خدائی جس کے جلووں سے ہمیشہ جگمگائے گی
شبستان حرا کا آج وہ ماہِ تمام آیا

کل نو اشعار ہیں اور آخری شعر یہ ہے:

مزا جب ہے کہ جائیں خلد میں ہم اس طرح اختر
کہیں حوریں محمدؐ کا وہ مستانہ غلام آیا

اختر صاحب اپنے والد کی ناراضگی کے باوجود ان کا حد سے زیادہ احترام کرتے تھے۔ انہیں

اس بات کا اعتراف تھا کہ بابا کی ان سے برہمی بلا جواز نہیں ہے اور اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ جو کچھ مجھے بنانا چاہتے تھے وہ میں بن نہیں سکا۔ اپنی والدہ سے ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ اس کے بیان کے لیے الفاظ نہیں مل سکتے۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ ہوش وحواس سے عاری ہونے کی حالت میں بھی انہوں نے والدہ کے احترام کا دامن ہاتھ سے چھوڑا ہو۔ یہی رویہ ان کا اپنی دوسری والدہ کے ساتھ تھا۔ ان دونوں کے آگے تو بالکل بچہ بن جاتے تھے۔ حافظ صاحب کے انتقال کے بعد عدت پوری ہونے پر ہماری دوسری دادی جان عزیزوں سے ملنے کے لیے ہمارے آبائی گاؤں شیرانی آباد گئیں۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے ایک ماہ رہنے کا خیال تھا۔ جاتے ہوئے ان سے کہہ بیٹھیں: ''میں تمہاری بے اعتدالیوں کی وجہ سے ناراض ہو کر جا رہی ہوں، اب واپس نہیں آؤں گی۔'' اس وقت تو کچھ نہ کہہ سکے لیکن ابھی ان کو گئے دو ہفتے بھی نہ ہوئے تھے کہ بے قرار ہو گئے۔ مجھے ایک عزیز کے ہمراہ ان کو لینے کے لیے بھیجا۔ جب وہ واپس آئیں تب انہیں چین آیا۔

سرزمین ٹونک سے اختر صاحب کو بڑی محبت تھی اور یہ فطری امر تھا۔ ان کے بچپن اور لڑکپن کا سنہری دور اسی شہر شعر وحکمت میں گزرا تھا۔ ٹونک سے اپنی محبت کو انہوں نے ''او دیس سے آنے والے بتا'' جیسی لافانی نظم لکھ کر زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ اگرچہ نظر ثانی کرتے وقت انہوں نے نظم کی اپیل میں وسعت پیدا کرنے کی خاطر کچھ ترامیم کر دی تھیں اور کچھ مخصوص ناموں کو عمومی الفاظ سے بدل دیا تھا لیکن اب بھی نظم کے ۳۳ بندوں میں سے اکثر میں ٹونک کا نہاں وعیاں تذکرہ موجود ہے مثلاً دریائے بناس اور ٹونک شہر کے محل وقوع کے بارے میں یہ بند:

او دیس سے آنے والے بتا

کیا شہر کے گرداب بھی ہے رواں — دریائے حسیں لہرائے ہوئے
جوں گود میں اپنے من کو لیے — ناگن ہو کوئی تھرائے ہوئے
یا نور کی ہنسلی حور کی گردن — میں ہو عیاں بل کھائے ہوئے
او دیس سے آنے والے بتا

یا ٹونک کے شہر اور اس کے معاشرے کی یہ جھلک:

او دیس سے آنے والے بتا

ویرانیوں کی آغوش میں ہیں ـــــ آباد وہ بازار اب کہ نہیں؟
تلواریں بغل میں دابے ہوئے ـــــ پھرتے ہیں طرحدار اب کہ نہیں؟
اور بہلیوں میں سے جھانکتے ہیں ـــــ ترکان سیہ کار اب کہ نہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا

اور اس بند میں تو ٹونک کے بعض آثار کا نام لے کر اس کی یاد تازہ کی ہے:

او دیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی پرانے کھنڈروں پر ـــــ تاریخ کی عبرت طاری ہے؟
ان پورنا کے اجڑے مندر پر ـــــ مایوسی و حسرت طاری ہے؟
سنسان گھروں پر چھاؤنی کے ـــــ ویرانی و رقت طاری ہے
او دیس سے آنے والے بتا

اس نظم کے علاوہ بعض دیگر منظومات مثلاً ''نذر وطن'' اور ''اے ابر رواں جا سوئے وطن'' یا ''اجڑے ہوئے پائیں باغ میں'' بھی صریحاً ٹونک کی یادوں سے معمور ہیں۔

اختر صاحب کو ٹونک کی طرح اہلیان ٹونک سے بھی گہری محبت تھی۔ حافظ صاحب مردم بیزاری کی حد تک گوشہ نشین تھے اور یہ ان کی علمی اور تحقیقی مصروفیات کا تقاضا بھی تھا۔ اختر صاحب اپنے والد کے مقابلے میں نہایت ملنسار اور کثیر الاحباب تھے۔ ہر کہ ومہ سے بڑی کشادہ دلی اور خندہ پیشانی سے ملتے۔

میں جنوری ۱۹۸۲ء میں عربیک پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ٹونک کے منعقد کردہ حافظ محمود شیرانی سیمینار میں شرکت کے لیے گیا۔ مجلس یادگار حافظ محمود شیرانی، لاہور کے نمائندے کی حیثیت سے عزیزی عبدالقیوم، ٹونک کے دو اہل علم صاحبزادہ شوکت علی خاں اور سید منظور الحسن برکاتی صاحبان کی خدمت میں طلائی تمغے[۲۱] پیش کرنے کی غرض سے میرے ہمراہ تھے۔ سیمینار میں یہ بات دیکھنے میں آئی کہ جو مقامی مقررین حافظ صاحب کی حیات و خدمات پر اظہار خیال کے لیے

آتے وہ اصل موضوع پر سرسری گفتگو کرنے کے بعد اختر صاحب کا تذکرہ چھیڑ دیتے۔ عبدالقیوم کو یہ بات پسند نہ آئی۔ دبی زبان سے شکایت کی۔ میں نے کہا: ''خاموش رہو، تم یہ بات نہیں سمجھ سکتے۔'' لیکن ان کی تشفی نہ ہوئی۔ درمیانی وقفے میں انہوں نے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر شوکت علی خاں صاحب سے باقاعدہ احتجاج کیا۔ انہوں نے اس کی توجیہہ کرتے ہوئے کہا: ''بھائی! بات دراصل یہ ہے کہ محمود شیرانی صاحب کی علمی خدمات کے بارے میں کچھ کہنے کے لیے بڑے وسیع مطالعے اور گہری نظر کی ضرورت ہے۔ رہی ان کی شخصیت تو ان مقررین میں سے اکثر کو ٹونک میں رہنے کے باوجود ان سے ملاقات کی سعادت بھی نصیب نہ ہوئی ہوگی اور اختر صاحب کا تو عالم ہی دوسرا تھا۔ وہ ہر ایک سے بڑی اپنائیت سے ملتے تھے۔ جو بھی ایک بار ان سے مل لیتا تھا وہ ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا اور لطف یہ ہے کہ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ وہ سب سے زیادہ اسی سے محبت کرتے ہیں۔''

دوسرے دن میں اور عبدالقیوم، صاحبزادہ نصیر الدین حیدر[۲۳] سے ملنے گئے۔ انہوں نے چھوٹتے ہی شیرانی صاحب سے اپنے مراسم کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ عبدالقیوم بڑے اشتیاق سے سنتے رہے۔ کچھ دیر بعد بے ساختہ پوچھا: ''آپ حافظ صاحب کا ذکر کر رہے ہیں نا؟'' صاحبزادہ صاحب کا ردعمل فوری اور دلچسپ تھا۔ اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگے: ''ارے توبہ! میاں ان سے بات کرنے کا کسے یارا تھا۔ ان کو تو ہم تانگے میں بیٹھے ندی آتے جاتے دیکھ لیتے تھے۔ لوگ دور ہی سے کہتے تھے، وہ محمود شیرانی صاحب جا رہے ہیں۔ ان کے علم و فضل کا تو ہم جیسے اندازہ بھی نہیں کر سکتے جن کا اپنے شاعر، ادیب اور عالم و فاضل بیٹے کے بارے میں یہ کہنا تھا کہ کم بخت جاہل رہ گیا۔ ارے جاہل!۔''

سید منظور الحسن برکاتی صاحب نے میرے نام ایک خط میں اختر صاحب کی شخصیت پر یہ بلیغ تبصرہ کیا تھا: ''وہ ایک ایسا شخص تھا جو دنیا میں صرف چاہنے اور چاہے جانے کے لیے آیا تھا۔'' جنوری ۱۹۸۲ء کے قیام ٹونک کے دوران میں حکیم سید برکات احمد مرحوم و مغفور کی یادگار دارالعلوم خلیلیہ برکاتیہ کے ریکٹر شفاالملک حکیم ظہیر احمد برکاتی مرحوم نے مجھ ہیچ مداں کو ایک باوقار خطاب سے مفتخر کرنے کی غرض سے ایک جلسے کا اہتمام کیا۔ اس اجلاس میں ٹونک کے نغز گو شاعر حضرت دل ایوبی مرحوم نے ایک خیر مقدمی نظم پڑھی۔ اس کے ایک بند میں بھی اختر کی اس نمایاں صفت

کے بارے میں اشارہ موجود ہے۔ وہ بند یہ ہے:

جن میں تم کھیلے تھے وہ گلیاں جواں ہیں آج بھی
آرزوئیں زندہ ہیں، ارماں جواں ہیں آج بھی
پھول خنداں ہیں ابھی، کلیاں جواں ہیں آج بھی
عشق کے سارے سروساماں جواں ہیں آج بھی
ہاں مگر اختر سا کوئی چاہنے والا نہیں
آج لاکھوں میں بھی کوئی عشق کا مارا نہیں

ہمارا خاندان بھی ٹونک کے بہت سے گھرانوں کی طرح سید احمد شہید علیہ الرحمتہ سے نسبت اور ان کے ساتھی مجاہدین سے نسبی تعلق کی بنا پر دین سے خصوصی شغف رکھتا تھا۔ اختر صاحب کی مے نوشی حافظ صاحب کے لیے تو سوہان روح تھی ہی، باقی اہل خاندان کو بھی اس کا بڑا قلق تھا۔ بعض بہی خواہ اس عادت سے نجات کے لیے نسخے اور ٹوٹکے بتاتے رہتے تھے۔ ایک بار ماسٹر مٹھو لال جی[۲۴] نے، جو مجھے گھر پر پڑھانے کے لیے آتے تھے، یہ تجویز پیش کی کہ اختر صاحب کو شراب سے بچانے کے لیے بھنگ پر لگا دیا جائے۔ وہ بڑی رازداری کے ساتھ کسی حلوائی سے خاص طور پر بھنگ کی برفی تیار کروا کے لائے۔ ہلکے سبز رنگ کی یہ برفی اتنی پر کشش تھی کہ گھر والوں کے لیے اسے میری دست برد سے بچانا دشوار ہو گیا۔ چند روز تک یہ اختر صاحب کے دسترخوان پر سجائی جاتی رہی لیکن انہوں نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا:

غالبم تشنۂ تلخاب نہ ھمچو حافظ
عاشق شاخ نباتم تنانا ھا یاھو[۲۵]

پھر کسی بقراط نے رائے دی کہ اگر شیر کا جھوٹا گوشت پکا کر کھلایا جائے تو شراب ہمیشہ کے لیے چھوٹ سکتی ہے۔ چنانچہ جے پور کے چڑیا گھر سے رابطہ کر کے شیر کا پس خوردہ منگوایا گیا اور بڑے اہتمام سے بھون کر اختر صاحب کے آگے رکھا گیا۔ انہوں نے کھایا بھی لیکن نتیجہ وہی ٹائیں ٹائیں فش۔

اہل تدبیر کی وا ماندگیاں
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

اور شراب چھوڑی تو کس وقت! جب مرض الموت میں مبتلا ہو کر میوہسپتال (لاہور) میں داخل ہوئے۔ حالت سقیم ہوئی تو ڈاکٹروں نے صلاح کر کے کوشش کی کہ انہیں دو ایک گھونٹ بطور دوا پلائے جائیں، ممکن ہے کہ اس ترکیب سے ضعف میں کچھ افاقہ ہو۔ لیکن جب آب طربناک کا جام منہ کے نزدیک لے جایا گیا تو اس کی بو سونگھتے ہی ہونٹ بھینچ لیے اور منہ کی طرف اشارہ کر کے انگشت شہادت آسمان کی طرف اٹھا دی۔ مطلب یہ تھا کہ مے آلود دہن لے کر بارگاہ خداوندی میں حاضر ہونا مناسب نہیں:

بر سینۂ غم پذیر من رحمت کن
بر جان و دل اسیر من رحمت کن
بر پائے خرابات رو من بخشای
بردست پیالہ گیر من رحمت کن[۲۶]

شرفائے ٹونک کے دستور کے مطابق حافظ صاحب بہلی یعنی بیلوں کا تانگہ رکھا کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد یہ اختر صاحب کے قبضے میں آ گیا۔ بیلوں کی جوڑی اور عتیق گاڑی بان کی شامت آئی رہتی۔ سارا سارا دن گھومتے۔ کبھی کبھار مجھے بھی ساتھ لے لیتے۔ دوستوں کے ہاں جاتے مگر کہیں ٹکتے نہیں تھے۔ دو چار منٹ بات کی اور عتیق کو گاڑی بڑھانے کا اشارہ کیا۔ ہاں دو ایک بار صاحبزادہ سردار محمد خان[۲۷] کے ہاں ان کے دیوان خانے میں دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے اور میں پہلو بدلتا رہا۔

ایک دن خدا جانے کیا جی میں آئی کہ پرانے شہر میں رتلام والے سیٹھوں کی حویلی پر جا دھمکے۔ ہم بہن بھائیوں کے نام رقم ان ہی کے ہاں جمع تھی۔ منیم جی نے باہر آ کر سواگت کیا لیکن وہ ان کا مطالبۂ زر تسلیم کرنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ اختر صاحب کی دلیل یہ تھی کہ یہ پیسے میرے باپ کے ہیں سیٹھوں کے باپ کے نہیں۔ کچھ دیر رد و کد رہی بالآخر منیم جی نے کچھ نذرانہ دے کر

جان چھڑائی۔

حافظ صاحب کی وفات فروری ۱۹۴۶ء میں ہوئی تھی۔ کیا اصول پرست اور وضع دار انسان تھے۔ بیٹے کو بیماری مرگ میں بھی یاد نہیں کیا۔ ان کی وفات کا اختر صاحب کو بے حد صدمہ ہوا۔ خاندان کی سربراہی کا بوجھ سر پر آن پڑا۔ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا ان کے بس کی بات کہاں تھی۔ یہاں تو آلامِ روزگار سے چھٹکارے کا ایک ہی علاج تھا:

غم زمانہ نہیں اک عذاب ہے ساقی
شراب لا مری حالت خراب ہے ساقی

مے نوشی میں تسلسل اور کثرت پیدا ہوگئی۔ ایام مسترقہ کی تعداد گھٹتے گھٹتے صفر تک پہنچی۔ بہکنے اور بنکارنے لگے۔ رات رات بھر حویلی اور پائیں باغ میں موہوم ہیولوں کے پیچھے بھاگتے رہتے اور غیر مرئی چیزوں پر جھپٹتے۔ گھر کے ماحول میں ایسا ہراس پیدا ہوگیا کہ آج بھی تصور سے دم گھٹتا ہے۔

اس جسمانی اور ذہنی صحت کے زوال پر مستزاد مالی پریشانی تھی۔ ملک کا سیاسی مطلع ابر آلود ہی نہیں خوں بار بھی تھا۔ ان حالات میں مشاعروں میں اور ریڈیو سٹیشنوں پر جانے کا کیا مذکور، رسالوں کو تازہ کلام کی فراہمی کا سلسلہ بھی منقطع ہو کر رہ گیا تھا۔ زندگی کی بنیادی ضروریات کا تو کوئی مسئلہ نہ تھا لیکن ادھار کی شراب کہاں تک چلتی۔ چنانچہ عزیزوں، دوستوں اور شناساؤں سے استمداد تک نوبت پہنچی۔ وہ شخص جس کا احترام مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خاں جیسے زعمائے قوم بھی ملحوظ رکھتے تھے، دخترِ رز کے ہاتھوں ان حالوں کو پہنچ گیا۔

۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء کے دو سال ہم پر بڑے شاق گزرے۔ پاکستان بنا تو اختر صاحب نے اپنی قوتِ ارادی کو مجتمع کیا۔ پروگرام یہ بنا کہ وہ لاہور جائیں گے اور وہاں مکان کا بندوبست کر کے ہم لوگوں کو بلوالیں گے۔ ۱۹۴۸ء کے آغاز میں وہ جوں توں کر کے لاہور پہنچے اور اپنے حبیب لبیب حکیم نیر واسطی صاحب کے ہاں قیام کیا۔ نیر منزل سے انہوں نے جو خط لکھے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اپنی ذمے داریوں کا احساس ضرور تھا۔ ان خطوں میں مختلف اطلاعات کے ساتھ ساتھ آبائی مکان اور دوسری منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کے بارے میں بعض ہدایات بھی درج ہوتی

تھیں۔ اسی عالم میں چند ماہ گزر گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ میدان عمل کے آدمی نہ تھے۔ فسادات کے نتیجے میں لاہور پہنچنے والے مہاجرین کی حالت زار نے بھی ان کے حساس دل کو بری طرح متاثر کیا۔ رہے سہے قویٰ اہل خانہ سے مفارقت نے سلب کر لیے۔ اس دوران میں کہی گئی بعض منظومات سے ان کی جذباتی کیفیت اور رقتِ قلب کا سراغ ملتا ہے۔ اس مایوسی کا آئینہ داران کا سانیٹ ''مہاجرہ'' ہے جسے میں یہاں درج کرتا ہوں۔

سکوں نصیب نہیں میری جان بسمل کو
فضائے غم میں مرے قلب کو قرار نہیں
کوئی امید نہیں ہے کہ سوگوار نہیں
وہ گم شدہ ہوں ترستا رہے جو منزل کو
دیار غیر میں روئے نشاط محفل کو
وہ شاخِ خشک جو معمور برگ و بار نہیں
فسردہ گل جسے امید نو بہار نہیں
الٰہی! کیا کروں اپنے الم زدہ دل کو
چمن سے دور ہوں اک بلبلِ حزین وخموش
ستا رہی ہو جسے یاد آشیانے کی
فلک نے چھین لی جس سے خوشی زمانے کی
گلوں سے دور ہوں میں ایک گل حزین وخموش
ہوائے خلد ہو دل میں تو خار بھی نہ ملے
جو مر رہوں تو کنار مزار بھی نہ ملے

بالآخر اختر صاحب کی ہدایت کے مطابق ہم لوگ بعض اعزہ کے ہمراہ ٹونک سے چل کر ۱۹۴۸ء کے وسط میں کھوکھراپار اور حیدرآباد سے ہوتے ہوئے لاڑکانہ پہنچے۔ ابھی سنبھلنے ہی نہ پائے تھے کہ لاہور سے ان کی شدید علالت کا تار ملا۔ ایک عزیز کی معیت میں، میں اپنے چھوٹے بھائی، والدہ اور دادی جان کو لے کر ۱۱ ستمبر کی شام کو لاہور پہنچا تو ان کے انتقال کو دو روز ہو چکے تھے اور

ان کا جسدِ خاکی ہم لوگوں کے انتظار میں میو ہسپتال کے سرد خانے میں رکھا تھا۔ اگلی صبح جب ان کا تابوت نیّر منزل لایا اور منہ دیکھنے کے لیے رکھا گیا تو میں سب کے اصرار کے باوجود ان کے چہرے پر نظر نہ ڈال سکا جس کی شعوری توجیہہ شاید میں کبھی نہ کر سکوں۔

حواشی

۱- ''کیا قافلہ جاتا ہے'' صفحہ ۹۰، کراچی، ۱۹۸۴ء

۲- شمارہ جنوری ۱۹۲۵ء

۳- ''اختر شیرانی اور جدید اردو ادب'' صفحہ ۵۷، کراچی، ۱۹۷۶ء

۴- طبع اوّل، دہلی ۱۹۴۳ء۔ طبع دوم انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی، ۱۹۹۲ء

۵- شفاالملک حکیم ظہیر احمد برکاتی (وفات جے پور، ۲ فروری ۱۹۸۷ء)

۶- ذفیر صاحب بہار کے رہنے والے تھے۔ نوعمری میں ٹونک آ گئے تھے۔ یہاں دارالعلوم خلیلیہ میں پڑھتے تھے۔ پھر یہیں تدریسی فرائض انجام دینے لگے۔ ۱۹۴۷ء میں ان کے سب عزیز واقارب بہار کے فسادات میں مارے گئے۔ چنانچہ یہ ٹونک چھوڑ کر وطن چلے گئے تھے۔

۷- وفات حیدر آباد (سندھ)، ۱۳ فروری ۱۹۸۶ء

۸- ''اختر شیرانی اور جدید اردو ادب'' صفحہ ۵۵-۵۶

۹- معروف صحافی، ہدایت کار اور فلم ساز۔ ۴۵ برس کی عمر میں یکم اکتوبر ۱۹۷۲ء کو وفات پائی۔

۱۰- ''اختر شیرانی'' مشمولہ ''جناب'' لاہور، بار چہارم، ۱۹۸۶ء

۱۱- طفیل صاحب نے یہ صراحت نہیں کی کہ یہ صاحب اختر کے مدیر معاون نازش رضوی مرحوم تھے یا ان کے عزیز شاگرد اعجاز سکندر نازش، جن کا تعلق کندیاں سے تھا۔

۱۲- ٹونک میں ان دنوں بینکنگ کا کام بعض ہندو ساہوکار کیا کرتے تھے۔ ان میں اجمیر والے اور رتلام والے بہت مشہور تھے۔
۱۳- میں ان دنوں پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں ایم اے (فارسی) کا طالب علم تھا۔
۱۴- ''خاندان شیرانی سے وابستہ یادیں'' مطبوعہ ''مرغزار'' گورنمنٹ کالج شیخوپورہ، اپریل ۱۹۹۶ء
۱۵- ان دنوں اختر صاحب غالباً کسی مشاعرے میں شرکت کی غرض سے ٹونک سے لاہور آئے تھے اور کچھ دن یہاں مقیم رہے تھے۔
۱۶- ''شاعر رومان اختر شیرانی'' مطبوعہ روز نامہ ''امروز'' لاہور، ۲۳ جنوری ۱۹۷۷ء
۱۷- متوفی، ۲۷ نومبر ۱۹۸۸ء
۱۸- اس نعت کے پانچ بند اختر کے آخری مجموعہ کلام ''شہروذ'' میں شامل ہیں۔
۱۹- دیکھیے شورش کاشمیری کا مضمون ''اختر شیرانی کا آخری مجموعہ کلام'' مطبوعہ ''نیرنگ خیال'' بابت نومبر ۱۹۵۰ء
۲۰- نظم ونثر پر مشتمل یہ میلاد والی ٹونک نواب محمد ابراہیم علی خاں خلیل کی تصنیف تھا۔
۲۱- یہ نعت بھی ''شہروذ'' میں شامل ہے۔
۲۲- یہ تمغے اکتوبر ۱۹۸۰ء میں حافظ محمود شیرانی کی صد سالہ تقریب ولادت کے موقع پر لکھے گئے مضامین کے اعتراف میں عطا کیے گئے تھے۔
۲۳- نواب ابراہیم علی خاں کے پوتے اور صاحبزادہ عبدالرشید خاں عرف بھورا میاں کے فرزند تھے۔ میری ان سے نسبتی عزیزداری بھی تھی۔ سہل ممتنع میں غزل کہتے تھے اور پڑھنے کا انداز ایسا تھا جیسے گفتگو کر رہے ہوں۔
۲۴- مٹھو لال ان کی عرفیت تھی۔ اصل نام رمیش چندر جڑیا تھا۔ محلّہ تختہ میں رہتے تھے۔ میں سنہ ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۸ء تک برابر ان سے پڑھتا رہا۔ قیام پاکستان کے بعد جب بھی ٹونک جاتا ان کی خدمت میں حاضری دیتا تھا۔ بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔ ابھی سنہ ۲۰۰۰ء کے اوائل میں ان کا انتقال ہوا ہے۔
۲۵- ''میں غالب ہوں آب تلخ (شراب) کا پیاسا، حافظ (شیرازی) کی طرح کوزہ مصری

کارسیا نہیں ہوں۔ تنہ ناہایاھو۔'' ('تنہ ناہایاھو' فارسی میں رندوں کا ایک نعرۂ مستانہ ہے)

۲۶- ''میرے سینے پر جو غموں کا ٹھکانہ ہے، رحم فرما۔ میرے قید و بند میں گرفتار جان و دل پر رحم کر۔ میرے میخانے جانے والے پاؤں کو بخش دے (اور) میرے جام شراب تھامنے والے ہاتھ پر رحم کھا۔''

۲۷- نواب ابراہیم خاں کے بھتیجے اور صاحبزادہ اسحاق خاں کے بیٹے تھے۔ عرفیت بندو میاں تھی۔ سول سروس میں چلے گئے تھے۔ ضلع لاڑکانہ کے کلکٹر (ڈپٹی کمشنر) رہ چکے تھے۔ سرشاہنواز بھٹو سے پہلے ریاست جوناگڑھ کے دیوان بھی رہے۔ ان دنوں ملازمت سے فارغ ہوکر ٹونک ہی میں قیام پذیر تھے۔

یادگارِ اسلاف

مولانا سید محمد یعقوب حسنی (۱۸۷۴ء-۱۹۵۷ء)

یورپ میں دوسری جنگ عالمگیر (۴۵-۱۹۳۹ء) کا خاتمہ ۷ مئی ۱۹۴۵ء کو ہوا جب فرانس میں ریمز کے مقام پر واقع جنرل آئزن ہاور کے ہیڈ کوارٹر میں ایک معاہدے پر دستخط کیے گئے لیکن ابھی جاپان میدان میں ڈٹا ہوا تھا۔ بالآخر ۶ اگست کو ہیروشیما پر پہلا اور ۹ اگست کو ناگاساکی کی بندرگاہ پر دوسرا ایٹم بم گرانے سے جاپان بھی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گیا اور ۱۴ اگست ۱۹۴۵ء کو اس نے بھی غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیے۔ اس سال کی آخری سہ ماہی میں اتحادی فوجی بالخصوص وہ جو ضرورت کے تحت عارضی بھرتی ہوئے تھے، اپنے گھروں کو واپس آنے لگے۔ میرے رشتے کے ایک چچا اعجاز محمد خاں[1] جو رائل نیوی میں چیف پیٹی آفیسر تھے، برما کے محاذ سے ٹونک واپس آئے۔ یہ نواب سعادت علی خاں (۴۷-۱۹۳۰ء) کا دور تھا۔ واپس آتے ہی انہیں ریاست کے بگھی خانے میں ملازمت مل گئی۔ چچا پکے نمازی تھے۔ چہرے پر نیوی والوں کی مخصوص ڈاڑھی بھی تھی۔ ان کا مکان محلہ مہندی باغ میں ہمارے قریب ہی تھا۔ صبح ڈیوٹی پر جاتے تو عصر کے بعد لوٹتے، مغرب کی نماز پڑھنے مسجد کو جاتے تو مجھے اور اپنے ایک نواسے کو ساتھ لے جاتے۔ میری عمر دس برس کی تھی۔ ہمارے مکانات پہاڑی کی ڈھال پر واقع تھے۔ بازار علی گنج پار کرتے ہی تیلیوں کے تالاب کی پال کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ وہاں با جماعت نماز ادا کر کے واپس آتے۔ چچا کو بچوں کی تربیت کا بڑا خیال رہتا تھا۔ غصے کے بھی تیز تھے۔ ہاتھ میں ایک خوبصورت چھڑی ہوتی تھی۔ راہ میں اگر کسی ناواقف کا بچہ بھی کوئی غلط حرکت کرتا مل جاتا تو دو تین چھڑیاں رسید کر دیتے تھے۔

وہ زمانہ اور معاشرہ ایسا تھا کہ بچوں کے والدین ناراض ہونے کے بجائے ممنون ہوتے۔

ٹونک میں جمعہ کی چھٹی ہوتی تھی، چنانچہ جمعے کی نماز پڑھنے بھی ہم انھی کے ساتھ جاتے۔ تالاب والی مسجد میں تو جمعے کا اہتمام تھا نہیں۔ شہر کی بڑی مساجد ہمارے محلے سے جنوب کی طرف واقع تھیں۔ پہلے ہی جمعے کو ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ چچا نے بجائے جنوب کے شمال کا رخ کر لیا۔ نئے اور پرانے شہر کے سنگم پر پہنچ کر ہم اس سڑک پر ہو لیے جو دریائے بناس کے ککراج گھاٹ کو جاتی ہے۔ دائیں ہاتھ پرانے شہر کی پختہ فصیل اور بائیں ہاتھ دربار ہائی سکول کا احاطہ اور پھر سکول کی گراؤنڈ ختم ہونے پر مولانا صاحب کا قبرستان۔ قبرستان ختم ہوا تو دائیں ہاتھ فصیل میں ایک پھاٹک جو مالپورہ دروازہ کہلاتا تھا اور بائیں جانب ایک خوبصورت اور کشادہ مسجد جسے مولانا صاحب کی مسجد کہا جاتا تھا۔ (بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہ مسجد مولانا سید حیدر علی رامپوری کی تعمیر کردہ اور انھی کے نام سے منسوب ہے۔)

ابھی نماز میں خاصی دیر تھی اس لیے ہمیں دالان میں اگلی صفوں میں جگہ مل گئی۔ میں چچا کے بائیں طرف سر جھکائے مؤدب بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک تحمید و تقدیس کی آواز کان میں پڑی۔ سر اٹھا کر دیکھا تو ایک نورانی صورت بزرگ منبر پر بیٹھے وعظ کا آغاز کر رہے تھے۔ نورانی صورت میں نے محاورتاً نہیں کہہ دیا، حقیقت یہ ہے کہ اس بات کو پچپن چھپن برس کا عرصہ گزر جانے کے باوجود میں نے آج تک ایسا نورانی چہرہ نہیں دیکھا۔ رنگ میدہ و شہاب، ڈاڑھی اور سر کے بال مہندی سے سرخ، نکلتا ہوا قد، چھریرا بدن، متناسب اعضا، دانت ایسے جیسے سچے موتیوں کی لڑی۔ سر پر کپڑے کی ٹوپی، اس پر عمامہ، لمبی قمیض، شرعی پاجامہ، چہرے پر تقویٰ و تقدس کا وہ عالم کہ وہ اس دنیا کے باشندے معلوم ہی نہ ہوتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ عالم علوی سے کوئی فرشتہ اتر کر مسجد کے منبر پر بیٹھ گیا ہے۔ ان کے سراپا کی جاذبیت نے مجھے مبہوت کر دیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کچھ ارشاد فرما رہے تھے لیکن مجھے ان کی باتوں پر توجہ دینے کا ہوش نہ تھا۔ وعظ کے بعد انہوں نے بڑے دل نشین انداز میں خطبہ پڑھا اور نماز پڑھائی۔

اب نماز جمعہ انھی بزرگ کی اقتدا میں ادا کرنا معمول بن گیا۔ مجھے یاد نہیں کہ ہم ایک بار بھی کسی اور مسجد میں جمعہ پڑھنے گئے ہوں۔ چچا کا تو پتا نہیں لیکن مجھے اس نوعمری کے باوجود جمعے کے دن کا انتظار رہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کا سبب ان بزرگ شخصیت کی مقناطیسی کشش تھی۔

آہستہ آہستہ میں نے ان کی باتوں اور انداز گفتگو پر غور کرنا شروع کیا تو پتا چلا کہ اس کشش میں ان کے روشن چہرے اور سفید براق لباس کے علاوہ اور بہت سی چیزوں کا بھی حصہ تھا۔ وہ بڑے دھیمے لہجے اور سادہ انداز میں گفتگو کرتے تھے۔ نہ تشبیہ، نہ استعارہ، نہ اشعار کا استعمال اور گا کر نثر پڑھنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کوثر و تسنیم میں ڈھلی ہوئی فصیح اور بامحاورہ زبان جیسے کوئی کانوں میں رس گھول رہا ہو۔ مجال ہے کبھی آواز معمول سے بلند ہو جائے۔ لاؤڈ سپیکر کا تو ابھی رواج نہ ہوا تھا۔ حاضرین اس انہماک اور خشوع و خضوع سے ان کے ارشادات سنتے تھے کہ مسجد بھری ہونے کے باوجود ایک سناٹا طاری رہتا۔ کبھی کبھی کوئی آہ یا سسکی اس مسحور کن سکوت کو مرتعش کر دیتی تھی۔ میں سوچا کرتا تھا کہ مولانا کی باتوں میں اتنا اثر کیوں ہے؟ اب یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس کا سبب ان کے ایمان کی پختگی اور نیت کا خلوص تھا۔ وہ جو بات کہتے تھے دل کی گہرائی سے کہتے تھے اس لیے وہ سامعین کے دل میں اتر جاتی تھی۔ گویا از دل خیزد بر دل ریزد والا مضمون تھا۔

اس سلسلے کو قائم ہوئے کوئی برس دن کا عرصہ گزرا ہو گا کہ مجھے ایک عجیب احساس ہوا۔ وہ یہ کہ مولانا اپنے وعظ میں کبھی اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب اور قہر و جبر کا تذکرہ نہیں کرتے، ہمیشہ اس کی رحمت و مغفرت اور انعام و اکرام کا ذکر چھیڑتے ہیں۔ میں برابر اس ٹوہ میں رہا کہ کسی دن تو وہ اپنے معمول سے ہٹ کر دوسرے موضوع پر گفتگو کریں گے لیکن وہاں تو جیسے یہ خانہ ہی خالی تھا۔ میں نے کبھی ان کو عذاب قبر یا آتش دوزخ کا ذکر کرتے نہ سنا۔

ان کا ایک انداز مجھے بہت بھاتا تھا۔ وعظ کے دوران میں کوئی آیت یا حدیث پڑھ کر اس کا مفہوم بیان کرنے کے بعد اگر اس کے کسی خاص نکتے کی طرف حاضرین کی توجہ دلانا مقصود ہوتا تو مولانا دایاں ہاتھ اٹھا کر اور اس کی انگلیاں ذرا پھیلا کر فرماتے ''آ۔ ہا۔ ہا۔ ہا! کیسی بات کہی ہے اللہ رب العزت نے (یا حضرت رسالت مآبؐ نے ......)۔'' ان کا خطبۂ مسنونہ پڑھنے کا انداز بھی بڑا دلکش تھا۔ ع: عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا۔ خطبہ پڑھنے کھڑے ہوتے تو عصا ہاتھ میں تھام لیتے تھے۔ مجھے تو پورا خطبہ زبانی یاد ہو گیا تھا۔ میں کبھی کبھی گھر پر تنہائی میں انہی کے انداز میں اسے دہرانے کی کوشش کرتا لیکن چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ با ایں ہمہ اصل چیز مولانا کی تلاوت قرآن پاک تھی۔ اس کی تعریف و تعارف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ قرأت سے زیادہ تجوید کو ملحوظ رکھتے تھے۔ ہمیشہ پہلی رکعت میں سورۃ اعلیٰ اور دوسری میں سورۃ غاشیہ پڑھا کرتے۔

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ قرآن پاک کی تلاوت اس طرح کرنی چاہیے جیسے یہ قاری پر نازل ہو رہا ہے۔ غالباً مولانا ایسا ہی محسوس کرتے ہوں گے۔ بہرحال اتنا وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کی اقتدا کرنے والوں کو یہ احساس ہوتا تھا کہ مولانا کے قلب پر قرآن کا نزول ہو رہا ہے۔

ان اوصاف کے باعث میرے دل میں مولانا سے گہری ارادت اور دل بستگی پیدا ہو گئی تھی۔ لطف یہ ہے کہ اس عقیدت کے باوجود مجھے ان کا نام تک معلوم نہ تھا۔ چچا سے دریافت کرتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ کسی اور سے پوچھنے میں شرم مانع تھی۔ ہاں دل کو یقین تھا کہ یہ کوئی غیر معمولی شخصیت ہیں اور کسی اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

ہر جمعہ کو مولانا کی زیارت کا سلسلہ کوئی اڑھائی برس تک جاری رہا۔ ۱۹۴۸ء کے موسم گرما میں ہم لوگ پاکستان آ گئے۔ اس نقل مکانی کے نتیجے میں جن چیزوں سے جدائی کا شدید احساس ہوا ان میں ایک اہم چیز مولانا کی اقتدا سے محرومی تھی۔ جمعے کے دن وہ مجھے بہت یاد آتے۔ وقت گزرتا گیا اور دن مہینوں اور برسوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ میں فروری ۱۹۹۲ء میں ٹونک گیا ہوا تھا۔ ایک دن محبی سید منظور الحسن برکاتی؎ صاحب سے گفتگو کے دوران میں پرانی یادیں تازہ کرتے ہوئے مجھے مولانا کا خیال آیا۔ میں نے پوچھا: ''سنہ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۸ء تک کے عرصے میں مولانا صاحب کی مسجد میں ایک بزرگ جمعے کی نماز پڑھایا کرتے تھے۔ آپ ان کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟'' منظور میاں اپنے مخصوص دلکش انداز میں مسکرائے اور بولے: ''جی ہاں! وہ مولانا سید محمد یعقوب حسنی مرحوم تھے۔ آپ کے یونس؎ میاں کے دادا جان۔'' میں ان کی یہ بات سن کر اچھل پڑا۔ حضرت سید احمد شہید علیہ الرحمۃ کا خاندان التزاماً حسنی کہلاتا ہے اور سید شہید کے وقت سے ہی ہمارے بزرگوں کے اس خاندان کے ساتھ عقیدت مندانہ تعلقات رہے ہیں۔ منظور میاں کے اس انکشاف سے ایک تو مجھے مولانا کی شخصیت میں اپنے لیے والہانہ کشش کی وجہ سمجھ میں آ گئی، دوسرے اپنے لڑکپن کے اس قیاس کی صحت پر خوشی ہوئی کہ مولانا کا تعلق کسی دودمانِ عالی شان سے ہے۔ بھلا اس سے اچھا خاندان کون سا ہو گا جو صحیح النسب سید ہونے کے علاوہ علم و عمل اور زہد و تقویٰ کے اعتبار سے سلسلہ ہائے سادات میں واسطۃ العقد کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ خیال بھی آیا کہ ان اسلاف کا کیا عالم ہو گا جن کے اخلاف میں مولانا جیسی بے نظیر ہستیاں ہوں۔

ٹونک سے واپس آ کر مجھے مولانا کے سوانح حیات اور سیرت کے بارے میں معلومات کی

جستجو ہوئی۔ میں نے ایک عریضے میں ڈاکٹر یونس حسنی صاحب سے درخواست کی کہ وہ اپنے جدامجد پر ایک مفصل مضمون لکھیں یا پھر مجھے ضروری تفصیلات مہیا کریں تا کہ میں مولانا مرحوم پر کچھ لکھنے کے قابل ہوسکوں۔ میرے پاس سید احمد شہید کے احفاد واعقاب کے اسماء پر مبنی ایک شجرہ تھا جو محترم سید عامر حسنی صاحب نے میری درخواست پر ۱۹۸۰ء میں مجھے کراچی سے بھیجا تھا[۴]۔ میں نے یہ شجرہ تلاش کر کے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ مولانا سید یعقوب، سید شہید کی دوسری صاحبزادی ہاجرہ بی کے حقیقی پوتے تھے۔ تاہم شجرے سے حاصل ہونے والی اطلاعات مضمون لکھنے کے لیے بالکل ناکافی تھیں۔ تفصیلات کے لیے میں یونس میاں کے تعاون کا محتاج تھا۔ اتفاق سے موصوف ان معاملات میں بڑی بے نیازی سے کام لیتے ہیں۔ چنانچہ میرے تقاضوں اور ان کے وعدوں کی کشاکش میں کئی سال گزر گئے۔ بالآخر اپریل ۲۰۰۱ء میں کراچی جانے پر ان کے ساتھ دو نشستیں ہوئیں۔ ان میں قیمتی معلومات میسر آنے کے علاوہ چند اہم کاغذات بھی حاصل ہوئے جن کے لیے میں محترم یونس حسنی صاحب کا تہ دل سے ممنون ہوں۔

سید احمد شہید علیہ الرحمتہ (سنہ ۱۲۴۶-۱۲۰۱ھ) برعظیم کی ملت اسلامیہ کی تاریخ میں روشن تراز آفتاب ہستی ہیں۔ ان کے برادر حقیقی سید محمد ابراہیم (م ۱۲۲۴ھ) کے اکلوتے فرزند کا نام بھی سید محمد یعقوب تھا۔ یہ اپنے چچا سید احمد شہید کے مرید باصفا تھے۔ انہی کے ساتھ حج پر گئے اور ہجرت کی۔ بالاکوٹ کے واقعہ شہادت کے بعد دیگر اعزہ ومجاہدین کے ہمراہ سندھ میں مقیم ہو گئے تھے۔ نواب وزیرالدولہ کی درخواست پر ۱۲۵۲ھ میں سادات ومجاہدین کے قافلے کے ساتھ ٹونک پہنچے۔ نواب موصوف نے نہایت احترام کے ساتھ اس جماعت کا استقبال کیا۔ اس قافلے میں سید شہید کی دونوں محلات اور دونوں سے ایک ایک صاحبزادی بھی شامل تھیں۔ نواب صاحب نے ان کی خدمت میں دو گاؤں بطور جاگیر برائے ''معیشت فی سبیل اللہ'' نذر کیے[۵]۔ یہ جاگیریں نسلاً بعد نسلاً و بطناً بعد بطناً دواماً متداماً معاف ومرفوع القلم تھیں یعنی ان پر کسی قسم کا مالیہ لگان وغیرہ عائد نہ تھا۔

سید محمد یعقوب نے ۲۹ شوال ۱۲۸۷ھ کو ٹونک میں وفات پائی اور موتی باغ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ ان کے تین فرزندوں میں سب سے چھوٹے سید محمد یوسف تھے جو ۱۸ صفر ۱۲۴۲ھ کو علاقہ سندھ میں متولد ہوئے تھے۔ دس گیارہ برس کی عمر میں والد کے ہمراہ ٹونک آئے۔ سید یوسف

نہایت صالح، متین اور فیاض تھے۔ ان کی شادی سید شہید کی چھوٹی صاحبزادی سید ہاجرہؒ سے ہوئی۔ اس مبارک موقع پر نواب وزیر الدولہ نے ایک اور گاؤں کھنڈولیہ نامی عطا کیا جس کی سند میں وضاحت کی گئی تھی کہ یہ ''معیشت فی سبیل اللہ بی بی ہاجرہ صاحبہ وخرچ فیل سواری زوج بی بی صاحبہ'' کے لیے ہے۔ اس قران السعدین سے تین فرزند اور ایک صاحب زادی متولد ہوئے۔ بی بی ہاجرہ نے ۲۶ ربیع الثانی ۱۲۷۶ھ کو ٹونک میں رحلت کی۔ اس کے دس سال بعد ۱۲۸۶ھ میں سید محمد یوسف اپنے آبائی وطن دائرہ شاہ علم اللہ (ضلع رائے بریلی) گئے ہوئے تھے جہاں بتاریخ ۷ صفر المظفر، بحالت نماز عصر انتقال کیا اور وہیں روضہ شاہ ابوسعید کے احاطے میں دفن کیے گئے۔

سید شہید کے تینوں نواسے یعنی سید محمد یوسف کے فرزند اپنے اسلاف کی روایات کے امین اور پرہیزگاری اور للّٰہیت میں مثالی حیثیت رکھتے تھے۔ ان میں سب سے بڑے سید محمد عرفان (ولادت ۴ ذی الحجہ ۱۲۶۵ھ) تھے۔ ٹونک میں ابتدائی تعلیم کے بعد دیوبند میں مولانا محمود حسن اور مولانا یعقوب کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ پھر بھوپال میں صحاح ستہ مولانا عبدالقیوم (فرزند مولانا عبدالحئی بڈھانوی) سے پڑھیں اور قاضی حسین بن محسن انصاری الیمانی سے اجازت حاصل کی۔ بعدازاں دہلی میں شیخ الحدیث میاں نذیر حسینؒ محدث سے بھی اجازۂ حدیث سے مستفیض ہوئے۔ اس کے بعد سہارن پور میں مولانا فیض الحسنؒ سے عربی ادبیات کا علم حاصل کیا اور اس میں ایسی مہارت پیدا کی کہ بے تکلف عربی میں شعر کہتے تھے۔ مولانا عبدالحئی ندوی نے ''نزھتہ الخواطر'' (جلد ثامن) میں ان کا بڑے شاندار الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ مثلاً ''وجمع العلم والعمل والشعر والزھد والفصاحتہ والورع وقیام اللیل والعبادۃ والسداد فی الروایۃ ......'' (وہ علم، عمل، شاعری، تقویٰ، شیرینئ کلام اور پرہیزگاری کے جامع نیز شب زندہ دار اور روایت میں ثقہ تھے)۔

سید محمد عرفان نے کوئی نرینہ اولاد یادگار نہ چھوڑی۔ ان کی وفات ۲۳ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ (مطابق ۱۳ نومبر ۱۹۱۴ء) بروز جمعہ ٹونک میں ہوئی۔ ''میاں عرفان رحمتہ اللہ تعالیٰ'' (=۱۳۳۲ھ) تاریخ وفات ہے۔ مرقد موتی باغ ٹونک۔

منجھلے بھائی حافظ سید محمد یونس (ولادت ۱۲۶۸ھ) تھے جو اس مضمون کے موضوع مولانا سید محمد یعقوب کے والد تھے۔ قرآن پاک بہت ہی اچھا یاد تھا۔ جس نے بھی پڑھا اسے تقریباً ان کے برابر مستحضر رہا۔ علم ریاضی میں بھی مہارت حاصل تھی۔ پہلی بیوی سے مولانا سید محمد یعقوب اور ایک

دختر اور دوسری اہلیہ سے سید محمد یوسف اور دو صاحبزادیاں تھیں۔ سید محمد یونس کا انتقال ۶ ذی قعدہ ۱۳۲۲ھ (مطابق ۱۳ جنوری ۱۹۰۵ء) کو ہوا۔ تاریخ وفات ''رضی اللہ عن یونس'' (=۱۳۲۲) ہے۔

تیسرے اور سب سے چھوٹے بھائی سید محمد مصطفیٰ بھی حدیث کے عالم اور استاذ الکل میاں نذیر حسین محدث دہلوی کے شاگرد تھے۔ فراغت کے بعد ٹونک میں مسند درس کو زینت بخشی۔ حج کو بھی تشریف لے گئے اور برابر ایک سال تک حجاز مقدس میں قیام کیا۔ صاحب ''نزھۃ الخواطر'' ان کے تعارف میں کہتے ہیں: ''رحیب الصدر، کریم الکف، واسع العطاء، کثیر البکاء من خشیۃ اللہ سبحانہ...... '' اور معترف ہیں: ''لم عینی مثلہ فی الورع ولم اجد احدیٔساویہ فی اتباع السنۃ السنیۃ'' (میری آنکھ نے ان جیسا پرہیزگار نہیں دیکھا اور نہ ہی کسی کو سنت سنیہ کی پیروی میں ان کے برابر پایا۔)

سید مصطفیٰ لاولد رہے۔ انہوں نے سنہ ۱۳۲۰ھ (مطابق ۲۶ نومبر ۱۹۰۶ء) میں بروز چہار شنبہ جبکہ ماہ شعبان کے پانچ دن باقی تھے رحلت فرمائی[۸]۔ ان تینوں بھائیوں پر ہمہ خانہ آفتاب کی مثال صادق آتی ہے۔ ٹونک میں ایک معمولی آدمی سے لے کر والیٔ ریاست نواب ابراہیم علی خاں (۱۸۶۷ء - ۱۹۳۰ء) تک ان کا یکساں احترام کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے دلوں میں ان کی محبت پیدا کر دی تھی اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ خود اللہ تعالیٰ ان سے محبت نہ کرتا ہو۔

مولانا سید محمد یعقوب کی پرورش اور تربیت ایسے نفوس قدسی کی نگرانی اور صحبت میں ہوئی تھی۔ اس ماحول کا رنگ دکھانے کی غرض سے میں بخوف طوالت صرف دو واقعات مختصراً عرض کرتا ہوں جن کا تعلق سید محمد عرفان کی ذات والا صفات سے ہے۔ پہلے واقعے سے ان کی بے غرضی اور حق گوئی کا اندازہ ہوتا ہے۔

سید صاحب موصوف حج پر تشریف لے جا رہے تھے۔ نواب ابراہیم علی خاں کو پتا چلا تو وہ تمام سررشتہ آداب و رسوم کو بالائے طاق رکھ کر سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مسجد عرفان میاں کے دروازے پر سواری روک کر اندر تشریف لے گئے جہاں مولانا درس سے فراغت کے بعد موجود تھے۔ سلام و کلام کے بعد نواب صاحب نے پوچھا: ''عرفان میاں! سنا ہے آپ حج کو جا رہے ہیں؟''

''جی ہاں! آپ نے صحیح سنا ہے۔''

''مجھے کوئی خدمت بتائیے!''

''تمام تیاری مکمل ہے۔ کسی چیز کی حاجت نہیں۔''

''میں چاہتا ہوں کہ آپ کی کوئی خدمت بجا لاؤں اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کروں۔''

''عرض کیا نا کہ کوئی کمی محسوس نہیں ہو رہی۔''

''حضرت مجھے مایوس نہ لوٹائیے۔ کچھ تو ارشاد کیجیے۔''

اس اثنا میں سید صاحب کی نظر نواب صاحب کے پاجامے کے پائنچوں پر پڑ چکی تھی۔ چنانچہ فرمایا: ''سرکار! آپ کے پائنچے ضرورت سے زیادہ لمبے ہیں اور یہ اسراف میں داخل ہے، اگر آپ یہ قطع کر کے عنایت کر دیں تو ان سے مجھ غریب کی دو ٹوپیاں بخوبی بن سکتی ہیں۔'' نواب صاحب ان کا اشارہ سمجھ گئے۔ واپس نذر باغ پیلس پہنچ کر داروغہ توشہ خانہ کو طلب کیا اور حکم دیا کہ میرے سارے پاجاموں کے پائنچے کٹوا کر شرعی حدود میں لائے جائیں۔

دوسرا ایمان افروز واقعہ جو سید صاحب موصوف کی للّٰہیت اور جذبہ تسلیم و رضا کا آئینہ دار ہے یوں ہے کہ جب آپ کو وفات سے قبل مرض استسقاء لاحق ہوا تو بڑی شدید تکلیف میں مبتلا تھے۔ حکیم سید سعید احمد اسعد ان کے معالج تھے اور معائنے کی غرض سے پرانی ٹونک سے قافلہ آتے تھے۔ بڑے حاذق طبیب تھے لیکن آنکھیں حلیۂ بصارت سے عاری ہو چکی تھیں۔ سلام کے بعد پوچھا: ''عرفان میاں! کیا حال ہے؟'' جواب دیا: ''الحمدللہ''۔ پھر کہا، ''جو تکلیف ہے وہ بیان کیجیے۔'' پھر جواب ملا: ''الحمدللہ''۔ تیسری بار زور دے کر کہا: ''میں طبیب ہوں، مجھ سے حال بیان کیجیے۔'' وہاں وہی مختصر جواب تھا: ''الحمدللہ''۔ حکیم صاحب جھنجھلا کر بولے: ''عرفان میاں! الحمدللہ کا میرے پاس کوئی علاج نہیں ہے۔'' یہ تو تھا مولانا کے ددھال کا حال۔ ان کی والدہؒ بی بی رقیہ کا تعلق مولانا سید حیدر علی رامپوریؒ کے خاندان سے تھا۔ مولانا موصوف جید عالم اور رام پور کی قابل فخر ہستیوں میں سے تھے۔ حضرت سید احمد شہید کے خلیفۂ ارشد تھے۔ نواب رام پور سے کسی دینی معاملے میں اختلاف کی بنا پر وہاں کی سکونت ترک کر کے ٹونک چلے آئے۔ نواب وزیرالدّولہ نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور پہلے ریاست کا مدارالمہام اور پھر دیوان ریاست مقرر کیا۔ لیکن انہوں نے اپنے علمی مشاغل کو ترجیح دیتے ہوئے دو سال کام کرنے کے بعد دیوانی سے استعفیٰ دے دیا۔ اپنی

تعمیر کردہ مسجد میں (جس کا ذکر مضمون کی ابتدا میں کیا جا چکا ہے) تفسیر و حدیث کا درس دیتے تھے۔ مولانا عنایت رسول چڑیا کوٹی ان کے مایۂ ناز شاگرد تھے۔ مولانا حیدر علی نے ۱۲۷۳ھ میں ٹونک میں وفات پائی۔ گویا مولانا سید یعقوب ددہال اور ننہال دونوں جانب سے نجیب الطرفین تھے۔

سید یعقوب کی ولادت ۱۲۹۳ھ (مطابق ۱۸۷۴ء) میں ہوئی۔ پردادا کے نام پر سید محمد یعقوب نام رکھا گیا۔ تاریخی نام محمد اختر (۱۲۹۳) تھا۔ ٹونک میں عرفیت کا رواج عام تھا چنانچہ مولانا کی عرفیت اچھے میاں تھی۔ ابھی دو سال کے ہوں گے کہ والدہ وفات پا گئیں، اس لیے چند برس تک ننہال میں پرورش پاتے رہے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اپنے والد ماجد سے قرآن پاک حفظ کرنا شروع کیا۔ حافظ محمد یونس حفظ کے معاملے میں بڑے سخت بلکہ مغلوب الغضب واقع ہوئے تھے۔ متشابہ لگنے پر بجائے لقمہ دینے کے بڑے غصے کے ساتھ "ہوں، ہوں" کیا کرتے۔ ظاہر ہے کہ اس سے متشابہ ٹوٹنے سے رہا۔ بیٹے پر اور بھی زیادہ سختی تھی۔ ہمیشہ مہرِ پدر پر جورِ استاد غالب رہتا۔ خدا خدا کر کے پندرہ پارے حفظ ہوئے تھے کہ ایک روز مولانا کے چھوٹے چچا سید مصطفیٰ نے یہ تشدد دیکھ کر بھائی سے کہا کہ لڑکا مجھے دے دو اور آئندہ اسے ہاتھ نہ لگانا۔ سید مصطفیٰ، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، حدیث کے آدمی تھے۔ انہوں نے بھتیجے کو درسِ حدیث میں بٹھا لیا۔ بعد میں مولانا کہا کرتے تھے کہ اگر ہمارے چچا تھوڑا سا صبر کر لیتے تو ہمارا حفظ مکمل ہو جاتا۔ افسوس کہ ان کی شفقت کی وجہ سے میں حفظ سے محروم رہا۔

مولانا نے دو شادیاں کیں۔ زوجۂ اولیٰ سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ زوجۂ ثانیہ سے ایک فرزند سید عبید الرحمٰن ۱۸ رمضان ۱۳۲۲ھ (مطابق ۳۰ نومبر ۱۹۰۴ء) کو متولد ہوئے۔ مولانا کی آمدنی کا ذریعہ وہ جاگیر تھی جو نواب وزیر الدولہ نے ان کے بزرگوں کو دی تھی۔ بی بی ہاجرہ کی وفات کے بعد نواب موصوف نے ۱۱ شعبان ۱۲۷۹ھ کو جاری کردہ ایک سند کے ذریعہ اس جاگیر کی توثیق کر دی تھی۔ چونکہ اس خاندان میں ہمیشہ اولادِ نرینہ کی قلت رہی اس لیے یہ جاگیر تقسیم نہ ہونے پائی۔ مولانا کے علاتی بھائی سید محمد یوسف بھی لاولد تھے اس لیے جاگیر عملاً مولانا ہی کے تصرف میں رہی۔ جاگیری گاؤں سے چھ ماہ بعد فصل کی آمدنی ہوتی تھی جس میں سے حقدار خواتین کا حصہ رسدی نقد رقم کی صورت میں وہ ادا کر دیتے تھے۔

مولانا تہجد کے وقت بیدار ہوتے۔ نماز تہجد کے بعد اوراد و وظائف کا سلسلہ شروع ہو

جاتا جو نماز فجر تک جاری رہتا۔ فجر کی سنتیں ادا کرنے کے بعد کچھ دیر کے لیے لیٹ جاتے۔ فرماتے یہ سنت ہے۔ اس کے بعد فرض نماز پڑھتے۔ پھر چائے کی پیالی نوش کرتے اور کچھ لکھنے پڑھنے کا کام نمٹاتے۔ دس گیارہ بجے صبح کے کھانے سے فارغ ہوتے۔ یہ ٹونک کے دستور کے مطابق ناشتے اور دوپہر کے کھانے کا مجموعہ ہوتا تھا[11]۔ بعدازاں کسی سے ملاقات کے لیے یا کسی کام کی غرض سے نکل جاتے ورنہ مطالعے میں مصروف ہو جاتے۔ شام کا کھانا دن غروب ہونے سے قبل کھا لینے کے عادی تھے بہ شرطے کہ کوئی مجبوری لاحق نہ ہو۔ نماز عشاء کے بعد مولانا کے کچھ مخصوص احباب آ جاتے اور محفل جم جاتی۔ ان کے احباب بھی بڑے وضع دار تھے۔ ایک صاحب پرانے شہر سے طویل فاصلہ طے کر کے آیا کرتے تھے۔ گرمی ہو یا سردی، آندھی ہو یا طوفان، ان کا آنا قضا نہ ہوتا تھا۔ ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ دن بھر زوردار بارش ہوتی رہی۔ سڑکوں اور گلیوں میں الغاروں پانی بہہ رہا تھا۔ اس کے باوجود وقت مقررہ پر ان صاحب نے دروازے پر آویزاں آہنی حلقے سے دستک دی۔ دیکھا تو لنگوٹ کسے ایک گھڑا تھامے کھڑے ہیں۔ ڈیوڑھی میں آ کر جسم سے پانی سونتا، گھڑے میں سے کپڑے نکال کر پہنے اور گھر میں ملاقات کے لیے چلے آئے۔

اس خاندان کے ساتھ ایک عجیب اتفاق یہ تھا کہ خواتین مردوں سے قبل ہی وفات پا جاتی تھیں۔ مولانا کی والدہ کی طرح ان کی اہلیہ اور بہو بھی اپنے شوہروں سے ایک عرصہ پہلے سفر آخرت پر روانہ ہو گئیں۔ لہٰذا گھر میں خود مولانا، ان کے اکلوتے صاحب زادے اور دو نوعمر پوتے تھے[12]۔ کھانا پکانے کے لیے ایک 'بوا' کو ملازم رکھا ہوا تھا۔ کھانے میں بھی مولانا کی پسند و ناپسند ان کے مزاج کی آئینہ دار تھی۔ کم خوراک تھے لیکن نفیس کھانا پسند تھا۔ اگر کھانے میں پکانے والے کا قصور ہوتا تو اظہار ناراضگی کرتے مثلاً روٹی کچی یا جلی ہوئی ہو یا سبزی اچھی طرح صاف نہ کی گئی ہو۔ گوشت میں کسی سبزی وغیرہ کی شرکت کو شرک سمجھتے تھے۔ بڑیاں اور کھنڈلیاں سخت ناپسند تھیں۔ شاید اس لیے کہ ان میں سادگی سے ہٹ کر تصنع کا دخل ہوتا ہے۔ معدہ میں نفخ پیدا کرنے کے باعث بھنڈیوں اور سوداوی تاثیر کے سبب بینگن سے پرہیز کرتے تھے۔ ہر قسم کی مٹھائی بڑے شوق سے کھاتے اور کھاتے ہوئے اللہ کی کبریائی بیان کرتے۔ خانہ ساز ملائی کی برف بڑی رغبت سے کھاتے۔ پانی کے خرچ میں انتہائی محتاط تھے۔ فرمایا کرتے کہ قیامت کے

دن اس کا بھی حساب ہوگا۔

گھر میں عام طور پر ململ کی سفید ٹوپی پہنتے۔ باہر نکلتے ہوئے عموماً اور خطبے کے لیے التزاماً اسی ٹوپی پر ٹونک کے چھاپے کا عمامہ باندھ لیتے کیونکہ یہ حضورؐ کی سنت ہے۔ جمعہ کے دن خصوصاً اور ویسے بھی عموماً عصا لے کر چلتے۔ خطبہ پڑھتے وقت عصا کا سہارا لیتے کہ یہ بھی مسنون ہے۔ سر کے بال کانوں کی لَو تک تھے۔ جمعرات کے دن بالوں اور ڈاڑھی کو باقاعدہ مہندی لگاتے گویا جمعے کی تیاری ایک دن پہلے کر لی جاتی تھی۔ نماز جمعہ کے علاوہ باقی نمازیں محلہ قافلہ میں سیدوں کی مسجد میں پڑھتے تھے جو عرفان میاں کی مسجد کہلاتی تھی۔ یہاں ہمیشہ حافظ عبیداللہ البصیر کی اقتدا میں نماز ادا کرتے اور اصرار کے باوجود کبھی امامت نہیں کراتے تھے۔ حافظ عبیداللہ نابینا تھے اور بصیر تخلص کرتے تھے۔ تاریخ گوئی سے انہیں خاص شغف تھا۔ ہر اہم واقعہ بالخصوص اہم شخصیات کی وفات پر از خود قطعہ تاریخ یا ایک آدھ شعر موزوں کر دیتے تھے[13]۔ اس مسجد میں جمعہ کی خطابت اور امامت کے فرائض مولانا محمد یوسف کے ذمہ تھے اور اتفاق سے یہ بھی نابینا تھے[14]۔

ایام طفولیت میں والدہ کی وفات اور اس کے بعد چند سال ننہال میں گزارنے اور والد سے جدا رہنے کے باعث مولانا کے تحت الشعور میں کچھ احساس محرومی ضرور ہوگا لیکن انہوں نے اس کا مثبت اثر قبول کیا تھا یعنی خالق اور مخلوق دونوں سے پر خلوص محبت کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔ حفظ قرآن کے سلسلے میں والد کی سختی کا ان پر یہ ردعمل ہوا کہ اپنی اولاد پر بڑے شفیق تھے۔ جب فصل کے موقع پر زمین کی آمدنی وصول ہوتی تو نوعمر پوتوں کو معمول کے جیب خرچ کے علاوہ اچھی خاصی رقم دیتے۔ ایک بار عبید میاں نے چاہا کہ بچے یہ اضافی رقم ان کے پاس رکھوا دیں تاکہ فضول خرچی نہ کر پائیں تو مولانا مزاحم ہوئے اور بچوں کو پیسے اپنے پاس رکھنے کی تاکید کی۔ اس موقع پر عربی کا یہ شعر بھی پڑھا:

بنونا بنو ابنائنا و بناتنا　　　بنوھن ابناء الرجال الاباعد[15]

ہر دور کی مخصوص اقدار ہوتی ہیں۔ مرورِ ایام کے ساتھ یہ قدریں بدلتی رہتی ہیں اور نئے معاشروں کے لیے اجنبی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ہمارے دیکھنے کی بات ہے کہ خواتین اپنے شوہروں سے گھونگھٹ نکالا کرتی تھیں۔ باپ، بزرگوں کے سامنے اپنے بچوں کو نہ گود میں اٹھاتے نہ علانیہ پیار کرتے تھے۔ اسی قسم کا ایک دستور یہ تھا کہ جب فرزند جوان ہو جاتا تو والد کسی اشد ضرورت کے

بغیر اس سے براہ راست مخاطب نہ ہوتے تھے، نہ بیٹے باپ سے تخاطب کی جرأت کرتے۔ انجان آدمی سمجھتا کہ شاید ایک دوسرے سے ناراض ہیں لیکن اس کا اصل سبب ادھر سے انتہائی احترام اور ادھر سے محبت کا وفور ہوتا تھا۔ اب یہی دیکھ لیجیے کہ مولانا اوران کے صاحب زادے سید عبید الرحمٰن ایک ہی مکان میں رہتے تھے لیکن یونس میاں کا کہنا ہے کہ ہم دونوں بھائیوں نے کبھی ابا میاں (مولانا) اور باوا کو ایک دوسرے سے بات کرتے نہیں دیکھا۔ جو بات ہوتی ہماری وساطت سے ہوتی تھی۔ یوں ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ ابا میاں، باوا سے خفا ہیں۔

اتفاق سے ۱۹۴۷ء میں ٹونک میں ایک فرقہ وارانہ جھڑپ ہوگئی۔ چوبیس گھنٹے کے لیے کرفیو نافذ کردیا گیا۔ عبید میاں اپنی ملازمت کے سلسلے میں شہر سے باہر دورے پر گئے ہوئے تھے[۱۶]۔ اب مولانا کی بے قراری دیدنی تھی۔ بار بار بچوں سے تشویش کا اظہار کرتے کہ تمہارے باوا گھر کیسے آئیں گے۔ پوتے سمجھاتے کہ وہ کوئی بچہ تھوڑا ہی ہیں۔ انہیں کرفیو کی خبر مل گئی ہوگی، جہاں گئے ہیں وہیں رک جائیں گے۔ جب رات ہوئی تو مولانا کی بے چینی میں اضافہ ہوگیا۔ پوتوں نے تسلی دینا چاہی تو فرمایا: ''میاں، بات یہ ہے کہ تم بیٹے ہو اور ہم باپ ہیں۔'' غرض ساری رات اللہ اللہ کرتے گزاردی۔ اگلے دن جب سید عبید گھر پہنچے تو انہیں قرار آیا۔ لطف یہ ہے کہ بیٹے سے براہ راست گفتگو پھر بھی نہیں کی۔

مولانا بڑے صحیح العقیدہ مسلمان تھے۔ توحید وسنت سے سرِمو انحراف نہ کرتے تھے اور شرک وبدعت کا شائبہ بھی ان سے برداشت نہ ہوتا تھا۔ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ غیر محتاط لوگ دینی معاملات میں قرآن وحدیث سے استنباط وتمسک کرنے کے بجائے نامناسب اسناد اور غیر متعلق افراد کی فراہم کردہ روایات وبیانات کو دینی مسائل میں حجت قرار دے لیتے ہیں مثلاً کسی دینی مسئلے میں حافظ کا شعر یا سعدی کی گلستاں کا حوالہ پیش کردیا جاتا ہے۔ مولانا اس کے سخت خلاف تھے۔ یہی حال محافل میلاد کا تھا۔ میلاد کی محفلوں کا رواج غالباً تیرھویں صدی ہجری سے ہندوستان میں شروع ہوا اور حضور اکرمؐ کی ذات بابرکات سے گہری عقیدت کے باعث بڑی تیزی سے مقبول ہوتا گیا[۱۷]۔ ٹونک کی محافل میلاد تو اپنی نظیر آپ ہوتی تھیں۔ سرکاری سرپرستی میں ان کا سلسلہ ماہ ربیع الاوّل میں متواتر سات روز تک جاری رہتا تھا۔ نذرباغ پیلس کے احاطے میں بنے ہوئے محلات میں سے ایک خوبصورت عمارت اس کے لیے مخصوص تھی جو اسی مناسبت

سے میلا د کوٹھی کہلاتی تھی۔ اس کی آرائش وزیبائش دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ فرش فروش، جھاڑ فانوس کے علاوہ چاندی سے بنے ہوئے مصنوعی پودے تھے جن میں سونے کے پھل پھول لگے ہوئے تھے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سادات قافلہ جاگیریں رکھنے کے باوجود دربار میں حاضری اور نذر گزارنے سے مستثنیٰ تھے اور مولانا نے اپنے بزرگوں کی پیروی میں شاید نذر باغ کی حدود میں کبھی قدم بھی نہ رکھا تھا۔ ایک بار ان کے دونوں پوتوں نے ان سے محفل میلا د دیکھنے کی اجازت طلب کی۔ انہوں نے اجازت تو دے دی لیکن ساتھ ہی فرمایا: ''ایک بات کا خیال رہے کہ اسے دین کا جزو نہ سمجھ لینا۔'' اس تاکید میں بھی وہی نکتہ پنہاں تھا کہ دین کا انحصار قال اللہ وقال الرسولؐ یعنی قرآن وحدیث پر ہے اور میلا د کی محفلوں میں پڑھی جانے والی نظم ونثر بہرحال اللہ اور اس کے رسول کا کلام نہیں ہے لہٰذا نہ اس پر دین کی بنیاد استوار کی جاسکتی ہے نہ اسے دین کا جزو بنایا جاسکتا ہے۔

ابتدا میں ذکر ہوا تھا کہ میں نے بچپن میں مولانا کو کبھی عامۃ المسلمین کو اللہ تعالیٰ سے خوفزدہ کرتے نہ سنا حالانکہ اکثر علمائے دین اس معاملے میں بڑی سخت گیری سے کام لیتے ہیں۔ میں نے جب اپنے اس تجربے کا ذکر یونس میاں سے کیا تو انہوں نے اس کی تائید وتوثیق کرتے ہوئے ایک دلچسپ واقعہ سنایا۔ ایک بار مولانا اپنی ایک عزیزہ کے ہاں وعظ کے لیے تشریف لے گئے۔ وعظ کے اختتام پر حاضرین میں سے کسی نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ومغفرت کو موضوع بناتے ہیں۔ اس سے سامعین بے عملی کی طرف راغب ہو سکتے ہیں۔ مناسب یہ ہے کہ دوسرے پہلو کو بھی اہمیت دی جائے۔ مولانا نے جواب میں بنی اسرائیل کے ایک واعظ کا واقعہ بیان کیا کہ وہ مسلسل چالیس برس تک اپنے مواعظ میں اللہ تعالیٰ کے عفو وکرم کا ذکر اذکار کرتا رہا۔ ایک بار کسی مرد معقول کے مشورے پر اللہ کے قہر وغضب کو موضوع بنایا۔ اسی رات اس کو غیب سے ان الفاظ میں تنبیہ ہوئی: ''کیا میری رحمت کا ذخیرہ صرف چالیس برس کے بیان میں ختم ہو گیا؟'' اور مولانا بدستور اپنی وضع مستمرہ پر قائم رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ مخلوق کے دل خالق کے ساتھ جوڑنے کے لیے آئے تھے۔ توڑنے کے لیے نہیں:

تو برائے وصل کردن آمدی — نے برائے فصل کردن آمدی[۱۸]

ہمارے دینی حلقوں کی شدت پسندی اور تنگ دلی مشہور ہے۔ دوسروں کا تو ذکر ہی کیا خود مسلمانوں پر کفر کا فتویٰ لگانے میں انہیں ذرا عار محسوس نہیں ہوتی۔ مولانا اس معاملے میں بڑے وسیع القلب اور رقیق القلب تھے۔ اللہ سے ان کی محبت اس درجہ تک پہنچی ہوئی تھی کہ اگر کوئی غیر مسلم بھی مالک حقیقی کا نام لے لیتا تو مولانا کو اس کی مغفرت کا یقین ہو جاتا تھا۔

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنان مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محو ماہ کنعاں ہو گئیں

''پروفیسر سید طلحہ حسنی[۱۹] اورینٹل کالج لاہور کی ملازمت سے سبک دوش ہو کر لکھنؤ میں مقیم تھے۔ ان کا تعلق بھی سادات قافلہ سے تھا۔ ٹونک آتے تو زیادہ وقت علما کے ساتھ گزرتا جن میں مولانا بھی شامل تھے۔ دونوں میں بے تکلفی تھی۔ وہ مولانا کو ''بھیا جی'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ طلحہ میاں کے آنے پر مولانا کے ہاں زبان و ادب عربی اور علوم دینی سے مزاولت رکھنے والے اصحاب جمع ہو جاتے۔ سید طلحہ خوش خوراک بھی تھے اور مٹھائی کے شوقین بھی۔ ایک دن کہنے لگے: ''بھیا جی! جلیبا کھانا ہے۔'' حاضرین کی تعداد شاید بارہ تھی۔ اس پر مولانا نے سید طلحہ کی خاطر دو کا اضافہ کیا اور صبح صبح خود رام پال حلوائی کی دکان پر جلیبا لینے پہنچ گئے۔ وہ کڑھائی چڑھا کر آگ جلا رہا تھا۔ مولانا کو دیکھ کر بولا: ''سید میاں! کچھ دیر لگے گی۔'' مولانا نے انتظار کرنا چاہا تو وہ بولا: ''میاں! پاس ہی تو گھر ہے۔ تھوڑی دیر بعد آ جایئے گا۔ بات یہ ہے کہ میں ہر روز پہلے چار جلیبے مالک کے نام پر کتوں کو ڈالتا ہوں۔ اس کے بعد آپ کے جلیبے تیار کروں گا۔'' یہ سن کر مولانا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ الٹے پاؤں پھر آئے اور اسی رقت کے عالم میں فرمانے لگے: ''طلحہ میاں! رامپال حلوائی بھی جنتی ہے۔'' حاضرین یہ سن کر مسکرائے تو واقعہ بیان کرنے کے بعد صراحت کرتے ہوئے فرمایا: ''بھئی اس نے کسی بت کا نام نہیں لیا، مالک کا لفظ کہا۔ سو اب مالک تو اس کا بھی وہی ہے جو ہمارا آپ کا ہے۔ پھر اس کی مغفرت میں کیا شک ہے؟''

اس قسم کا ایک اور واقعہ بھی سن لیجیے۔ جامع مسجد محلہ قافلہ کے سامنے بنیوں کی دکانیں تھیں۔ ان کے عقب میں ایک کنواں تھا جو بنیوں کا کنواں کہلاتا تھا۔ ایک بار اس میں ایک بلی گر گئی۔ کنواں بہت گہرا تھا اور بلی کو نکالنے کے لیے کوئی باہمت اور تجربہ کار شخص ہی اس میں اتر سکتا تھا۔ چھوٹے

خاں نامی ایک مسلمان اترنے پر آمادہ ہوا۔ اتفاق سے مولانا ادھر سے گزر رہے تھے۔ کنویں پر لوگوں کا مجمع دیکھ کر رک گئے۔ جب چھوٹے خان نے اترنا شروع کیا تو خدا جانے دل میں بھی بسم اللہ پڑھی یا نہیں لیکن مادھولال بنیا تڑپ اٹھا۔ لپک کر کنویں کی مینڈھ پر پہنچ گیا اور اندر جھانک کر پکارنے لگا: ''چھوٹے خاں جی! مالک کا نام لو، چھوٹے خاں جی! مالک کا نام لو۔'' مادھولال کی یہ بے قراری دیکھ کر مولانا پر کیفیت طاری ہو گئی۔ آنکھیں بھر آئیں۔ اسی حالت میں گھر کو روانہ ہوئے۔ راستے میں کسی نے پوچھا: ''حضرت! خیر باشد۔'' جواب دیا: ''میاں! اللہ تعالیٰ مادھولال بنیے کو بھی بخشش دے گا کیونکہ اس کا بھی اللہ پر ایمان ہے۔'' بلاشبہ یہ للّٰہیت، یہ وسعت قلبی اور یہ انسان دوستی اگر معدوم نہیں تو الشاذ کالمعدوم کا حکم ضرور رکھتی ہے۔ مولانا ایک اور اصول پر سختی سے کاربند رہتے تھے۔ وہ یہ کہ گناہ سے نفرت کرو لیکن گناہ گار سے نہیں۔ اس کی ایک روشن مثال یہاں درج کی جاتی ہے۔

اس زمانے میں گلوکارہ کی ترکیب رائج نہیں ہوئی تھی اور گانے والیاں طوائفیں کہلاتی تھیں[1]۔ زیادہ تر خیال یا ٹھمری، دادرا اور غزل کا رواج تھا۔ تو ہوا یوں کہ ایک دن ایک نہ دو اکٹھی چار طوائفیں مولانا سے ملنے ان کے گھر آ گئیں اور دیر تک گفتگو کرتی رہیں۔ ان میں سے کسی کے نکاح کا معاملہ تھا۔ مولانا اس بارے میں متعلقہ احکام و مسائل انہیں بتاتے اور مشورہ دیتے رہے۔ وہ مولانا کے اخلاق سے اتنی متاثر ہوئیں کہ ان سے تعویذ کی فرمائش کر دی جو مولانا نے ان کی تالیف قلب کی خاطر بلا جھجک دے دیا۔ ادھر محلے میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ اہل محلّہ کے نزدیک سادات قافلہ کے گھر طوائفوں کا آنا قرب قیامت کی نشانی تھی۔ مولانا کے صاحب زادے دفتر گئے ہوئے تھے۔ عصر کے وقت واپس آئے تو محلے میں داخل ہوتے ہی لوگوں نے انہیں یہ ''افسوس ناک'' خبر سنائی۔ انہیں بھی صدمہ سا ہوا۔ گھر پہنچ کر بیٹوں سے پوچھا تو انہوں نے اس بات کی تصدیق کی۔ ان کے منہ سے نکلا: ''یہ تو بہت برا ہوا۔'' مولانا کی سماعت تک یہ فقرہ پہنچا تو پوتوں سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے: ''بیٹا! اپنے باوا کو بتا دو کہ جن لوگوں کو دین کے بارے میں کچھ پوچھنا ہو گا وہ تو یعقوب کے پاس آئیں گے اور ان میں طوائفیں بھی شامل ہیں۔ یعقوب کی تو یہ مجال نہیں کہ اللہ رسول کے احکام دریافت کرنے والوں کو اپنے دروازے سے دھتکار دے۔ اگر تمہارے باوا کو اس میں بے عزتی محسوس ہوتی ہے تو ہم اپنے رہنے کے لیے کوئی

کوٹھڑی کرائے پر لے لیں گے۔''

مولانا کی عالی نسبی، علم و فضل، زہد و تقویٰ اور مکارم اخلاق کی بنا پر شہر بھر میں ان کا بڑا احترام کیا جاتا تھا اور اچھے اچھے لوگ ان کی خدمت میں حاضری دینا باعث سعادت سمجھتے تھے۔ چنانچہ ہمارے دادا جان جیسے کم آمیز اور خمول پسند آدمی بھی کبھی کبھی مولانا سے شرف ملاقات حاصل کرنے جاتے تھے[۲۲]۔

سید یونس حسنی صاحب نے مولانا کے اپنے خط میں ایک قلم برداشتہ لیکن خوش خط تحریر کا عکس مجھے عنایت کیا ہے۔ اس کا عنوان ہے ''نسب نامۂ دعا گو'' اور اس پر انہوں نے آنحضرتؐ سے لے کر اپنے پوتوں تک کے اسماء پر مبنی شجرہ نسب درج کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا رسول اکرمؐ کی انتالیسویں پشت سے تعلق رکھتے تھے۔ کاغذ کی دوسری جانب بعض احادیث بزبان عربی مرقوم ہیں اور آخر میں ایک دعا ہے جس کا اردو ترجمہ یوں بنتا ہے: ''اے اللہ! میرے حق میں رسول اللہؐ کی شفاعت قبول فرما اور وہ زیادہ استحقاق رکھتے ہیں کہ ان کی سفارش قبول کی جائے اور ان کی بات مانی جائے کیونکہ وہ دنیا و آخرت میں سفارش کرنے والوں کے سردار ہیں۔'' اختتام پر یہ الفاظ درج ہیں: ''عریضۂ ادب۔ فدوی دعاگو سید محمد یعقوب، مورخہ ۱۰ ربیع الاول ۱۳۳۸ھ، ساکن ٹونک راج محلّہ قافلہ، مکان حضرت سید عبدالرحمٰن صاحب مرحوم۔''

مولانا کو سنہ ۱۹۳۰ء سے وجع القلب (انجائنا) کی شکایت ہوگئی تھی۔ ستائیس برس تک اس تکلیف میں مبتلا رہے لیکن کبھی صبر و رضا کا دامن ہاتھ سے نہ دیا۔ درد کی شدت کا یہ عالم ہوتا تھا کہ ماہیٔ بے آب کی مانند تڑپتے تھے لیکن مجال ہے حرف شکایت زبان پر آجائے۔ صرف ایک بار دورے کے اختتام پر اتنا کہا: ''میاں! اگر ہاتھی کو بھی ایسی تکلیف ہو تو شاید برداشت نہ کر سکے۔''

۱۹۵۰ء میں جب بیماری میں شدت پیدا ہوئی تو ٹونک کے معروف معالج ڈاکٹر ڈیسائی نے وعظ و تذکیر کی سخت ممانعت کر دی۔ یہ سن کر اشکبار آنکھوں کے ساتھ گھر آئے اور زندگی کے آخری برسوں میں انہیں اپنے پسندیدہ شغل سے محترز رہنا پڑا۔ شہر سے باہر آنا جانا ایک عرصے سے بند تھا اب بالکل ممنوع ٹھہرا۔ اسی صورت سے سات سال کا عرصہ گزرا۔ ماہ جولائی ۱۹۵۷ء کا آغاز ہوا تو سوائی مادھو پور[۲۳] سے مولانا کے ارادت مندوں کا ایک وفد آیا۔ وہاں ایک نئی مسجد تعمیر ہوئی تھی۔ وہ لوگ چاہتے تھے کہ مولانا جمعے کی نماز پڑھا کر مسجد کا افتتاح فرمائیں۔ مولانا نے بڑی معذرت کی

اور کہا کہ میں تو گزشتہ بیس برس سے کسی دوسرے شہر نہیں گیا لیکن ان لوگوں نے اتنا اصرار کیا کہ مولانا کو مانتے ہی بنی۔ ۱۳۷۶ھ کی عید الاضحیٰ، ۸ جولائی کو دوشنبے کے دن تھی۔ طے یہ پایا کہ اس کے بعد آنے والے جمعہ یعنی ۱۲ جولائی ۱۹۵۷ء کو مولانا مسجد کا افتتاح کریں گے۔ یوم موعود کو مولانا ان لوگوں کے ساتھ سوائی مادھوپور پہنچے۔ نماز جمعہ سے فارغ ہو کر مولانا کے عقیدت مندوں نے عرض کیا کہ آج آپ آرام فرمائیں۔ کل صبح آپ کو ٹونک چھوڑ آئیں گے۔ مولانا مان گئے لیکن کسی کے گھر قیام کرنے کے بجائے مسجد ہی میں قیام پر مصر ہوئے۔ میزبانوں کو ان کی بات ماننا پڑی۔ اسی رات مولانا نے اپنے رفیقِ اعلیٰ کے گھر میں کامل سکینت و اطمینان کے ساتھ داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ ملک الموت نے انہیں ان کے محبوب کا پیغامِ وصال ان قرآنی الفاظ میں پہنچایا ہوگا: "يا ايتها النفس المطمئنة ارجعي الىٰ ربك راضية مرضية"۔

اگلے دن اس نادرۂ روزگار شخصیت کا جسدِ خاکی ٹونک لایا گیا اور موتی باغ کے قبرستان میں ان کے بزرگوں کے پہلو میں لحد کے سپرد کر دیا گیا۔

حافظ عبید اللہ البصیر تو مولانا سے پہلے اللہ کو پیارے ہو چکے تھے تاہم یقین واثق ہے کہ مولانا کی متعدد تاریخ ہائے وفات کہی گئی ہوں گی، یہ دوسری بات ہے کہ مجھے ان میں سے کوئی دستیاب نہ ہو سکی۔ محض خانہ پری کی غرض سے ایک قطعۂ تاریخ وفات موزوں کر کے یہاں درج کیا جاتا ہے:

پیر یعقوب آں سیادت ہم سعادت انتساب — از وصالش سرزمین ٹونک شد بے ماہتاب
آں محبّ صادق ستار و رحمٰن و رحیم — روز و شب مشغول ذکر رب غفار و وہاب
قدسیاں استادہ صف در صف باستقبال اُو — باب رحمت وا شدہ از اذن عالی مستطاب

فکر کردم بہر تاریخش معاً ہاتف بگفت
بائے بسم اللہ افزودہ بگو "غفراں مآب"
ب = ۲ + ۱۳۷۴ = ۱۳۷۶ھ

حواشی

۱- یہ میرے والد سے عمر میں چند سال بڑے تھے۔ ۵ اپریل ۱۹۸۰ء کو کراچی میں وفات پائی۔

۲- سید منظور الحسن برکاتی صاحب، استاد دار العلوم خلیلیہ، مغتنمات روزگار میں سے تھے اور ٹونک کے ماضی پر انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتے تھے۔ (وفات ۲۰۰۲ء)

۳- یونس میاں سے ان کی مراد ڈاکٹر سید محمد یونس حسنی صاحب تھے۔ ان سے میری ۱۹۶۲ء سے خط کتابت تھی، جب وہ وکرم یونیورسٹی اجین میں والد مرحوم اختر شیرانی پر پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔ بعد میں وہ پاکستان چلے آئے۔ کراچی یونیورسٹی سے صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے ریٹائر ہو کر ان دنوں اردو ڈکشنری بورڈ کراچی میں چیف ایڈیٹر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

۴- ''مکاتیب حافظ محمود شیرانی'' کی ترتیب کے سلسلے میں سید حسن مجتبیٰ صاحب پر حاشیہ دینے کی غرض سے مجھے اس شجرے کی ضرورت تھی۔ سید عامر حسنی، سید حسن مجتبیٰ کے فرزند اور اس معاملے میں بڑے باخبر شخص تھے۔ ان کا انتقال سنہ ۱۹۹۲ء میں کراچی میں ہوا۔

۵- محل اوّل اور ان کی صاحب زادی بی بی سارہ کے جاگیری گاؤں کا نام نانیر اور محل دوم اور ان کی صاحب زادی بی بی ہاجرہ کے گاؤں کا نام موٹوکہ تھا۔

۶- سیدہ ہاجرہ کی ولادت ۱۲۴۶ھ میں علاقہ سرحد میں ہوئی تھی۔

۷- مولانا فیض الحسن سہارنپوری (۱۸۱۶ء-۱۸۸۷ء) نامور فاضل تھے۔ مفتی صدرالدین آزردہ، شاہ احمد سعید مجددی اور مولانا فضل حق خیر آبادی جیسے نابغۂ روزگار اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ شاعری میں مولوی امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے۔ بیعت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے کی تھی۔ ۱۸۷۰ء سے ۱۸۸۷ء تک اورینٹل کالج لاہور میں عربی کے استاد رہے۔ ان کے شاگردوں میں مولانا شبلی نعمانی اور مفتی عبداللہ ٹونکی کے نام نمایاں ہیں۔

۸- ''نزھۃ الخواطر'' جلد ہشتم، ترجمہ نمبر ۵۰۶: السید مصطفیٰ بن یوسف الطوکی۔

۹- بی بی رقیہ، سید عظمت اللہ بن سید ابو احمد کی صاحب زادی تھیں۔ ۱۲۷۶ھ میں جدہ میں پیدا ہوئیں اور ۲۲ صفر ۱۲۹۵ھ کو ٹونک میں وفات پائی۔

۱۰- مولانا حیدر علی کے تعارف کے لیے دیکھیے 'نزھۃ الخواطر'' جلد ہفتم، بذیل نمبر ۲۷۵: مولانا حیدر علی الطوکی۔

۱۱- یہ دستور ٹونک میں رائج اور بہت سی باتوں کی طرح صوبہ سرحد سے آیا تھا۔

۱۲- بڑے سید محمد عرفان (ولادت ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۴ء) ایم ایس سی کے بعد محکمہ معدنیات حکومت ہند میں ملازم ہو گئے تھے۔ ۲۹ جنوری ۱۹۷۴ء کو والد کی زندگی ہی میں وفات پائی۔ ان کا خاندان بدستور ٹونک میں مقیم ہے۔ دو صاحب زادوں کے نام سید محمد عمران اور سید محمد عدنان ہیں۔ ایک لڑکی فضہ ہے۔ چھوٹے ڈاکٹر سید محمد یونس ہیں جن کا مختصر تعارف اوپر درج ہو چکا ہے۔ ان کی تاریخ ولادت ۳ ستمبر ۱۹۳۷ء ہے۔ ان کی تین صاحب زادیاں ہیں۔ مہذبہ حسنی، لبینہ حسنی اور رباب حسنی۔

۱۳- انہوں نے حافظ محمود شیرانی کی تاریخ وفات میں یہ شعر کہا تھا:

بر لب باناس در وادی اقامت گاہ کرد
تابارد ابر رحمت بر مقام بے کسی

ترجمہ- (انہوں نے دریاے) بناس کے کنارے، وادی میں قیام کیا تاکہ اس بے کسی کے مقام پر ابر رحمت برسا کرے۔

پہلے مصرع سے سنہ ۱۳۶۵ ہجری اور دوسرے سے ۱۹۴۶ء برآمد ہوتا ہے۔

۱۴- مولانا یوسف مچھلی کے کانٹے، ڈور اور جال وغیرہ فروخت کر کے قوت لایموت حاصل کرتے تھے۔ امامت یا خطابت کا معاوضہ کبھی نہیں لیا۔ ان کا خطبہ بھی بڑا دلآویز اور دل گداز ہوتا تھا اور وقت کا احساس انہیں وہبی تھا۔ کبھی خطبہ قبل از وقت یا تاخیر سے ختم نہیں کیا۔

۱۵- ''ہمارے بیٹے وہ ہیں جو ہمارے بیٹوں کے بیٹے ہیں۔ رہے ہماری بیٹیوں کے بیٹے، سو وہ تو غیروں کی اولاد ہیں۔''

۱۶- ان دنوں سید عبیدالرحمٰن ڈسٹرکٹ راشننگ آفیسر تھے۔

۱۷- نعت تو جناب رسالت مآبؐ کے دور ہی سے کہی جانے لگی تھی لیکن اسے ایک مخصوص انداز میں اجتماعی طور پر ترنم سے پڑھنے کا دستور نہ تھا۔ ہندوؤں کے ہاں رام اور کرشن کے بھجن مندروں میں گائے جاتے تھے۔ غالباً اس سے متاثر ہو کر ہندی مسلمانوں نے نعت کو میلاد کی شکل دی۔ اسی طرح کی ایک مثال ہمارے تعزیوں کے جلوس ہیں جن کا برِعظیم سے باہر حتیٰ کہ ایران میں بھی کوئی وجود نہیں۔ یہ دراصل دسہرے کے جلوس کی نقل ہیں۔

۱۸- ''تجھے مخلوق (کے دلوں) کو ہم سے جوڑنے کی خاطر بھیجا گیا ہے، انہیں ہم سے دور کرنے کو نہیں۔'' (اللہ جل شانہٗ کا حضرت موسیٰؑ سے خطاب)

۱۹- پروفیسر سید محمد طلحہ حسنی (ولادت ٹونک ۱۸۹۰ء، وفات کراچی ۱۹۷۰ء) کوئی ربع صدی تک اورینٹل کالج لاہور میں عربی کے استاد رہنے کے بعد ۱۹۴۲ء میں خود اپنی خواہش پر سبکدوش ہو گئے تھے۔

۲۰- جلیبا اسم بامسمیٰ ہوتا تھا یعنی پوری کڑھائی کے سائز کی ایک بڑی سی جلیبی۔

۲۱- یہ طائفے دوسرے شہروں سے ٹونک آتے رہتے تھے۔ امرا اور رؤسا کے ہاں محفلیں جمتیں جہاں یہ اپنے فن کا مظاہرہ کرتے۔

۲۲- یونس میاں نے ایسی ہی ایک ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ ہم تو نوعمری کے باعث حافظ صاحب کے علمی مرتبے سے واقف نہ تھے بس اتنا معلوم تھا کہ یہ اختر

شیرانی کے والد ہیں۔

۲۳- راجپوتانہ کے معروف قلعہ رنتھمبور کے نزدیک ایک بڑا قصبہ اور اہم ریلوے جنکشن ہے۔ سابق ریاست جے پور میں شامل تھا اور وہاں کے راجہ سوائی مادھوسنگھ کے نام پر اس کا نام رکھا گیا تھا۔ ٹونک سے اس کا فاصلہ سڑک کے راستے کوئی پچاس میل ہوگا۔

۲۴- (۱) ''بزرگی اور خوش نصیبی سے نسبت رکھنے والے سیّد یعقوب کی وفات سے ٹونک کی سرزمین (گویا) چاندنی سے محروم ہوگئی۔

(۲) وہ ستار و رحمٰن و رحیم کے سچے پرستار تھے اور دن رات اپنے پروردگار کی بخشش اور مغفرت کے ذکر اذکار میں منہمک رہتے تھے۔

(۳) ان (کی روح) کے استقبال کے لیے فرشتے پرے باندھے کھڑے تھے اور اللہ تعالیٰ کے خوشنوی پر مبنی فرمان کے مطابق (ان پر) رحمت کا دروازہ کھول دیا گیا تھا۔

(۴) میں نے تاریخ وفات کی فکر کی تو فی الفور فرشتۂ غیب بولا کہ بسم اللہ کی 'ب' بڑھا کر 'غفران مآب' کہہ دو۔''

جامع علم واخلاق

پروفیسر حمید احمد خاں (۱۹۰۳ء-۱۹۷۴ء)

۱۹۵۲ء میں جب میٹرک پاس کرنے کے بعد میں اسلامیہ کالج میں داخل ہوا تو پروفیسر حمید احمد خاں صاحب انگریزی زبان وادب کے مطالعہ کی غرض سے کیمبرج جا چکے تھے۔ تاہم کالج کے ایوانوں اور راہداریوں میں ان کی شخصیت کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ پرانے طالب علم بڑی محبت سے ان کا نام لیتے اور جہاں کہیں ان کے اخلاق کا تذکرہ چھڑتا تو ختم ہونے میں نہ آتا۔ یہ باتیں سن سن کر دل سے بے اختیار دعا نکلتی کہ الٰہی! ایسے لائق اور ہردلعزیز استاد سے ہمیں بھی استفادے کا موقع عطا کر۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے، کے مصداق یہ دعائیں بارگاہ خداوندی میں قبول ہوئیں۔ ۱۹۵۴ء میں جب لاہور کا میڈیکل سکول بہاولپور منتقل ہوا تو اس کی خالی کی ہوئی سابقہ ڈی اے وی کالج کی عمارت، اسلامیہ کالج کو دے دی گئی اور ڈگری کلاسز سول لائنز کیمپس میں ہونے لگیں (مستقل بنیادوں پر اسلامیہ کالج سول لائنز کا قیام بعد کی بات ہے)۔ انہی دنوں پروفیسر حمید احمد خاں کیمبرج سے ایم لٹ کی ڈگری لے کر واپس آئے اور صدر شعبۂ انگریزی مقرر ہوئے۔ اس وقت اسلامیہ کالج میں کئی نامور اساتذہ موجود تھے۔ نفسیات اور فلسفے میں ڈاکٹر سعید اللہ اور خواجہ غلام صادق، معاشیات میں خواجہ محمد اسلم، فارسی میں پروفیسر علم الدین سالک اور تاریخ میں ڈاکٹر ظفر الاسلام۔ انگریزی نثر ہمیں پروفیسر ایس ایم یامین اور محمد حیات قریشی پڑھاتے تھے۔ کچھ عرصے ڈاکٹر محمد صادق نے بھی پڑھایا لیکن وہ جلد ہی دیال سنگھ کالج

چلے گئے۔ ڈرامہ، کولمبو پلان کے تحت آئے ہوئے ایک نوجوان امریکن ولیم ولیفرڈ پڑھایا کرتے تھے جن کی ناک میں بولی جانے والی انگریزی سے سبھی طلبہ نالاں تھے۔ انگریزی نظم کی تدریس حمید احمد خاں صاحب کو تفویض ہوئی تو جیسے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ کیا کثیر المطالعہ، وسیع الذہن، سلیم الطبع اور صحیح المذاق انسان تھے۔ ایسے مثالی استاد قسمت والوں کو نصیب ہوتے ہیں۔ لباس میں سادگی اور نظافت، چال ڈھال میں وقار اور متانت اور گفتگو میں سنجیدگی اور لطافت۔ یہ شعر جیسے انہی کے لیے کہا گیا ہو:

نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز

پیریڈ شروع ہوتے ہی خاں صاحب نپے تُلے قدموں سے کلاس میں آتے، حاضری لگاتے اور بغیر کوئی وقت ضائع کیے پڑھانا شروع کر دیتے۔ انگریزی نظم کا ایک ٹکڑا پڑھا، اس کا پس منظر بیان کیا، اس سے متعلقہ دور اور معاشرے کے خدوخال واضح کیے اور اس میں پیش کردہ مضمون کی صراحت کی۔ اس ضمن میں یونانی اساطیر، ہندو اساطیر، اسلامی، ایرانی اور مغربی روایات و رسوم، غرض کون سا پہلو تھا جو زیرِ بحث نہ آتا ہو۔ بیچ بیچ میں قرآن و حدیث کے معارف، انبیا اور فلسفیوں کے افکار نیز فارسی، اردو اور پنجابی شاعری سے مثالیں۔ موضوع زیرِ بحث کے مالہ و ماعلیہ پر اس طرح روشنی ڈالتے کہ کوئی گوشہ نظر انداز نہ ہونے پاتا اور اس طرح ڈوب کر پڑھاتے کہ کوئی گنجلک باقی نہ رہتی۔ از دل خیزد و بر دل ریزد کا معاملہ ہوتا۔ انگریزی الفاظ کے صحت و سُقم اور تلفظ کے بارے میں بڑے نکتے بیان کرتے تھے۔ ایک دن فرمایا کہ ہمارے ہاں لیکچرار کی ملازمت کو لیکچرر شپ کہا جاتا ہے جو درست نہیں۔ صحیح لفظ لیکچر شپ ہے۔ اگر پروفیسر شپ کو پیش نظر رکھیں تو لیکچرر شپ ہونا چاہیے لیکن یہ فیصلہ کرنے کا اختیار ہمیں نہیں ہے، انگریزوں کو ہے جن کی یہ زبان ہے اور سچ پوچھیے تو کوئی بھی زبان ہو اس کے الفاظ صحیح یا غلط ہونے کا حکم کسی قاعدے قانون یا قواعد کا محتاج نہیں، محاورے اور روزمرہ کے قبضے میں ہے۔ اسی لیے حضرت داغ دہلوی نے کہا تھا کہ ہمارے لیے اردو زبان کا معیار سید احمد دہلوی کی فرہنگ آصفیہ نہیں، جامع مسجد دہلی کی سیڑھیاں ہیں۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ انگریزی میں جہاں ''th'' آتا ہے،ہم اس کا تلفظ ''تھ'' یا ''دال'' سے کرتے ہیں حالانکہ اس کا صحیح تلفظ عربی کے حرف ''ث'' کے مماثل ہے چنانچہ ایلیز بیتھ غلط اور ایلیزبیث درست ہے۔اسی طرح ''the'' کا لفظ ''دا'' نہیں ''ثا'' ہے۔یہی سبب ہے کہ ''عثمان'' کو انگریزی میں "Othman" لکھا جاتا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے اسلامیہ کالج، لاہور، انجمن حمایت اسلام کا ذیلی ادارہ تھا۔ یہ انجمن انگریزی دورِ حکومت میں اسلامی اقدار کے تحفظ اور مسلمانوں کی تعلیم وتدریس کی غرض سے قائم کی گئی تھی اور اس کے اخراجات کا تمام تر انحصار عامتہ المسلمین کے چندوں اور اہل خیر کی مالی اعانت پر تھا۔اس مقصد کے حصول کی خاطر ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ موسم گرما کی تعطیلات سے قبل کالج کے طلبہ کو ایک ایک رسید بک جاری کر دی جاتی تھی جس میں دس دس روپے چندے کی ایک مقررہ تعداد میں رسیدیں ہوتی تھیں۔توقع یہ کی جاتی تھی کہ طلبہ انجمن کے لیے چھٹیوں کے دوران میں حسبِ توفیق چندہ جمع کر کے لائیں۔ ایسے ہی ایک موقع پر بعض طلبہ نے اس طریق کار پر ناک بھوں چڑھائی۔ کسی نے طلبہ کا یہ ردعمل خاں صاحب تک پہنچا دیا چنانچہ انہوں نے خلافِ معمول ایک پورا پیریڈ اس موضوع پر صرف کیا۔ اللہ اللہ! کیا عالمانہ اور مدلل گفتگو تھی جس کی اساس علم، عسرت اور عاجزی کی مثلث پر استوار کی گئی تھی۔علم اور عسرت کا لازم وملزوم ہونا،علم اور عاجزی کا چولی دامن کا ساتھ نیز علم کے فروغ اور عاجزی کے اظہار کی خاطر خیرات، دان، دکشنا اور چندوں کا التزام۔اس ضمن میں ہندو سادھوؤں سنتوں کا طریق کار، بدھ مذہب میں بھکشوؤں کا ادارہ، مسلمانوں کے دینی مدارس میں گھر گھر سے طالب علموں کے لیے کھانا جمع کرنے کا پرانا دستور،غرض بہت کچھ زیرِ بحث آیا۔ خاں صاحب نے یہ انکشاف بھی کیا کہ اس بارۂ خاص میں یورپ، ایشیا سے مختلف نہیں ہے چنانچہ آج ہم ڈگری کے حصول کے وقت مغرب کے دستور کے مطابق گاؤن کے ساتھ جو ہڈ (hood) بڑے فخر سے گلے میں ڈالتے ہیں، دراصل علامت ہے اس بھیک مانگنے کی جھولی کی جو صدیوں یورپ کے علمی حلقوں میں رائج رہی۔ کاش اس وقت ٹیپ ریکارڈر ہوتا اور یہ خیال افروز گفتگو محفوظ کر لی جاتی۔ یوں تو خاں صاحب کی کلاس میں طلبہ نہایت مؤدّب اور محتاط ہو کر بیٹھتے تھے اور مکمل خاموشی طاری ہوتی تھی لیکن اس روز تو سب نے گردنیں ڈال رکھی تھیں۔

تدریس میں خاں صاحب کی وضع داری کا یہ عالم تھا کہ ہم نے دو سال تک ان سے پڑھا لیکن مجال ہے کہ ان کی عادات مستمرہ میں ذرہ برابر فرق پڑا ہو۔ پہلے دن جو انداز تھا آخری دن تک قائم رہا۔ اس تمام عرصے میں معمول سے ہٹ کر صرف دو تین واقعات مجھے یاد ہیں۔ ایک روز الیگزینڈر پوپ کی مزاحیہ نظم ''The Rape of the Lock'' پڑھا رہے تھے۔ ان کی قریب کی نظر کمزور اور دور کی ٹھیک تھی چنانچہ بائیں ہاتھ میں کھلی ہوئی کتاب اور دائیں ہاتھ میں موٹی کمانیوں کی عینک ہوتی۔ چند لمحوں کے لیے عینک لگا کر کتاب پر نظر ڈالتے اور پھر طلبہ سے مخاطب ہوتے ہوئے عینک اتار لیتے۔ اس خطاب کے دوران عینک والا ہاتھ بڑی خفیف اور متناسب تصریحی حرکات کرتا رہتا۔ جب کبھی کسی بات پر غور کرتے تو ذرا کی ذرا عینک کی کمانی کا سرا دانتوں میں دبا لیتے۔ ان کا یہ انداز مجھے بہت بھاتا تھا۔ متذکرہ بالا نظم میں جب حضرت عاشق اپنی محبوبہ کی زلفوں سے ایک لٹ کاٹ کر رفو چکر ہوئے اور ان کے حامیوں اور فریق مخالف میں جنگ مغلوبہ شروع ہوئی، جس کے ہتھیاروں میں کھانے کی میز پر موجود کانٹے، چھریاں اور چمچے تھے، تو ایک صراحتی اشارہ کرتے ہوئے خاں صاحب نے دائیں ہاتھ کو تیزی سے حرکت دی، اتفاق سے عینک ان کے ہاتھ سے چھوٹی اور گر کے ٹوٹ گئی۔ خاں صاحب ذرا ٹھٹکے اور پھر یہ الفاظ کہے جو مجھے آج بھی یاد ہیں:

''دراصل شعروادب پڑھاتے ہوئے استاد کو اداکار بننا پڑتا ہے، بصورت دیگر طلبہ پیش نظر سطور کی روح تک نہیں پہنچ سکتے۔''

دوسرا واقعہ افسوسناک تھا۔ ایک دن پیریڈ ختم ہونے میں دس منٹ باقی تھے اور خاں صاحب کا لیکچر اپنے عروج پر تھا۔ ایک نامعقول طالب علم نے وقت دیکھنے کی خاطر اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ خاں صاحب نے اس کی یہ حرکت دیکھ لی۔ انہوں نے بغیر ایک لفظ کہے کتاب بند کی، رجسٹر تھاما اور کمرے سے نکل گئے۔ پوری کلاس اس لڑکے کے پیچھے پڑ گئی۔ اسے بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور شرمندگی کے باعث وہ چند روز کلاس میں نہیں آیا۔ بعدازاں اس نے خاں صاحب سے معذرت طلبی کی۔

تیسرے واقعے کا تعلق میرے جذبات سے ہے۔ خاں صاحب کی کلاس اس کمرے میں ہوتی تھی جو اسلامیہ کالج (سول لائنز) کے دو میں سے مشرقی جانب واقع گیٹ میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ والے بلاک کے کونے پر ہے۔ موسم سرما کی ایک صبح کو جب وہ کلاس پڑھا رہے

تھے تو روشن دان میں سے آنے والی دھوپ ان کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ پڑھاتے ہوئے کبھی آنکھوں پر ہاتھ سے اوٹ کرتے اور کبھی سر کو دائیں بائیں جنبش دیتے۔ میرا کیسا کیسا جی چاہا کہ چپکے سے نکلوں اور سیڑھیاں چڑھ کر روشن دان پر اپنا کوٹ اتار کر ڈال آؤں۔ اس میں قباحت یہ تھی کہ میرا کلاس سے اٹھ کر جانا اور پھر واپس آنا بھی بے ادبی کے ذیل میں آتا تھا۔ یوں بھی میں ایک خاموش اور شرمیلا طالب علم تھا لہٰذا یہ جرأت نہ کر سکا لیکن اس کی کسک آج بھی دل میں محسوس کرتا ہوں۔

پروفیسر حمید احمد خاں جیسے مہذب اور بااخلاق انسان چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔ ایک روز ہم چند دوست خالی پیریڈ میں چمن میں رکھے ہوئے سیمنٹ کے بنچ پر بیٹھے تھے۔ ذرا فاصلے پر کالج کا نوٹس بورڈ تھا۔ دو طالب علم نوٹس بورڈ پر نظریں جمائے کھڑے تھے اور آپس میں چہلیں کر رہے تھے۔ خاں صاحب اپنے کمرے سے نکل کر کوئی نوٹس دیکھنے آئے اور خاموشی سے ان دونوں لڑکوں کے پیچھے منتظر کھڑے ہو گئے۔ ہم لوگوں نے اشاروں سے دونوں کو متنبہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ باتوں میں ایسے مگن تھے کہ مطلق توجہ نہ کی۔ آخر کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد خاں صاحب نے اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے بڑی ملائمت سے کہا: ''جی، میں بھی نوٹس دیکھنے ہی آیا تھا۔'' اس پر وہ چونکے اور شرمندہ ہو کر فوراً آگے سے ہٹ گئے۔

پروفیسر حمید احمد خاں بڑے بااصول اور قانون کی پاسداری کرنے والے شخص تھے۔ اسلامیہ کالج ایک قومی ادارہ تھا اور اس کے طلبہ مختلف ملی تحریکوں اور بالخصوص تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لینے کے باعث نظم وضبط کے معاملے میں خاصے بدنام تھے۔ (کرنل) شیخ محمد اسلم پرنسپل ہوئے تو انہوں نے اس پہلو کی اصلاح پر خاص توجہ دی۔

خاں صاحب وائس پرنسپل تھے۔ اصول وقواعد کی پابندی کا سبق انہوں نے سکھایا۔ کوئی طالب علم کسی خلاف قاعدہ کام کی درخواست لے کر آتا تو صاف انکار کر دیتے۔ اگر درخواست گزار اصرار کرتا اور کہتا کہ آپ تو وائس پرنسپل ہیں، اگر چاہیں تو یہ گزارش منظور کر سکتے ہیں تو وہ جواب میں ایک مخصوص فقرہ کہتے:

"I am not a vice principal rather I am a vicious principal."

غرض ان سے کوئی بے قاعدہ کام لینا پتھر میں جونک لگانے کے مترادف تھا۔ ادھر ہمارے

معاشرے میں تو قانون کی خلاف ورزی بڑے فخر کی بات سمجھی جاتی ہے بلکہ اسے سماجی حیثیت ناپنے کا پیمانہ بنالیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ خاں صاحب کی اصول پسندی سے بعض لوگوں کو شکایت ہوتی تھی لیکن ضمیر کے خلاف کام کرنا انہوں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ بعد میں جب وہ اسلامیہ کالج (سول لائنز) کے پرنسپل ہو گئے تو بھی ان کے قدم متزلزل نہیں ہوئے۔

۱۹۶۰ء کا ایک واقعہ یاد آتا ہے جو ہمیں ڈاکٹر سید عبداللہ، پرنسپل اورینٹل کالج نے شکوہ کے رنگ میں سنایا تھا۔ ہوا یوں کہ سید صاحب کا ایک شناسا اپنے لڑکے کو اسلامیہ کالج میں داخل کروانے گیا۔ داخلے کے لیے درخواستوں کی تاریخ گزر چکی تھی۔ وہ شخص خاں صاحب سے ملا اور منت سماجت کی لیکن بے سود۔ اس شخص کو سید صاحب اور خاں صاحب کے باہمی مراسم کا علم تھا، چنانچہ وہ سید صاحب سے سفارشی رقعہ لے کر دوبارہ جا دھمکا اور بڑے پرامید انداز میں رقعہ پیش کیا۔ خاں صاحب نے رقعہ پڑھا اور اس شخص سے یوں مخاطب ہوئے: ''یہ رقعہ سید عبداللہ کا ہے نا؟'' اس نے خوش ہو کر اثبات میں جواب دیا تو خاں صاحب نے دوٹوک انداز میں کہا: ''اگر اللہ میاں کا رقعہ لے آؤ گے تب بھی داخلہ فارم جمع نہیں ہوسکتا۔'' وہ سائل اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔ دراصل خاں صاحب کا اشارہ امر محال کی طرف تھا جیسے کہتے ہیں کہ اگر آسمان سے تارے بھی توڑ لاؤ گے تو یہ کام نہیں ہونے کا (''عبداللہ'' اور ''اللہ'' کا تقابل قابل لحاظ ہے)۔ اگر خاں صاحب چنیں چناں سے کام لیتے تو وہ شخص کسی اور کا رقعہ لے کر آتا۔ اسے یہ سبق دینا مقصود تھا کہ اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع نہ کرو:

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی
حُدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

اس زمانے تک پاکستان کی ہیئت مقتدرہ پر انگریزوں کی خدمت گزار افسر شاہی اور فرماں بردار جاگیردار طبقہ پوری طرح متصرف نہ ہوئے تھے، اس لیے اہل علم سے بھی رموز مملکت میں مدد لے لی جاتی تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر عمر حیات ملک (سابق پرنسپل اسلامیہ کالج) سفیر بنا کر بھیجے گئے اور احمد شاہ بخاری (سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج) اقوام متحدہ میں تعینات کیے گئے تھے۔ حمید احمد خاں صاحب کا مزاج علمی، ادبی اور تدریسی تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر انہیں اس قسم کی کوئی مستقل

ملازمت پیش کی جاتی تو وہ ہرگز قبول نہ کرتے۔ البتہ انہیں بعض عارضی ذمہ داریاں سونپی گئیں مثلاً ۱۹۶۰ء میں یونیسکو فیلو کی حیثیت سے امریکہ اور بعض مغربی ممالک کی یونیورسٹیوں کا دورہ، ۱۹۶۳ء میں کوالالمپور کی ایشین امریکن اسمبلی میں شرکت، ۱۹۶۴ء میں جکارتا میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی اور ۱۹۶۵ء کی بنڈونگ کانفرنس میں پاکستانی وفد کی قیادت۔

۲۳ مارچ ۱۹۶۲ء کو حکومت کی طرف سے خاں صاحب کو ستارۂ امتیاز دیا گیا۔ میں ان دنوں مظفر گڑھ کالج میں تھا۔ یہ خبر پڑھ کر رہ نہ سکا اور اپنی عادت کے برخلاف، جرأت کر کے خاں صاحب کو مبارکباد کا خط لکھا۔ میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب ایک ہفتے بعد اسلامیہ کالج، سول لائن کے پیڈ پر تحریر کردہ ان کا جواب موصول ہوا۔ لکھا تھا:

''۳۰ مارچ ۱۹۶۲ء

عزیزی مظہر محمود صاحب سلمہ

السلام علیکم۔ میں ۲۳ مارچ کو بنگالی اکیڈمی کی دعوت پر ایک مجلس مذاکرہ میں شرکت کے لیے ڈھاکہ چلا گیا تھا۔ وہاں سے واپسی پر آپ کا خط ملا۔ اس پرخلوص مبارکباد کے لیے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ خدا آپ کو خوش وخرم رکھے۔

فقط والدعا حمید احمد خاں''

آگے چل کر ۱۹۶۸ء میں خاں صاحب کو ''ستارۂ پاکستان'' ملا۔ سچ پوچھیے تو ان اعترافات سے خاں صاحب کی عظمت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا بلکہ ان خطابات ہی کی وقعت بڑھی۔

پروفیسر حمید احمد خاں کا شمار پاکستان میں چوٹی کے انگریزی دانوں میں ہوتا تھا تاہم ان کا عشق اردو زبان سے تھا۔ جیسی شستہ اردو بولتے تھے ویسی ہی نستعلیق زبان لکھتے بھی تھے۔ کمال یہ تھا کہ بغیر کسی اشد ضرورت کے اردو میں انگریزی کا کوئی لفظ دخیل نہ ہو پاتا تھا۔ گفتگو میں اگر مجبوراً کوئی انگریزی لفظ یا اصطلاح استعمال کرتے تو اکثر صراحت کر دیتے کہ انگریزی میں اس کے لیے فلاں لفظ رائج ہے۔ وہ ہمیشہ اردو زبان کی ترقی واشاعت کے لیے کوشاں رہے۔ اسلامیہ کالج میں انجمن فروغ اردو کا قیام انہی کی منشا سے ہوا تھا۔ جب جامعہ پنجاب کے وائس چانسلر بنے تو وہاں بھی اس مقصد کی خاطر متعدد منصوبے بنائے۔ ان میں تاریخ ادبیات مسلمانان پاک وہند کی

تالیف، مجلس یادگار غالب کا قیام اور غالب کی صد سالہ تقریبات کی مناسبت سے کتابوں کی اشاعت نیز تدریس اور امتحانات میں اردو کو ذریعہ اظہار بنانے کی اجازت کا تذکرہ سرفہرست کیا جاسکتا ہے۔ ایسے اقدام افسر شاہی کو کہاں ہضم ہوتے۔ پھر سونے پہ سہاگہ ان کی اصول پسندی۔ چنانچہ اعلیٰ سطح پر خاں صاحب کے خلاف اظہارِ ناپسندیدگی کیا جانے لگا اور ان کے کام میں روڑے اٹکائے جانے لگے۔ اس صورتحال کے پیش نظر انہوں نے کمال بے نیازی سے کام لیتے ہوئے فروری ۱۹۶۹ء میں وائس چانسلر کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ مستعفی ہونے کے چند ماہ بعد وہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ایڈیشنل ڈائریکٹر مقرر ہوئے اور آئندہ سال سید امتیاز علی تاج کی وفات کے بعد اگست ۱۹۷۰ء میں مجلس ترقی ادب کے ناظم بنائے گئے۔ حسن اتفاق سے میں مجلس کے ایک پرانے منصوبے کے تحت ''مقالات حافظ محمود شیرانی'' کی تدوین میں مصروف تھا۔ اس وقت تک اس سلسلے کی پانچ جلدیں شائع ہو چکی تھیں اور میرا مجلس میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ خاں صاحب کی بطور ناظم مجلس تشریف آوری سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ وہاں مجھے خاں صاحب کی صحبت سے مستفید ہونے کے وافر مواقع حاصل ہوئے۔ اس سے پہلے کا تعلق تو کلاس میں استفادے کی حد تک تھا۔ وہ مبارکباد والا خط بھی میں نے محض ان کی محبت سے بے تاب ہو کر لکھ دیا تھا اور وہ غالباً انہیں یاد بھی نہ ہوگا۔

پہلے روز جب مجلس ترقی ادب کے دفتر میں ملاقات ہوئی تو میں نے اپنا تعارف مرتب مقالات شیرانی کی حیثیت سے کرایا۔ ضمناً یہ بھی عرض کر دیا کہ مجھے بی اے میں آپ کا شاگرد ہونے کی سعادت حاصل ہے۔ یہ سن کر خاں صاحب نے کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ بس خاموش رہے جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔ سچ پوچھیے تو ان سے دلی محبت کی بنا پر مجھے کچھ مایوسی ہوئی۔ پھر میں نے اپنے دل کو سمجھایا کہ خاں صاحب کے شاگردوں میں بڑی بڑی شخصیات شامل ہیں، تمہاری حیثیت ہی کیا ہے کہ وہ کچھ فرماتے۔ ایاز قدر خود بشناس۔ لیکن اس کے بعد ان کی نظامت کے ساڑھے تین سالہ عرصے میں انہوں نے مجھ پر جو شفقتیں نچھاور کیں وہ محسوس کی جاسکتی ہیں، کہی شاید نہ جاسکیں۔ بہر حال میں ان دنوں کی یادوں سے چند منتخب جھلکیاں یہاں پیش کرتا ہوں۔

فن تحقیق میں صحت متن کی جو اہمیت ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اس ضمن میں محض حافظے پر بھروسہ کرنا گمراہی کا باعث ہوسکتا ہے۔ نامور ایرانی محقق علامہ قزوینی کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ

ایک مقام پر کوئی شعر حافظے کی مدد سے درج کر گئے جو غلط تھا۔ جب یہ تحریر چھپی تو بڑی لے دے ہوئی۔ علامہ موصوف پشیمان ہوئے اور معذرت کے ساتھ اعلان کیا کہ آئندہ اگر سورۃ اخلاص بھی نقل کروں گا تو قرآن مجید سے تصدیق کرلوں گا۔ ایک بار ایسی ہی حماقت مجھ سے سرزد ہوئی۔ مقالات شیرانی کی چھٹی جلد کا مسودہ مکمل کر کے مجلس کے دفتر پہنچانا تھا۔ رات گئے تک ''عرضِ مرتب'' لکھتا رہا۔ اس میں علامہ اقبال کا ایک شعر میں نے اپنے حافظے کے بل بوتے پر لکھ ڈالا۔

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآ بادان کنند
تو ندانی اوّل آن بنیاد را ویران کنند[1]

اگلے دن صبح لاہور پہنچا اور مسودہ خاں صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ انہوں نے جب ''عرضِ مرتب'' پر نظر ڈالی اور شعر پڑھا تو فرمانے لگے، ''مجھے شک پڑتا ہے کہ اس شعر میں کوئی خفیف سا فرق ہے۔'' پھر مجلس کی لائبریری سے علامہ کی کلیات منگوائی اور شعر نکال کر دیکھا تو دوسرا مصرع یوں تھا:

۔ می ندانی اوّل آن بنیاد را ویران کنند

چنانچہ اس کی درستی کی گئی۔ جائے استاد خالیست، ایسے ہی موقع پر بولا جاتا ہے۔

مجلس کی شائع کردہ کتابیں بعض اہل علم کو اعزازی طور پر ارسال کی جاتی تھیں۔ ایک دن مجھ سے دریافت کیا: ''آپ کا نام اعزازی طور پر کتابیں پانے والوں کی فہرست میں شامل ہے؟'' میں نے نفی میں جواب دیا تو فرمایا: ''آپ کو مجلس کی مطبوعات ضرور ملنی چاہئیں۔'' میں خاموش رہا۔ چند دن بعد مجھے کالج کے پتے پر ایک بلٹی موصول ہوئی۔ یہ دو پیٹیاں تھیں جن میں اس وقت تک شائع ہونے والی مجلس کی تمام کتابوں کا ایک ایک نسخہ موجود تھا۔ پھر یہ سلسلہ مستقل طور پر جاری رہا۔

۱۹۷۰ء میں وحدتِ مغربی پاکستان کے خاتمے کے وقت لاڑکانہ کا ڈومیسائل ہونے کی وجہ سے میری خدمات حکومت سندھ کے حوالے کر دی گئیں۔ اس موقع پر مجھے پنجاب میں روکنے کے

لیے جن مہربانوں نے کوششیں کیں ان میں خاں صاحب کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ انہوں نے چیف سیکرٹری کے نام، ناظم مجلس ترقی ادب کی حیثیت سے ایک مفصل خط لکھا جس میں ہمارے خاندان کے لاہور سے پرانے تعلق کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا تھا کہ یہ شخص مجلس کے ایک نہایت اہم منصوبے پر مصروفِ کار ہے اور اس کے سندھ چلے جانے کی صورت میں یہ کام ادھورا رہ جائے گا۔ ان مساعی کے نتیجے میں مجھے ابتدا میں دو سال کے لیے پنجاب میں روک لیا گیا اور بعد ازاں حکومت سندھ سے اجازت لے کر اس قیام کو مستقل صورت دے دی گئی۔

میں ۱۹۶۵ء سے گردوں کی تکلیف میں مبتلا تھا۔ مرض کی نوعیت یہ تھی کہ دونوں گردوں میں چھوٹی چھوٹی پتھریاں بنتیں اور باری باری نکلتی تھیں۔ ایک بار ایسی ہی صورتحال کے باعث میں بہت دنوں تک خاں صاحب کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔ جب گیا تو انہوں نے اس طویل وقفے کا سبب دریافت کیا۔ میرے عرض کرنے پر انہوں نے اپنا واقعہ سنایا جو یوں تھا کہ جب وہ اسلامیہ کالج میں لیکچرار مقرر ہوئے تو کچھ عرصے بعد انہیں دردِ گردہ کی شکایت ہوئی اور ان کو کئی دن چھٹی کرنی پڑی۔ ان کے شاگردوں میں سے کسی نے اپنے بزرگوں سے اس بات کا تذکرہ کیا۔ اس طالب علم کے دادا نے ایک نسخہ بتایا اور کہا کہ جب تمہارے استاد کی پتھری نکل جائے تو ان کے یہ نسخہ استعمال کرنے سے آئندہ پتھری نہیں بنے گی۔ خاں صاحب نے پتھری خارج ہونے کے بعد وہ نسخہ استعمال کیا جو تیر بہدف ثابت ہوا اور پینتیس برس گزر جانے کے باوجود انہیں دوبارہ یہ شکایت نہیں ہوئی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں نے بڑے اشتیاق سے خاں صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد گویا ہوئے: ''نسخہ بلاشبہ نہایت مفید لیکن انتہائی مکروہ ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں عرض کروں۔'' میں نے کہا، ''ضرور عنایت کیجیے۔'' اس کے بعد بھی اپنے اخلاق عالیہ کے باعث انہوں نے دو تین بار معذرت کی۔ تب کہیں جا کر وہ نسخہ بتلایا۔ اس میں وقفے وقفے سے علی الصباح، نہار منہ، باسی پانی سے تین بار زندہ جگنو نگلنا ہوتا ہے۔ پہلے اور دوسرے کے درمیان پورے ایک ہفتے کا اور دوسرے اور تیسرے کے درمیان پورے دو ہفتے کا وقفہ ہونا چاہیے۔ خاں صاحب نے بڑی شفقت سے مجھے ساری تفصیلات سمجھائیں۔ جگنو کے لیے دو شرطیں تھیں۔ ایک تو وہ نگلتے وقت زندہ ہو اور دوسرے اس کا روشنی کا انڈا صحیح سالم یعنی خوب روشن ہو۔ فرمایا کہ میں نے تو حلوے کا چھوٹا سا گولا بنا کر اور انگوٹھے سے اس میں خلا پیدا کر

کے اس میں جگنو رکھ کر لگا تا تھا لیکن اب کیپسول آ گئے ہیں، ان سے مدد لی جا سکتی ہے۔ یہ بھی سمجھایا کہ ایک ململ کی تھیلی میں احتیاطاً ایک سے زیادہ جگنورات کو بند کر کے رکھ لینے چاہئیں تا کہ اگر ایک مر جائے یا اس کا روشنی کا انڈا ضائع ہو جائے تو دوسرا کام آ سکے۔ ساتھ ہی برتن میں پانی رکھ لیا جائے۔ جو صبح تک باسی ہو جائے گا۔ فرماتے تھے کہ پتھری سے گردے میں پیدا ہو جانے والے خلا کو بھرنے کا یہ واحد علاج ہے لیکن اس میں کامیابی کی شرط یہ ہے کہ نسخہ استعمال کرتے وقت وہ سانچہ پتھری سے خالی ہو۔

نسخہ واقعی مکروہ تھا پر مرتا کیا نہ کرتا۔ استعمال کیا بلکہ بہت سوں کو کرایا بھی۔ جس نے آزمایا مستقل شفا پا گیا۔ مجھے بھی طویل عرصے تک آرام رہا تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عمل کے دوران گردوں کے پتھری سے یکسر خالی ہونے کی شرط میرے معاملے میں پوری نہ ہو سکی۔ اس لیے افاقہ ضرور ہوا لیکن مستقبل آرام نہ آ سکا۔ وہی مثل ہوئی:

؎ تہی دستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل ؏

خاں صاحب نے وزیر آباد کے مشن ہائی سکول سے میٹرک پاس کیا تھا۔ ان دنوں وہاں ریورینڈ ڈاکٹر طامس گراہم بیلی بھی پڑھایا کرتے تھے۔ ایک بار ان کے پنجابی زبان سے شغف اور اس پر عبور کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے خاں صاحب نے بتایا کہ ایک دن ڈاکٹر گراہم بیلی کسی ضمن میں کہنے لگے کہ پہاڑی لوگ رات کے وقت چیڑ کے درخت کی شاخ کا ایک سرا روشن کر کے اس سے مشعل کا کام لیتے ہیں۔ اس میں چونکہ تیل ہوتا ہے اس لیے ''ہائیں مائیں بجھدی نئیں''۔ اس وقت روئے سخن میری طرف کر کے فرمایا: ''یہاں جتنے لوگ موجود ہیں ان میں سے آپ کے سوا شاید کسی کو بھی اس پنجابی محاورے کا علم نہ ہو۔''

آخری واقعہ میں بڑا جی کڑا کر کے لکھ رہا ہوں۔ اس کے بیان کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ قارئین کو خاں صاحب کی مجھ سے گہری محبت کا اندازہ ہو سکے۔ ایک روز میں حاضر خدمت ہوا تو ان کے پاس کلب علی خاں فائق بیٹھے ہوئے تھے اور دونوں میں کسی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ میں حسب معمول سلام کر کے مؤدب بیٹھ گیا اور ہمہ تن گوش ہو گیا۔ موضوع زیر بحث یہ تھا کہ جب کسی خاندان میں ایک علمی نابغہ پیدا ہوتا ہے تو وہ آئندہ کئی نسلیں بنجر کر جاتا ہے۔ خاں صاحب

فرمانے لگے: ''اہل علم وفضل کی دو پشتوں کی مثالیں تو مل جاتی ہیں البتہ مسلسل تین پشتوں کا بلند علمی یا ادبی معیار قائم رکھنا من قبیل محالات ہے۔ برعظیم میں لے دے کے شاہ ولی اللہ کا گھرانا استثنائی حیثیت رکھتا ہے۔'' پھر نجانے کیا خیال آیا کہ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولے: ''دوسری مثال ہمارے شیرانی صاحب کے خاندان کی ہے۔'' میں نے سوچا آج خاں صاحب خلافِ معمول مذاق کے موڈ میں ہیں۔ ان کے چہرے پر نظر ڈالی تو وہ بالکل سنجیدہ تھے۔ میں شرم سے زمین میں گڑ گیا۔ خدا بھلا کرے فائق صاحب کا، انہوں نے خیر آبادی گھرانے کی مثال پیش کرتے ہوئے مولوی فضل امام، مولانا فضل حق اور مولانا عبدالحق کے نام لیے۔ خاں صاحب نے فرمایا: ''مولوی فضل امام اپنے بیٹے اور پوتے کے معیار کو نہیں پہنچے۔'' پھر ذرا توقف کے بعد کہا: ''افسوس ہمارے بھائی مولانا ظفر علی خاں کے اخلاف میں کوئی ایسا نہ ہوا جو ان کے وسیع شعری اور نثری سرمائے کو یکجا ہی کر دیتا۔''

اتنے میں کچھ ملاقاتی آ گئے اور گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

پروفیسر حمید احمد خاں ہماری تہذیب کی ایک درخشاں مثال تھے۔ ایسی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ انہیں دیکھ کر سنائی علیہ الرحمتہ کے یہ اشعار یاد آ جاتے تھے:

قرنہا باید کہ تا یک کودکی از لطفِ طبع عاقلی کامل شود یا فاضلی صاحب سخن
سالہا باید کہ تا یک سنگ اصلی ز آفتاب لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمنؒ

ان کی اصل کا تو پوچھنا ہی کیا کہ وہ مولوی سراج الدین جیسے باصلاحیت اور مبتکر شخص کے فرزند تھے۔ مولانا ظفر علی خاں جیسے نابغۂ عصر ان کے برادرِ اکبر تھے۔ دوسرے بھائیوں میں پروفیسر محمود احمد خاں اور مولانا حامد علی خاں کے اسمائے گرامی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اساتذہ بھی انہیں بہت اچھے ملے جن میں عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد (دکن) کے پروفیسر مولانا عبدالباری ندوی کا نام سب سے نمایاں ہے۔ خود فرمایا کرتے تھے: ''میں حضرت مولانا عبدالباری ندوی کا بنایا ہوا ہوں۔'' اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ خاں صاحب سب سے زیادہ جس ہستی سے متاثر تھے وہ رسولِ اکرمؐ کی ذات بابرکات ہے۔ ''اسوۂ حسنہ'' کی تعارفی سطور میں کس فریفتگی اور وارفتگی سے لکھتے ہیں: ''عشق رسول آج بھی میری گراں بہاترین متاع حیات ہے۔ محمد مصطفیٰ کی سیرت

طیبہ کا تصور اب بھی میرے دل و دماغ کو اسی طرح ایک حیاتِ نو کا پیغام دیتا ہے جس طرح کبھی دورِ شباب کے لہو کو آگ بنا کر میری رگوں میں دوڑاتا تھا۔ چنانچہ گو اس کتاب میں مجھے جا بجا اپنی تحریر کی خامیوں کا احساس ہے مگر یہ بالکل واضح رہنا چاہیے کہ رسول اللہؐ کی ذاتِ اقدس کے متعلق محبت و شیفتگی کا جو اظہار ان صفحات میں ہوا ہے وہ آج بھی اپنے اوّلین ولولے کے ساتھ تازہ ہے:

سعدی اگر عاشقی کنی و جوانی
عشق محمدؐ بس است و آل محمدؐ''

خاں صاحبؒ کے بچپن ہی میں ان کے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ جو بچے صغر سنی میں سایۂ پدری سے محروم ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی پرورش اور تربیت کے لیے خاص حالات پیدا کر دیتا ہے:

ـــ کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

ایسی سینکڑوں مثالیں دستیاب ہو سکتی ہیں جن میں روشن ترین مثال بھی بلاشبہ حضرت مآبؐ کی ذات ستودہ صفات ہے۔ اگر اس نقطۂ نظر سے بڑے آدمیوں کی سوانح عمریوں کا مطالعہ کیا جائے تو عجیب و غریب انکشاف ہوتے ہیں اور کبھی کبھی تو یتیمی بھی ایک نعمت غیر مترقبہ محسوس ہونے لگتی ہے۔

خاں صاحب کی قلمی یادگاروں کے جائزے کا یہ مضمون متحمل نہیں ہو سکتا۔ میں صرف اتنا کہوں گا کہ وہ تحقیق و تنقید کے بنیادی تقاضوں کا، جن میں دیانت داری شرط اوّل کی حیثیت رکھتی ہے، پورا پورا لحاظ رکھنے کے ساتھ ساتھ صاحب اسلوب بھی ہیں۔ غالب پر ان کی کتاب ''مرقع غالب'' ہی دیکھ لیجیے۔ یہ غالب پر لکھی گئی سینکڑوں کتابوں میں ایک انفرادی شان کی حامل ہے۔ خاں صاحب کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ آرائش لفظی کا سہارا کبھی نہیں لیتے، سادہ اور پرکار انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کر دیتے ہیں۔ ان کی تحریر میں کوئی جملہ بھرتی کا نہیں ہوتا بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ہر ہر جملے میں ایک ایک لفظ نگینے کی طرح جڑا ہوتا ہے جو موقع کے تقاضوں پر ہر لحاظ سے پورا اترتا ہے۔ وہ نہ صرف خود کوئی ناموزوں لفظ استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ بے محل الفاظ کے استعمال پر اپنے ماتحتوں اور طلبہ کی بڑے مہذب

انداز میں اصلاح بھی کر دیتے تھے۔ خاں صاحب کی وائس چانسلری کے دور میں ہمارے دوست شبیر اختر صاحب ڈپلومہ ان لائبریری سائنس کے طالب علم تھے۔ ان دنوں اس شعبے کے طلبہ کو دوسرے شعبوں میں دی جانے والی بعض مراعات حاصل نہ تھیں۔ چنانچہ وائس چانسلر صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کی غرض سے ایک محضر تیار کیا گیا۔ شبیر صاحب یہ عرضداشت لے کر خاں صاحب کے دفتر میں حاضر ہوئے۔ وہ حسبِ معمول بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ انہیں بیٹھنے کا کہہ کر وہ تحریر ان سے لے لی۔ اس کے عنوان میں لفظ ''مطالبات'' شامل تھا۔ خاں صاحب نے بڑی ملائمت سے فرمایا: ''بیٹے! مطالبات کے لفظ سے تخالف اور تصادم کا شائبہ ہوتا ہے۔ اسے تجاویز سے بدل دیجیے۔''

غالب کے علاوہ خاں صاحب کے پسندیدہ موضوعات میں علامہ اقبال، تعلیم وتہذیب اور اردو زبان زیادہ اہم ہیں۔ ان کا تحریری کام معیار کے علاوہ مقدار کے اعتبار سے بھی خاصا وقیع ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی تدریسی اور تنظیمی مصروفیات کے باعث اپنے تالیفی کام کی طباعت پر پوری توجہ نہ دے سکے۔ بعض اہم کتابیں ان کی وفات کے بعد شائع ہوئیں۔ تاہم اب بھی بہت سی قابل اشاعت چیزیں یقیناً باقی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے فرزندوں بالخصوص سعید احمد خاں صاحب کو یہ اہم ذمہ داری نبھانے کی توفیق ارزانی کرے۔

پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کو فشار الدم کی شکایت دیر سے تھی۔ اسی بنا پر انہیں کبھی کبھی غصہ بھی آ جاتا تھا۔ ایسا ایک آدھ واقعہ اسلامیہ کالج ہی کے زمانے میں سننے میں آیا تھا جب خاں صاحب نے کسی طالب علم کی ذرا سختی سے سرزنش کی اور پھر اگلے ہی دن اسے بلوا کر اس سے معذرت چاہی۔ اس مرض کا شافی علاج تفکرات سے نجات ہے لیکن جس کے دل میں سارے جہاں کا درد سمایا ہو اس کو بے فکری سے کیا واسطہ، پھر فرائض منصبی کی کماحقہ انجام دہی کی تشویش اس پر مستزاد۔

بالآخر ۲۲ مارچ ۱۹۷۴ء کی صبح وقتِ موعود آن لگا۔ مجلس کے دفتر جانے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ دماغ کی رگ چٹخ گئی۔ چند گھنٹے بے ہوشی کے عالم میں گزارنے کے بعد اسی شام یہ سرآمد روزگار شخص مالک حقیقی کی بارگاہ میں سرخرو حاضر ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

میں نے استاد مکرم کے سانحۂ ارتحال پر ایک قطعہ تاریخ کہا تھا وہی یہاں درج کر کے اس

یادنگاری کا اختتام کرتا ہوں:

قطعۂ تاریخِ وفات

میرے اُستاد حمید احمد خاں — ان کے اوصاف ہوں کیا کیا مذکور
جب ہوئے راہگرائے فردوس — رحمتِ حق ہوئی ان پر موفور
بہر تاریخ تھا میں سرگرداں — گرچہ صدمے سے تھا ازحد معذور
ہاتفِ غیب نے اِس موقع پر
دی صدا ''آہ حمید مغفور''
۱۳۹۴ھ

حواشی

۱- ''جب نغمے کے ذوق میں کمی دیکھو تو اپنے گانے میں شدت پیدا کرو (اور) اگر محمل زیادہ وزنی پاؤ تو حدی کی لے تیز کر دو۔''

۲- ''رومی نے کہا، تم نہیں جانتے کہ جب کسی پرانی عمارت کی تجدید کرنا ہوتی ہے تو پہلے اس کو گرایا جاتا ہے۔''

۳- ''جن کی قسمت ہی کھوٹی ہو انہیں کسی کامل ہستی کی رہنمائی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔''

۴- ''فطری لطافت کے حامل ایک بچے کے دانشمند اور عالم و فاضل بننے میں ایک عرصہ لگتا ہے اور ایک عمدہ پتھر کو سورج کی حرارت سے لعل بدخشاں یا عقیق یمنی کی شکل میں آنے کے لیے طویل مدت درکار ہوتی ہے۔''

۵- ''اے سعدی! اگر راہ عشق میں قدم رکھنا اور جوانمردی کا مظاہرہ کرنا چاہے تو عشق رسولؐ و آل رسولؐ ہی (تیرے لیے) کافی ہے۔''

حرم میں برہمن وطن میں غریب

سید وزیر الحسن عابدی (۱۹۱۴ء-۱۹۷۹ء)

ایم اے تاریخ سے فراغت پانے کے بعد یہ احساس ہوا کہ برعظیم کے مسلمانوں کی تاریخ پر کام کرنے کے لیے فارسی زبان پر عبور شرط لازم کی حیثیت رکھتا ہے۔ فارسی سے دلچسپی تو پہلے ہی تھی۔ بچپن میں داداجان سے فارسی کی پہلی کتاب[1] اور گلستاں کا کچھ حصہ پڑھا تھا۔ بعدازاں میٹرک، ایف اے اور بی اے میں فارسی بطور منتخب مضمون رکھی تھی۔ اب جو پتا چلا کہ ایک مضمون میں ایم اے کرنے کے بعد صرف ایک سال میں دوسرا ایم اے کیا جا سکتا ہے تو اس اطلاع نے سمندِ شوق پر تازیانے کا کام کیا۔ لہٰذا ستمبر ۱۹۵۹ء میں ایم اے فارسی کے سال ششم میں داخلے کا فارم جمع کرا دیا۔ اورینٹل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر سیّد عبداللہ تھے اور ڈاکٹر محمد باقر صدر شعبہ فارسی، دونوں ایم اے (فارسی) میں داداجان کے شاگرد رہ چکے تھے۔ انٹرویو میں ڈاکٹر باقر صاحب نے صرف اتنا پوچھا کہ آپ فارسی میں داخلہ کیوں لے رہے ہیں؟ جی میں آئی کہہ دوں کہ آپ کم از کم مجھ سے تو یہ سوال نہ کیجیے، پر یہی کہا کہ فارسی زبان میں تاریخ کے مآخذ سے استفادہ مقصود ہے۔

کالج میں کمروں کی قلت تھی[2]۔ اس کا حل یہ نکالا گیا تھا کہ سال پنجم اور سال ششم کے طلبہ اکٹھے بیٹھتے تھے۔ اس مشترکہ کلاس کو آدھا نصاب ایک سال اور آدھا دوسرے سال پڑھایا جاتا تھا۔ کالج کی روایت کے مطابق دائیں جانب طالبات اور بائیں جانب طلبہ کی نشستیں ہوتیں۔ بیچ میں اوٹ لگی ہوتی۔

شعبے کے مستقل اساتذہ تو تین ہی تھے یعنی ڈاکٹر باقر صاحب (پروفیسر)، سید وزیر الحسن

عابدی (ریڈر) اور میاں شکور احسن (لیکچرار)، البتہ گورنمنٹ کالج سے مرزا مقبول بیگ بدخشانی اور فیروز الدین رازی صاحبان بالترتیب نظم و نثر کا پرچہ پڑھانے آتے۔ اقبالیات پہلے ڈاکٹر سید عبداللہ پڑھاتے رہے، پھر اسلامیہ کالج (سول لائنز) سے ڈاکٹر وحید قریشی آنے لگے۔

پہلے دن جب سیّد عبداللہ صاحب کلاس میں آئے اور حاضری لینا شروع کی تو میرے نام پر ٹھٹک گئے۔ چند بار انگلی سے میری طرف اشارہ کیا۔ پھر دو چار نام اور پکارے اور رک کر مجذوبانہ انداز میں وہی اشارے کیے۔ ان کی اس حرکت پر سب طلبہ میری طرف دیکھنے لگے۔ مجھے بڑی الجھن ہوئی۔ پھر دو ایک نام پکار کر اشارہ کیا اور فرمانے لگے: ''ہمارے استاد زادے ہیں ــــ ہم نے جو کچھ پایا، ان کے گھر سے پایا۔''

ہفتہ عشرہ گزرا ہوگا کہ ایک دن بدخشانی صاحب نے کلاس ختم ہونے پر مجھے برآمدے میں بلایا۔ حافظ صاحب (دادا جان) سے میرا رشتہ دریافت کیا اور کھو سے گئے۔ پھر ذرا توقف کے بعد گویا ہوئے: ''جب ان کا نام آتا ہے تو بہت سی پرانی باتیں اور ان کی شفقتیں یاد آجاتی ہیں۔ وہ بڑے باکمال استاد اور نہایت عظیم انسان تھے۔'' بدخشانی صاحب اسلامیہ کالج (لاہور) میں ان کے شاگرد رہ چکے تھے۔

عابدی صاحب کو فارسی مضمون نویسی اور فارسی گفتاری (جدید فارسی بول چال) کا پرچہ تفویض ہوا تھا چنانچہ وہ اکثر فارسی زبان ہی میں لیکچر دیا کرتے تھے۔ ان کا تلفظ اور لہجہ بالکل جدید تھا۔ ہم کلاسیکی فارسی کے عادی تھے۔ اس لیے شروع شروع میں بڑی پریشانی ہوئی۔ ایسا لگتا تھا کہ فرانسیسی زبان میں لیکچر ہو رہا ہے۔ رفتہ رفتہ عادی ہوتے گئے اور کچھ پلّے بھی پڑنے لگا۔ کوئی مہینے بھر کے بعد ایک دن عابدی صاحب نے کلاس سے نکلتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: ''آپ کلاسوں سے فارغ ہو کر ہمارے کمرے میں آئیے۔'' میں پریشان ہو گیا۔ بہرحال باقی ماندہ کلاسیں ختم ہونے کے بعد ڈرتا ڈرتا پہنچا اور اجازت لے کر ان کے کمرے میں داخل ہوا۔ عابدی صاحب گاؤن پہنے بڑے وقار سے اپنی کرسی پر بیٹھے کوئی کتاب دیکھ رہے تھے۔ نظریں اٹھا کر کہا: ''آگے آئیے۔'' میں ذرا آگے بڑھا تو سوال کیا: ''آپ حافظ محمود شیرانی کے صاحبزادے ہیں؟'' عرض کیا: ''جی نہیں، وہ میرے دادا تھے۔'' بولے: ''اور آگے آئیے۔'' میں قریب پہنچا تو اچھل کر کھڑے ہو گئے اور بے اختیار مجھے سینے سے لگا لیا۔ خاصی دیر بعد گرفت ڈھیلی کی اور فرمایا:

''تشریف رکھیے۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ عابدی صاحب نے حافظ صاحب کا عقیدت مندانہ تذکرہ چھیڑ دیا اور دیر تک ان کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے رہے۔ چند باتیں جو مجھے یاد رہ گئی ہیں انہی کے الفاظ میں یہاں درج کرتا ہوں:

''جب بھی ہم پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں جاتے ہیں اور ان کے فراہم کردہ بیش قیمت ذخیرہ کتب سے استفادہ کرتے ہیں تو ہماری آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ یہ کیسا عجیب اور عظیم شخص تھا جس نے اپنی پوری زندگی علم کو فروغ دینے اور تحقیق کی بنیادیں استوار کرنے میں صرف کر دی۔

''حافظ محمود شیرانی شہیدِ علم تھے۔ دمے کا مرض جس میں بالآخر ان کی جان گئی دراصل انہیں مدت العمر پرانے مخطوطات کی گرد جھاڑنے کے نتیجے میں لاحق ہوا تھا۔ یہ گرد انسان کے نظامِ تنفس کے لیے زہرِ قاتل کا حکم رکھتی ہے۔

''ہمیں صرف ایک بار دسمبر ۱۹۳۹ء میں بمقام دہلی ان کی زیارت نصیب ہوئی تھی۔ وہ اپنے بہت سے نوادرات کے ساتھ اردو کانفرنس میں منعقدہ نمائش کے سلسلے میں دہلی گئے ہوئے تھے۔ اس موقع پر ہم نے ان سے ایک ایسا بچگانہ سوال کیا کہ اب سوچتے ہیں تو ہنسی آتی ہے۔ ہم نے پوچھا کہ کیا شیخ شہاب الدین سہروردی کی 'عوارف المعارف' کہیں مل سکتی ہے؟ انہوں نے جواب دیا، جی ہاں، نولکشور نے چھاپ دی تھی۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے آج کوئی کہے کہ جی ہاں، اردو بازار میں مل جاتی ہے۔

''آپ کی شکل اپنے دادا جان سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔''

آخر میں جب میں نے، ان کا وقت ضائع ہونے کے خیال سے، اجازت چاہی تو فرمانے لگے: ''آپ ہر ہفتے فارسی میں کسی موضوع پر مضمون لکھ کر ہمیں دکھا دیا کیجیے۔ آپ کے لیے وقت کی کوئی قید نہیں ہے۔ جب بھی ہمیں اپنے کمرے میں دیکھیں آ جایا کیجیے۔''

میں نے اس اجازت کو غنیمت سمجھا اور ہفتے عشرے میں کچھ نہ کچھ لکھ کر ان کی خدمت میں جانا شروع کیا۔ عابدی صاحب لکھنے پڑھنے میں مصروف بھی ہوتے تو اپنا کام چھوڑ کر مجھے ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ میری تحریر کے ایک ایک جملے بلکہ ایک ایک لفظ کو جانچتے اور معلومات کے دریا بہا دیتے۔ کاپی کے صفحات ان کی اصلاحوں سے سرخ ہو جاتے۔ تاہم یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ چل سکا۔ ایک دن انہیں کچھ خیال آیا اور انہوں نے بڑی اپنائیت سے مجھے بدین الفاظ تنبیہ کی: ''آپ ذرا

کم آیا کیجیے۔ کہیں نظر کرم نہ ہو جائے۔'' میں ان کا اشارہ پا گیا کیونکہ ان دنوں اورینٹل کالج میں اساتذہ کی گروہ بندی اور اس ضمن میں بعض سینئر اساتذہ کے نہایت پست سطح تک اتر آنے کے واقعات زبان زد خاص و عام تھے۔ اس انتباہ کے باوجود میں اور میرے ایک ہم جماعت اشتیاق حسن خاں موقع دیکھ کر عابدی صاحب کے کمرے میں پہنچ جاتے تھے۔

عابدی صاحب والے پرچے کے لیے کوئی نصابی کتاب تو مقرر تھی نہیں، بس عمومی لیکچر ہوتا تھا۔ مضمون نویسی میں طلبہ کی رہنمائی کے لیے انہوں نے یہ طریقہ نکالا تھا کہ ہر سال ایک بڑے شاعر کو موضوع بنا لیتے تھے اور اس کے وسیع اور عمیق مطالعے کی وساطت سے طلبہ کو تحقیق وتنقید کے اصول و آداب سکھانے اور ان کے عملی اطلاق میں طاق کرنے کی کوشش کرتے، اور سچ تو یہ ہے کہ یہ انہی کا حصہ تھا۔ ہماری بار اس مقصد کے حصول کی خاطر انہوں نے مولانا جامی کا انتخاب کیا تھا۔ گفتگو کے لیے منہ سے پھول جھڑنے کا محاورہ تو سنا تھا تاہم اس کا مصداق عابدی صاحب کی ذات گرامی دیکھی۔ اردو ہی نہیں جدید فارسی میں بھی ان کا یہی عالم تھا۔ میں نے ایرانیوں میں سے بھی شاید ہی کسی کو اتنی نفیس اور رواں فارسی بولتے سنا ہوگا۔

ہماری کلاس کے لیے مختص کمرہ کالج کی دوسری منزل کے مشرقی سرے پر تھا۔ عابدی صاحب تدریس کے دوران کسی قسم کی بیرونی مداخلت برداشت نہیں کرتے تھے۔ اگر کسی طالب علم کا کوئی ملاقاتی برآمدے میں آ کھڑا ہوتا تو ان کے افکار کا سلسلہ منقطع ہو جاتا تھا، اور اپنے خیالات کو دوبارہ مجتمع کرنے میں انہیں دقت ہوتی تھی۔ کچھ عرصے ان کا یہ معمول رہا کہ وہ گھر سے اپنے ملازم لڑکے کو ساتھ لے آتے تھے اور کلاس میں آتے وقت اسے برآمدے میں کھڑا کر دیتے تھے کہ وہ کسی ملاقاتی کو آگے نہ آنے دے۔ ایک روز یوں ہوا کہ ایک شخص اس لڑکے کے روکنے کے باوجود آگے بڑھ کر کمرے کے دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ اس سے نمٹنے کے بعد عابدی صاحب نے اپنے ملازم کو فارسی زبان میں سخت سست کہا۔ ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس ملازم لڑکے نے بڑی رواں فارسی زبان میں اپنی مجبوری بیان کی۔ ہم سمجھے کہ لڑکا ایرانی ہے۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ تو آزاد کشمیر سے تعلق رکھتا ہے اور مطلق جاہل ہے۔ قصہ یہ تھا کہ عابدی صاحب کے گھر ایرانی ملاقاتی کثرت سے آتے تھے۔ ان سے عابدی صاحب کی تمام تر گفتگو فارسی میں ہوتی تھی۔ چنانچہ صحبت کے زیر اثر وہ لڑکا فارسی مکالمے میں ایسا طاق ہو گیا کہ باید و شاید۔ مجھے تو اس پر بڑا رشک آیا کہ اگر

قسمت سے مجھے بھی عابدی صاحب کا ایسا قرب حاصل ہوتا تو میں بھی ایسی نفیس فارسی بول سکتا۔ بہر حال ایمان کی بات یہ ہے کہ آج فارسی میں جو تھوڑی بہت شد بد ہے وہ ایسے ہی نادرۂ روزگار اساتذہ کی جوتیاں سیدھی کرنے کا نتیجہ ہے۔

عابدی صاحب کی ولادت ۱۵ دسمبر ۱۹۱۴ء کو ضلع بجنور کے ایک موضع پیدی میں ہوئی۔ بجنور، بدایوں، بریلی اور لکھنؤ میں تعلیم پائی۔ دہلی یونیورسٹی سے ایم اے (فارسی) کیا اور یہیں سے زبان و ادب کی تحقیق کا شوق لگا۔ ملازمت کا آغاز اینگلو عربیک سکول، دہلی سے کیا۔ پھر دہلی کالج میں لیکچرار ہو گئے۔ غالب ان کا خاص موضوع تھا۔ غالب کی تصنیف ''باغ دودر'' کا منحصر بفرد نسخہ ۱۹۴۱ء میں انہی کو ملا تھا۔ اس پر ان کا تعارفی مضمون رسالہ ''آج کل'' (دہلی) کے ۱۵ فروری ۱۹۴۷ء کے شمارے میں چھپا تھا۔ جلد ہی ہندوستان کے علمی حلقوں میں ان کا تعارف ہو گیا۔ پروفیسر سید حسن عسکری لکھتے ہیں:

> ''پروفیسر وزیر الحسن عابدی، دہلی کالج میں لیکچرار تھے۔ پٹنہ آئے اور میں خود ان سے کتب خانہ میں ملا۔ قاضی صاحب کے بارے میں دریافت کیا۔ میں انہیں لے کر قاضی صاحب کے دولت کدے پر پہنچا۔ بڑی دلچسپ اور کام کی باتیں ہوتی رہیں۔ عابدی صاحب غالب کے فارسی کلام پر کام کر رہے تھے۔ کتب خانہ میں دیوان اور متفرقات کلام فارسی کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ظاہر ہے قاضی صاحب کی یہ خاص دلچسپی کا موضوع تھا۔ عابدی صاحب بھی بڑے ذہین تحقیقی کام کرنے والے تھے۔''
>
> (''ہندوستان کے عہد وسطیٰ پر مقالات'' پٹنہ، ۱۹۹۵ء، ص ۴،۵)

خود بتاتے تھے کہ ایک بار غالب کے بارے میں تحقیقی لوازمہ کی تلاش میں رام پور پہنچے۔ علامہ امتیاز علی خان عرشی، اسٹیٹ لائبریری کے ناظم، پٹھان آدمی تھے۔ ان کا موضوع خصوصی بھی غالبیات تھا۔ عابدی صاحب کے آنے کی اطلاع ملی تو لائبریری میں تالا ڈال کر باہر بیٹھ گئے۔ ملاقات ہوئی تو کہنے لگے کہ تم نے اب تک غالب پر جو تازہ معلومات اکٹھی کی ہیں وہ سب مجھے بتاؤ گے تو اندر جانے دوں گا۔ غرض تا دیر گفت و شنید کے بعد تالا کھولا۔

ملک کی آزادی اور تقسیم کی افراتفری کے زمانے میں عابدی صاحب فارسی کی اعلیٰ تعلیم کے

حصول کی خاطر دہلی سے ایران جا پہنچے۔ ایران میں وہ جن اساتذہ سے مستفید ہوئے ان میں ملک الشعرا بہار بھی شامل تھے۔ وہاں تہران یونیورسٹی سے فارسی ادبیات میں فوق لیسانس (ایم اے) کی ڈگری لی اور ڈاکٹریٹ کے لیے رجسٹر ہوئے۔ اسی اثنا میں ان کی قابلیت کی شہرت ایران کے علمی حلقوں میں پھیل گئی اور ایرانی اساتذۂ فارسی ان سے مشورہ اور تبادلۂ خیال کی غرض سے آنے لگے۔ سنا ہے کہ شیراز یونیورسٹی کے فیلو بھی بن گئے تھے۔

۱۹۵۱ء میں ایک محدود عرصے کے لیے جسٹس ایس اے رحمٰن کے پاس پنجاب یونیورسٹی کی وائس چانسلرشپ کا اضافی چارج رہا تھا۔ وہ اس حیثیت سے کسی میٹنگ میں شرکت کے لیے تہران گئے۔ وہاں کسی تقریب میں ان کی عابدی صاحب سے ملاقات ہوئی تو وہ ان کی علمیت اور گفتگو سے بڑے متاثر ہوئے۔ ان دنوں اتفاق سے پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں فارسی گفتاری کے ایک ریڈر کی پوسٹ خالی تھی جس پر کسی ایرانی کو لانے کا ارادہ تھا۔ رحمٰن صاحب کو خیال آیا کہ عابدی صاحب اس خدمت کے لیے زیادہ موزوں رہیں گے چنانچہ انہوں نے عابدی صاحب کو یہ پیشکش کر دی۔ عابدی صاحب نے معذرت کرتے ہوئے کہا: ''میں ہندوستان سے تحصیل علم کے لیے ایران آیا تھا۔ میری اہلیہ اور ذاتی کتب خانہ وہاں ہے۔ اندریں حالات میں آپ کی پیشکش کیونکر قبول کرسکتا ہوں۔'' رحمٰن صاحب نے جواب دیا: ''آپ ہاں تو کیجیے۔ آپ کی بیگم اور ذخیرۂ کتب ہندوستان سے لاہور لانا ہمارا کام ہے۔'' یوں عابدی صاحب ایران سے لاہور چلے آئے۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے ''تاریخ یونیورسٹی اورینٹل کالج'' (ص ۲۲۱) میں عابدی صاحب کی ملازمت کے آغاز کی تاریخ ۹ فروری ۱۹۵۱ء بتائی ہے لیکن میرے خیال میں ان کی آمد اس کے کچھ عرصے بعد ہوئی ہوگی۔ سندھ یونیورسٹی شعبۂ اردو کے رسالے ''تحقیق'' (شمارہ ۱۲-۱۳، ص ۶۸۲-۶۸۳) میں شائع ہونے والے علامہ امتیاز علی عرشی کے ایک خط (نمبر ۵۱) نوشتہ ۳۱ مارچ ۱۹۵۱ء بنام ڈاکٹر مختار الدین احمد میں یہ عبارت ملتی ہے:

> ''ہاں بھائی، وزیر الحسن عابدی صاحب کا خط دو چار دن ہوئے تہران سے آیا ہے۔ وہ ابھی تک اپنے کام سے فارغ نہیں ہوئے ہیں — آپ میگزین کا غالب نمبر انہیں بھیج دیجیے۔ اور سبد باغ دو در پر مضمون مانگیے۔

ان کا پتا یہ ہے۔ وزیر الحسن عابدی، باشگاہ دانش گاہ تہران۔ میں بھی انہیں
اس پر آمادہ کروں گا۔ آپ یہ بھی لکھ دیں کہ اگر آپ کسی مصروفیت کی بنا پر
ایسا نہ کر سکیں تو عرشی کو اجازت دیجیے کہ وہ لکھ دیں۔''

بہر حال عابدی صاحب لاہور آ گئے اور ان کی بیگم اور کتب خانہ بھی حسب وعدہ پہنچ گئے۔ تاہم ان کے لیے یہاں کا ماحول اجنبی تھا۔ سب سے بڑی قباحت یہ تھی کہ اس ادارے کے بعض اساتذہ نے ان کی آمد کو اپنی آئندہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھا۔ کچھ ایسے تھے جن کو ان کی علمیت ایک آنکھ نہ بھاتی تھی اور وہ ان کی مذمت کا کوئی موقع فروگزاشت نہ کرتے تھے۔ ایک سانحہ یہ بھی تھا کہ تدریس میں عابدی صاحب جس بلند سطح سے گفتگو کرتے تھے وہاں تک پہنچنا اور ان کے ارشادات سے مستفید ہونا معمولی ذہنی استطاعت رکھنے والے طلبہ کے بس کی بات نہ تھی۔ اکثر طالب علم جو خلاصوں کے بل بوتے پر امتحان پاس کر لینے کو بڑی کامیابی سمجھتے تھے، ان کے انداز تدریس سے شاکی رہا کرتے تھے۔ عابدی صاحب اپنے شاگردوں کی ذکاوت اور نکتہ رسی کو مہمیز کرنے اور ان کی علمی استعداد میں اضافے کی غرض سے کئی طریقے استعمال کرتے تھے مگر وہی مضمون تھا کہ

تہی دستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل

بہر حال عابدی صاحب فارسی میں لیکچر دیتے دیتے اردو میں رواں ہو جاتے۔ باریک نکات اردو میں سمجھاتے۔ چھوٹے چھوٹے چٹکلے اور معمے طلبہ کو سناتے اور انہیں حل کرنے کی دعوت دیتے جس سے ان کی ذہنی آزمائش مقصود ہوتی تھی۔ مثلاً ایک بار ہماری کلاس کو یہ فارسی شعر سنا کر اس کا مفہوم دریافت کیا:

در جبین این کشتی نور رستگاری نیست
یا بلا ازین دور است یا کنارہ نزدیک است[؎]

دونوں مصرعوں کے معنوی تضاد نے طلبہ کو چکرا دیا۔ کچھ دیر بعد عابدی صاحب نے ایک مختصر جملے سے ساری گنجلک دور کر دی۔ فرمایا، ''نور رستگاری ہیڈ لائٹ کو کہتے ہیں۔''

طلبہ کو الفاظ کا درست تلفظ اور صحیح املا سکھانے پر خصوصی توجہ دیتے تھے اور ہمارے ہاں مروّجہ عمومی اغلاط کی نشان دہی کر کے ان سے بچنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ ایک دن کسی شاگرد نے ایک ترکیب کے بارے میں پوچھا، ''کیا یہ غلط ہے؟'' اور غلط کا تلفظ بہ سکون لام کیا۔ عابدی صاحب نے مسکرا کر کہا، ''غلط بذاتِ خود غلط ہے۔''

مشکل اشعار ہی نہیں معمولی اردو اور فارسی اشعار پر اس ژرف نگاہی سے اظہارِ خیال کرتے اور ان کے ایسے ایسے پہلو اجاگر کرتے کہ حیرت ہوتی تھی اور لطف آجاتا تھا۔ لیکن ایسا بھی ہوتا تھا کہ کوئی طالب علم اپنی احمقانہ رائے زنی سے پورے ماحول کو مکدر کر دیتا تھا۔ ایک روز تدریس کے دوران علامہ اقبال کے معروف شعر

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

کے پہلے مصرعے کی صراحت کر رہے تھے۔ پیریڈ ختم ہوا تو ایک لڑکے نے اُٹھ کر کہا: ''سر! ہمارے ایک استاد نے اس شعر کے بارے میں بتایا تھا کہ اس کا پہلا مصرع استفہامیہ ہے۔'' عابدی صاحب نے جاتے جاتے جواب دیا: ''جس شخص نے یہ بات کہی وہ پرلے درجے کا احمق تھا۔''

اسی طرح ایک بار کسی علمی مسئلے پر کلاس میں بڑے بصیرت افروز حقائق بیان کر رہے تھے۔ ایک عقل کے اندھے نے شاید اپنے مطالعے کا رعب ڈالنے کے لیے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا: ''لیکن براؤن نے تو اس بارے میں یوں لکھا ہے۔'' عابدی صاحب کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اور اپنے عالمانہ انکسار کے باوجود وہ یہ فقرہ کہہ کر کمرے سے نکل گئے: ''آج براؤن کی یہ حیثیت نہیں کہ وہ میرا شاگرد ہو سکے۔'' ایمان کی بات ہے کہ یہ دعویٰ مبنی بر حقیقت تھا۔

طلبہ کی اس ذہنی پستی کا عابدی صاحب کو آئے دن سامنا کرنا پڑتا تھا اور وہ خون کے گھونٹ پینے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ عجب نہیں دل ہی دل میں بیدل کا یہ شعر پڑھتے ہوں:

کشاد چشمی نشد نصیبم ز سیر نیرنگ ایں دبستاں
نگہ ز حسرت گداخت امّا نکرد روشن سواد مژگاں[۵]

ایک بار مجھے بڑے دکھ سے کہنے لگے: ''ایک عرصے تک ہم سمجھتے رہے کہ حصول علم کا انحصار صرف مواقع کی دستیابی اور محنت پر ہے۔ اب کہیں جا کر پتا چلا کہ اس میں طالب علموں کی استعداد اور خاندانی پس منظر کا بڑا دخل ہوتا ہے:

باران کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس[1]

ظاہر ہے کہ مجھ پر عابدی صاحب کی بے پایاں شفقت کا بنیادی سبب میری حافظ صاحب سے نسبت تھی۔ دادا جان کے باقاعدہ شاگردوں میں بھی شاید ہی ان کا کوئی ایسا پروانہ ہو جیسے عابدی صاحب تھے۔ ان کا نام بھی اس احترام سے لیتے تھے کہ سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔ نام کے ساتھ علامہ کا سابقہ اکثر لگاتے تھے۔ تدریس کے دوران اکثر ان کا ذکر کرتے رہتے۔ ایک دن ان کے بارے میں یوں رائے زنی کی:

''علامہ حافظ محمود شیرانی کا ذہن ایسا منضبط تھا کہ اگر وہ اتفاق سے سائنس کے میدان میں چلے جاتے تو ایسے ایسے نظریات وضع کرتے اور ایسی ایسی ایجادات پیش کرتے کہ مغربی سائنس دان دنگ رہ جاتے۔''

اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا۔ عابدی صاحب نے کلاس میں غزنوی دور کے شاعر روز بہ نکتی لاہوری کا یہ شعر پڑھا:

یکی نصیحت من یاد گیر و فرمان کن
کہ از نصیحت سود آن کند کہ فرمان کرد[2]

اور طلبہ سے پوچھا کہ اس شعر میں کیا نقص ہے؟ کلاس میں سناٹا چھا گیا، میں اپنے شرمیلے پن کے باعث چپکا بیٹھا رہا۔ جب عابدی صاحب نے بار بار اپنا سوال دہرایا اور کوئی ٹس سے مس نہ ہوا تو میں جی کڑا کر کے اٹھا اور عرض کیا: ''شعر کے دوسرے مصرع میں لفظ نصیحت کی ''ت'' پر سکتہ ہے۔ یہ دور کرنے کے لیے ''ت'' اضافت کی متقاضی ہے تاہم معانی کے پیش نظر یہ ممکن نہیں۔''

میری گزارش سن کر عابدی صاحب کی مسرت کا کیا ٹھکانا تھا۔ کتنی دیر تک واہ وا، واہ وا کرتے

اور جھومتے رہے، پھر فرمایا: ''دراصل علامہ حافظ محمود شیرانی بہت بڑے عروضی تھے۔''

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، عابدی صاحب کا خصوصی موضوع تو غالبیات ہی تھا۔ فرماتے تھے کہ غالب کی عظمت کا اصل اندازہ ان کے فارسی کلام کے عمیق مطالعے ہی سے ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود ان کی ارادت صمیمی کا محور مرشد رومی کی ذات گرامی تھی اور اسی مناسبت سے مرید ہندی یعنی علامہ اقبال کے بھی زبردست شیدائی تھے۔ ہم نے حضرت اقبال کے بارے میں پڑھا اور سنا تو بہت کچھ تھا تاہم اس سے موصوف کی شاعرانہ عظمت اور سیاسی اہمیت کے پہلو زیادہ نمایاں ہوتے تھے۔ عابدی صاحب نے فکر اسلامی کے ارتقا کے تناظر میں علامہ موصوف کی اہمیت جس انداز سے نمایاں کی اس سے ذہن کے کتنے ہی گوشے منور ہو گئے۔ مجھے یاد ہے ایک دن دوران تدریس علامہ کے دو شعروں

چو رومی در حرم دادم اذان من　　　ازو آموختم اسرار جان من
بہ دور فتنۂ عصر کہن او　　　بہ دور فتنۂ عصر روان من[۵]

پر جو گفتگو شروع کی ہے تو سامعین مبہوت ہو کر رہ گئے۔ اس روز ہمیں علامہ اقبال کی حقیقی عظمت کا اندازہ ہوا۔ یہی معاملہ مولانا روم کے فلسفیانہ اور عارفانہ نکات کا تھا۔ غالباً ہماری کلاس کی واماندگیٔ شوق کے پیش نظر انہوں نے مولانا جامی کو خصوصی مطالعے کا موضوع بنایا تھا تاہم وہ مولانا روم سے صرف نظر کر ہی نہیں سکتے۔ بات کہیں سے شروع ہوتی تان مولانا اور علامہ پر آ کر ٹوٹتی:

چلا نا اٹھ کے وہیں چپکے چپکے پھر تو میر　　　ابھی تو اس کی گلی سے پکار لایا ہوں

ایک بار کسی ضمن میں یہ شعر پڑھا:

جبیں ہے سجدہ گزار اس کے آستانے کی　　　رہین عشق ہوں عادت ہے سر جھکانے کی

اس کے بعد جو توحید کا موضوع چھڑا ہے تو کیا کیا نکتہ آفرینیاں کی ہیں کہ سبحان اللہ، تقریر میں اردو اور فارسی کے بیسیوں اشعار بھی شامل تھے جن میں علامہ اقبال کا یہ شعر بھی تھا:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

غرض یہ کہ اشعار کی فکری اور فنی تفہیم ان پر ختم تھی۔ کثرت مطالعہ، ذوق سلیم اور فکر عمیق کے باعث عابدی صاحب کو ایسی بصیرت حاصل ہوگئی تھی کہ باید و شاید۔ اس بارے میں ان کے شاگرد اور معروف مزاحیہ شاعر پروفیسر انور مسعود ایک جگہ لکھتے ہیں:

''آج سے تیس سال پہلے (۱۹۶۲ء) جب میں یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور میں ایم اے فارسی کا طالب علم تھا تو میرے استاد گرامی اور فارسی زبان و ادبیات کے عظیم سکالر جناب پروفیسر سید وزیر الحسن عابدی مرحوم نے ایک روز کلاس میں بڑے وثوق سے یہ الفاظ کہے تھے:

'ایران میں اس وقت مغربی روایت بڑی دلکشی رکھتی ہے لیکن یہ دلکشی چند روز کی مہمان ہے۔ رومی پھر اٹھے گا۔ ایرانی ادب پر اقبال کا زبردست اثر پڑے گا۔ اوستا کے نیارئیے جو چاندی اور سونا نکال رہے ہیں اس کی مکمل صورت قرآن مجید میں موجود ہے۔ ایران ادب سے جسم کے رشتے استوار کر کے ناکام رہے گا۔ ایران کا ضمیر بھوکا ہے۔'

''عابدی مرحوم کی دور رس نگاہوں کی اس پیش بینی کا بیشتر حصہ صد در صد درست ثابت ہوا ہے۔ اس وقت فکر اقبال کی پذیرائی کے لیے وہاں کا ماحول سازگار ترین ہے، گویا یہ پیش گوئی اپنے تکمیلی مراحل میں ہے۔[9]''

گویا غالب کا ہم زبان ہو کر کہا جا سکتا ہے کہ

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کُل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

عابدی صاحب کا ایک پسندیدہ موضوع الفاظ و تراکیب کی تاریخ اور ان کا تجزیہ تھا۔ معانی کے تعین اور تحدید میں بہت کم لوگوں کو اتنا درک حاصل ہوتا ہے۔ فرماتے تھے کہ ایک ہی زبان میں ایک شے کے لیے ایک سے زیادہ الفاظ کا وجود اس زبان کی عیاشی کے ذیل میں آتا ہے اور یہ بنیادی لسانی اصول کے خلاف ہے۔ اس بنا پر آج ایک زبان کے جن الفاظ کو ہم مترادفات کا درجہ دیتے ہیں وہ ابتدا میں کسی خفیف اور لطیف فرق کے حامل ہونے کے باعث وجود میں آئے تھے۔ متاخرین نے سہل انگاری کے باعث انہیں مترادف قرار دے ڈالا۔ البتہ کسی زبان میں دوسری

زبانوں سے در آنے والے الفاظ ہم معنی ہو سکتے ہیں جیسے اردو میں ایک دیسی، ایک فارسی، ایک عربی اور دورِ جدید میں کوئی انگریزی لفظ مترادفات کی تعریف پر پورا اتر سکتے ہیں۔

علم دوستی عابدی صاحب کی سرشت میں داخل تھی۔ عالم کے حاسد بھی بہت ہوتے ہیں۔ عابدی صاحب کو بھی قدم قدم پر ان کا سامنا ہوتا تھا لیکن وہ شہر غیب کے مسافر کی طرح اپنی ہی دھن میں رواں دواں رہتے تھے۔ ایک دن مجھ سے فرمایا: ''وہ جو انگریزی محاورہ ہے کہ نیکی خود اپنا انعام ہوتی ہے تو اسی طرح علم بھی اپنا صلہ آپ ہوتا ہے۔ صاحب علم کو نہ دولت میسر آتی ہے نہ شہرت، نہ ہی اس کو ان چیزوں کی خواہش کرنی چاہیے، ورنہ وہ عالم بننے کا مستحق نہ ہوگا۔'' پھر نہ جانے کیا خیال آیا، کہنے لگے: ''آپ کے خاندان میں ایک فرد ضرور ایسا ہونا چاہیے جو اپنے آپ کو خدمت و اشاعت علم کے لیے وقف کر دے تاکہ خاندان کی علمی روایت کا تسلسل قائم رہے۔''

مثل مشہور ہے کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ علم بھی اسی زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ یہی حالت عابدی صاحب کی تھی۔ لاہور اور بیرون لاہور کے اہل علم ان کا نام احترام سے لیتے تھے۔ پاکستان کے علاوہ ہندوستان اور ایران کے علمی حلقوں میں ان کے نام کا طوطی بولتا تھا۔ مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ جسٹس ایس اے رحمٰن، ایس ایم اکرام اور پروفیسر حمید احمد خاں جیسے زعما علمی معاملات میں عابدی صاحب سے استفادہ کرتے رہتے تھے اور ان کی رائے کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ جب پروفیسر فیروز دین رازی صاحب نے شاہ ایران کی مدح میں قصیدہ لکھا اور انہیں نشان سپاس عطا کیا گیا تو لاہور کے اخباروں میں چرچا ہوا۔ ان دنوں اتفاق سے احمد ندیم قاسمی صاحب کا کسی تقریب میں رازی صاحب سے سامنا ہو گیا۔ قاسمی صاحب نے انہیں چھیڑا: ''آج کل تو آپ اخباروں میں چھائے ہوئے ہیں۔'' رازی صاحب نے جواب دیا: ''بس جی، ہم تو اندھوں میں کانے راجا ہیں۔'' قاسمی صاحب کب چوکنے والے تھے، بولے: ''بیناؤں میں کانے راجا کہیے۔'' رازی صاحب نے پوچھا: ''بینا کون ہے؟'' جواب ملا: ''یہ آپ بھی جانتے ہیں۔'' مجھے قاسمی صاحب نے بتایا تھا کہ ان کی مراد عابدی صاحب سے تھی۔

عابدی صاحب کی رنگت مائل بہ ملاحت، قد نکلتا ہوا اور جسم متناسب تھا۔ پہلے کلین شیو ہوا کرتے تھے، بعد میں فرنچ کٹ ڈاڑھی رکھ لی تھی جو ان کے چہرے پر بڑی پروقار معلوم ہوتی تھی۔ جامہ زیب آدمی تھے اور لباس کے معاملے میں بڑے سلیقہ شعار۔ سوٹ اور شیروانی دونوں ان پر سجتے

تھے۔ علم واخلاق کی آمیزش نے ان کی شخصیت میں ایک مقناطیسی کشش پیدا کردی تھی۔ علم کی طرح ان کا اخلاقی معیار بھی نہایت بلند تھا۔ جو بھی ایک بار ملتا اور ان کی گفتگو سن لیتا گرویدہ ہو جاتا تھا۔

اگرچہ باقاعدہ شاعر نہ تھے تاہم فارسی میں بے عیب شعر کہتے تھے۔ خدابخش لائبریری سے استفادہ کی خاطر پٹنہ کے عارضی قیام کے دوران قاضی صاحب نے انہیں آموں کی ٹوکری بھجوائی تھی۔ عابدی صاحب نے غالب کی طرح ایک فارسی قصیدہ نما نظم میں اظہار تشکر کیا۔ یہ نظم پروفیسر سید حسن عسکری نے قاضی صاحب کو پہنچائی تھی (''ہندوستان کے عہد وسطیٰ پر مقالات'' ص ۵۰۵)۔ ان کی بعض نظمیں فارسی کے سرکاری مجلّے ''ہلال'' میں چھپی تھیں۔ ان میں ''نغمۂ پاک'' کے عنوان سے ایک نظم، ان کے جذبۂ حب الوطنی کی آئینہ دار ہے۔ اس کا ابتدائی شعر ہے:

ای پاک زمین ای کشور من، ای مولد من منشای من
ای مسکن من ای مامن من، ای سایہ ی فضل خدای من[۱]

مسلکاً اثنا عشری تھے[۲]۔ بلکہ ان کا شمار مذہبی علما میں بھی ہوتا تھا۔ معروف عالم حافظ کفایت حسین اور عابدی صاحب ایک دوسرے کا بڑا احترام کرتے تھے۔ تاہم اپنی منصبی اور علمی مصروفیات کے باعث انہیں مذہبی اجتماعات میں شریک ہونے کا موقع کم ملتا تھا۔ ایک روز میں اور اشتیاق حسن خاں ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک صاحب انہیں کسی مجلس میں شرکت اور خطاب کی دعوت دینے آئے۔ کہنے لگے: ''ہم نے بالکل لکھنؤ کی طرز پر مجلس کا اہتمام کیا ہے۔ آپ ضرور شمولیت کیجیے گا۔'' عابدی صاحب نے عدم فرصت کا عذر کیا۔ وہ صاحب اصرار کرنے لگے: ''آپ تشریف لا کر تو دیکھیے۔ بالکل لکھنؤ کے انداز میں مجلس برپا ہوگی۔ آپ خوش ہو جائیں گے۔'' عابدی صاحب نے مسکرا کر ہم دونوں کی طرف دیکھا اور ان صاحب سے مخاطب ہو کر بولے: ''پھر تو آپ نے لڑوانے کا اہتمام بھی کیا ہوگا؟'' ساتھ ہی ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔ وہ صاحب شرمندہ ہو کر چلے گئے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ بلند پایہ عالم اور محقق و ناقد ہونے کے باعث وہ مذہبی پس منظر کی حامل روایات کو بھی جرح و تعدیل کی کسوٹی پر جانچنے کے بعد ان کے رد و قبول کا فیصلہ کرتے تھے۔ درج ذیل واقعہ اس کا روشن ثبوت ہے۔ ایک بار کلاس میں گفتگو کے دوران ''غدیر'' کا لفظ آ گیا۔

انہوں نے اس کے معنی اور استعمال کی صراحت کرتے ہوئے ''عید غدیر'' کا تعارف بھی کرایا اور پھر کہنے لگے: ''ایک روایت کے مطابق غدیر کے موقع پر رسول اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ علیؓ میرے جانشین ہوں گے۔ تاہم یہ روایت تحقیق کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔ فرض کیجیے آپؐ نے یہ فرمایا بھی ہو تو علیؓ جانشین تو ہو گئے البتہ چوتھے نمبر پر ہوئے۔'' ظاہر ہے کہ کوئی اور شخص کلاس میں اس اظہار کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

شاعر حضرات رعب حسن کا ڈنکا تو پیٹتے رہتے ہیں لیکن سچ پوچھیے تو علم کا رعب بھی کچھ کم نہیں ہوتا۔ اس کا بھرپور تجربہ مجھے عابدی صاحب کی موجودگی میں ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس میں میری کم علمی کا بھی دخل تھا۔ بہرحال میں ان کے سامنے بہت ضروری بات کم سے کم الفاظ میں کیا کرتا تھا۔ اس معاملے میں دو اشخاص پر مجھے بڑا رشک آتا تھا۔ ایک تو میرے ہم جماعت حسن بھائی (اشتیاق حسن خاں) جو ایک ناصح مشفق کے انداز میں دنیاداری کے معاملات پر عابدی صاحب کو مشورے دیتے رہتے تھے۔ ان کا زیادہ زور اس بات پر ہوتا تھا کہ عابدی صاحب کرائے کے مکان میں رہنے کے بجائے اپنے ذاتی مکان کا بندوبست کریں۔ بصورت دیگر ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد ان کو بڑی تکلیف ہوگی۔ اس مشورے کا واحد سبب حسن بھائی کا عابدی صاحب سے خلوص اور خیر خواہی کا جذبہ تھا۔ یوں بھی عابدی صاحب فنافی العلم ہونے اور اپنے بلند اخلاقی معیار کے باعث داد و ستد کے مسائل سے بالکل نابلد تھے۔ اس کا اندازہ درج ذیل مثال سے لگایا جا سکتا ہے۔

جن دنوں ہم لوگ اورینٹل کالج کے طالب علم تھے اسی عرصے میں عابدی صاحب نے کالج آمد و رفت میں سہولت اور تاخیر سے بچنے کی غرض سے ایک استعمال شدہ کار خرید لی۔ فروخت کنندہ نے یہ پیشکش بھی کی کہ چھ ماہ تک گاڑی میں کوئی نقص پیدا ہونے کی صورت میں وہ اپنے گیراج کی ورکشاپ میں اس کی بلا معاوضہ مرمت کروائے گا۔ عابدی صاحب نے بغیر بھاؤ تاؤ کیے منہ مانگی قیمت ادا کر دی اور بغیر کسی لکھت پڑھت کے گاڑی لے آئے۔ ایک ڈرائیور رکھ لیا تھا جو انہیں کالج لاتا اور واپس لے جاتا تھا۔ ہمیں ادھر ادھر سے پتا چلا کہ ڈرائیور صاحب اپنے مالک کی سادہ لوحی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پٹرول وغیرہ کے خرچ کے بہانے ہاتھ رنگا کرتے تھے۔ دو ایک بار چھوٹی موٹی خرابی ہوئی۔ تیسرے مہینے گاڑی کے انجن نے جواب دے دیا۔ گاڑی اسی گیراج میں بھجوائی

گئی۔ گیراج کے مالک نے مرمت کے بہانے دو تین ہفتے گزار دیے اور بالآخر صاف جواب دے دیا کہ گاڑی تو میری ہے، میں آپ کو جانتا تک نہیں۔ اگر آپ نے بقول آپ کے یہ خریدی تھی تو کوئی تحریر یا رسید دکھایئے۔ نتیجہ یہ کہ عابدی صاحب گاڑی چھوڑ کر خاموشی سے لوٹ آئے۔

دوسرے صاحب جو عابدی صاحب کے ساتھ بڑی بے تکلفی سے باتیں کرتے تھے، صوفی محمد افضل فقیر[1] تھے۔ وہ نام ہی کے نہیں عملی اعتبار سے بھی صوفی تھے۔ راہ سلوک کی منزلیں طے کرتے کرتے ایک وقت ایسا آیا کہ انہوں نے کالج میں فارسی کے استاد کی ملازمت سے استعفیٰ دے کر کالا خطائی کے قریب جنگل میں ڈیرہ لگا لیا اور وہیں ان کا مزار ہے، جہاں ان کا عرس بڑی شان سے منعقد ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ ان کے مرید ہیں۔ صوفی صاحب نابغہ آدمی تھے۔ اردو، فارسی اور عربی زبان کے شاعر اور عمدہ نعت گو تھے۔ وہ ۵۷-۱۹۵۵ء میں عابدی صاحب کے شاگرد رہ چکے تھے۔ استاد شاگرد کے درمیان قلبی اور روحانی تعلق بھی تھا۔ اس کی تصدیق میری موجودگی میں ہونے والے اس مکالمے سے ہوتی ہے۔ صوفی صاحب شیخوپورہ کالج سے عابدی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کے بعد چھوٹتے ہی پوچھا:

''اس سال کلاس کو کیا پڑھا رہے ہیں؟''

''جامی پڑھا رہے ہیں۔''

''رومی کیوں نہیں پڑھا رہے؟''

''آپ کے جانے کے بعد کلاس میں کوئی اہل دل نظر نہیں آتا اس لیے نہیں پڑھا رہے۔''

سالانہ امتحان قریب آیا تو ہمیں تیاری کے لیے فری کر دیا گیا۔ چند دنوں بعد میں کسی کام سے کالج گیا تو عابدی صاحب سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ فرمانے لگے: ''آپ کہاں رہتے ہیں؟ کلاس میں کیوں نہیں آتے؟ ہمیں آپ کی کمی محسوس ہوتی ہے۔'' ان کی تشویش بجا تھی۔ مجھے ان کی کلاس میں بیٹھتے چھ سات ماہ ہی ہوئے تھے۔ سال پنجم اور سال ششم کے اکٹھے بیٹھنے کی وجہ سے انہیں خیال ہی نہیں تھا کہ میں نے سال ششم میں داخلہ لیا تھا۔ میں نے صورتحال بتائی تو انہیں دکھ ہوا۔ بڑی دردمندی سے کہنے لگے: ''دراصل علم کا حصول استاد کا مرہون منت ہوتا ہے۔ یوں تو لوگ پرائیویٹ طور پر بھی امتحان پاس کر لیتے ہیں تاہم ان کا علم خام رہ جاتا ہے۔ اسی لیے ہمارے معاشرے میں بے استاد اور بے پیر ایک قسم کی مہذب گالی ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ اس

سال امتحان نہ دیں۔ مزید ایک سال ہمارے ساتھ رہیں اور آئندہ سال امتحان میں بیٹھیے۔'' یہ میرے دل کی بات تھی لیکن آدمی کی مجبوریاں ہوتی ہیں چنانچہ عرض کیا: ''آپ کا فرمانا عین حقیقت ہے تاہم مسئلہ یہ ہے کہ اپنے خاندان کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر ہے اور میرے لیے، شدید خواہش کے باوجود مزید ایک سال قیام ممکن نہ ہوگا۔'' اس پر انہوں نے ایک سرد آہ بھری اور بڑی حسرت سے کہا: ''بس یہاں آکر ہماری سب دلیلیں جواب دے جاتی ہیں۔'' پھر کچھ سوچ کر بولے: ''اچھا ہم سے ایک وعدہ کیجیے۔ ہر پرچہ دینے کے بعد ہمیں آکر بتایا کیجیے کہ پرچہ اچھا ہو گیا ہے اور اگر خدانخواستہ کوئی پرچہ خراب ہو تو اس کے بعد کے پرچے آپ چھوڑ دیں گے اور آئندہ سال پوری تیاری سے امتحان دیں گے۔'' میں نے وعدہ کر لیا۔

پہلے دو تین پرچوں تک تو خیریت رہی۔ تاریخ ادبیات ایران کا پرچہ میاں شکور احسن صاحب کا تھا۔ اس میں پانچ سوالات کے جواب لکھنے تھے۔ تین سوال تو حسب دلخواہ لکھے۔ چوتھا سوال ابھی نامکمل تھا کہ وقت ختم ہو گیا۔ اس روز میں عابدی صاحب کے پاس نہیں گیا۔ باقی پرچوں کے بعد بھی جاتا رہا۔ ساتواں اور آخری پرچہ (فارسی مضمون نویسی اور گفتگو) خود عابدی صاحب کا تھا۔ سات آٹھ عنوانات میں سے کسی ایک پر مضمون لکھنا تھا۔ ان میں ایک موضوع حافظ شیرازی تھے اور ایک عمر خیام۔ ہاں ایک موضوع دور جدید میں سائنس کی ترقی بھی تھا۔ زبانی گفتگو چند روز بعد ہونا تھی۔ تحریری امتحان سے فارغ ہو کر ہم چھ سات طلبہ اکٹھے عابدی صاحب کی خدمت میں پہنچے۔ میں نے عرض کیا کہ میں نے عمر خیام پر لکھا ہے۔ باقی طلبہ نے بھی حافظ اور خیام کا نام لیا۔ ایک نے کہا کہ میں نے سائنس کی ترقی پر لکھا ہے۔ عابدی صاحب نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا: ''جو صاحب ذوق ہو گا وہ تو حافظ پر لکھے گا یا خیام پر لکھے گا اور جو کور ذوق ہو گا وہ بھینس پر لکھے گا۔''

عابدی صاحب امتحانات کے معاملے میں بڑے بااصول تھے اور سفارش کے سخت خلاف تھے۔ جس دن زبانی امتحان ہونا تھا اس روز صبح وہ کالج پہنچے تو ہماری کلاس کے ایک طالب علم نے ان سے کوئی غیر متعلق سا سوال پوچھ لیا۔ عابدی صاحب نے ان الفاظ میں اس کو تنبیہ کی: ''یاد رکھیے، آج وہ عابدی نہیں ہے جو آپ کو پڑھایا کرتا ہے'' اور اپنے کمرے میں داخل ہو گئے۔ اس سے ان کی احتیاط کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ہمارے امتحانات ختم ہونے سے لے کر نتیجہ نکلنے تک دو

تین ماہ کا عرصہ تھا۔ اس اثنا میں جی چاہنے کے باوجود میں اور حسن، عابدی صاحب سے ملاقات کی جرأت نہ کر سکے۔ جب نتیجہ نکلنے کو ہوا تو ایک روز حسن بھائی کے سکوٹر پر ہم دونوں جیل روڈ کے نواح میں ان کی قیام گاہ پر پہنچے۔ وہ ایک کوٹھی کی دوسری منزل پر مقیم تھے۔ بڑی محبت سے ملے۔ کہنے لگے: ''آپ بہت دنوں بعد آئے ہیں۔'' ہم نے وجہ بتائی تو مسکرا کر بولے: ''جی ہاں، قانون کی پابندی میں بھی ایک لذت ہوتی ہے۔''

چند دن بعد نتیجہ کا اعلان ہوا۔ اتفاق سے یونیورسٹی کے ریگولر طلبہ میں سے صرف میں درجہ اوّل میں پاس ہوا تھا۔ اگلے دن لاہور پہنچا۔ مال روڈ پر بس سے اتر کے اورینٹل کالج جانے کے لیے یونیورسٹی سے گزر رہا تھا کہ سینیٹ ہال کے سامنے عابدی صاحب مل گئے۔ مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھے، بے اختیار سینے سے لگا لیا اور کہنے لگے: ''واہ وا، واہ وا، آپ نے تو اپنے کالج کی عزت بھی رکھ لی اور اپنے خاندان کی عزت بھی۔'' پھر مجھے اپنے ساتھ کمرے میں لے گئے اور کتنی دیر تک شفقت آمیز گفتگو کرتے رہے۔

اکتوبر ۱۹۶۰ء میں میرا تقرر بطور لیکچرار، گورنمنٹ ڈگری کالج مظفر گڑھ میں ہو گیا۔ مہینے دو مہینے بعد جب لاہور آنا ہوتا تو عابدی صاحب کی خدمت میں ضرور حاضری دیتا۔ اگلے سال بی اے (فارسی) کے پرچوں کا ممتحن مقرر ہوا۔ صدر ممتحن رازی صاحب تھے۔ اس سلسلے میں دو ایک بار مظفر گڑھ سے ان کے پاس آنا پڑا۔ وہ بیڈن روڈ پر رہتے تھے۔ ایک ایسے ہی موقع پر دوران گفتگو وہ بڑی دور کی کوڑی لائے۔ فرمانے لگے: ''یہ جو حافظ محمود شیرانی نے اتنا تحقیقی کام کیا ہے تو میرا خیال ہے کہ انہیں قیام انگلستان کے زمانے میں یہ سب باتیں پروفیسر براؤن نے بتائی ہوں گی۔'' مجھے ان کی کم علمی پر بڑا تعجب ہوا۔ وہاں سے اٹھ کر میں حسب معمول عابدی صاحب کے سلام کو پہنچا اور بر سبیل تذکرہ رازی صاحب کا انکشاف بھی ان کے گوش گزار کیا۔ وہ یہ بات سن کر سناٹے میں آ گئے۔ اتنی دیر تک خلا میں تکتے رہے کہ میں اپنے کہے پر پشیمان ہوا۔ خاصی دیر بعد بڑے دکھ سے گویا ہوئے: ''اگر آج کوئی شخص اس قسم کی بے سروپا باتوں سے حافظ محمود شیرانی یا مولانا شبلی نعمانی کی تخفیفِ شان کی کوشش کرے تو اس کی مثال یوں ہے جیسے اہرام مصر کے پاس سے کوئی شتر سوار گزر جائے۔''

عابدی صاحب کی زندگی رسول اکرمؐ کے اس قول کا جیتا جاگتا نمونہ تھا کہ ''دنیا مومن کے

لیے قید خانہ ہے''۔ سوائے ان معدودے چند لوگوں کے جو ان کے علم کے قدردان اور ان کی اخلاقی عظمت کے پرستار تھے، انہیں کسی طرف سے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا نہیں آتا تھا۔ ان کے شاگرد، الا ماشاء اللہ، ان موتیوں کی قدر ہی نہیں جانتے تھے جو وہ علم کے سمندر میں غوطے لگا کر نکالتے تھے۔ ساتھی اساتذہ کا ان کے ساتھ سلوک برادران یوسف کی یاد تازہ کرتا تھا اور وہ بہ زبان حال یہ کہنے میں حق بجانب تھے کہ

مری فکر مقہور اہل السنبیل
مرا کعبہ محصور اصحاب فیل

حرص و حسد اور مکر و ریا سے مملو معاشرے میں ان جیسے شخص کی مطلق سمائی نہ تھی۔ ان سب باتوں پر مستزاد قدرت کی ستم ظریفی کہ وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھے یعنی:

درازی شب و بیداری من این همه نیست
زبخت من خبر آرید تا کجا خفتست[۱۱]

اس محرومی کے ازالے کی خاطر عابدی صاحب کی اہلیہ نے انہیں عقد ثانی کی اجازت دی۔ عابدی صاحب کی دوسری بیگم اورینٹل کالج میں زیر تعلیم اور خود ان کی شاگرد رہ چکی تھیں۔ یہ شادی کیا ہوئی بدخواہوں نے ایک طوفان بے تمیزی برپا کر دیا، گویا:

دل حسرت زدہ تھا مائدۂ لذّت دَرد کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

ان لوگوں میں حسب توقع رازی صاحب پیش پیش تھے۔ ایران میں شاہ کی حکومت اور روشن خیالی کا دور دورہ تھا۔ مغرب زدگی کے نتیجے میں عقد ثانی کو سخت ناپسندیدہ اور ناجائز تعلقات کو فیشن سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ وہاں سے آنے والے وفود اور انفرادی حیثیت میں آنے والے حضرات سے رازی صاحب التزاماً ملتے اور عابدی صاحب کے اس ناقابل معافی جرم کی مذمت کرتے۔ اس صورت حال میں ہم لوگ کڑھنے کے سوا کیا کر سکتے تھے۔ ایک بار جب تنگ آ کر حسن بھائی نے رازی صاحب کی ان حرکتوں کا عابدی صاحب سے تذکرہ کیا تو انہوں نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ

غیبت سے بچائے۔ ہمیں ایران سے آنے والے دوستوں کے سامنے ایک دوسرے کے نجی معاملات زیر بحث نہیں لانے چاہئیں۔"

دوسری بیگم سے خدائے بزرگ و برتر نے عابدی صاحب کو تین پھول سے بچے عطا کیے۔ انہوں نے بڑے بچے کا نام فرخ اور اس سے چھوٹے کا فراز رکھا۔ تیسری بچی تھی جس کا نام اس وقت ذہن میں نہیں آ رہا۔ ایک موقع پر انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ فرخ اور فراز دراصل عربی اسماء حسن اور علی کے فارسی متبادل ہیں۔ اسی اثنا میں عابدی صاحب نے سمن آباد میں بڑ والے تراہے سے تھوڑی دور جنوب کی سمت جانے والی سڑک پر ایک بنا بنایا مکان بھی خرید لیا جس کا نمبر ۵۹ این تھا۔ مناسب بھی یہی تھا کیونکہ پلاٹ خرید کر اس پر مکان تعمیر کرنا عابدی صاحب کے بس کا روگ نہ تھا۔ انہوں نے مکان کے گیٹ پر ایک لوح نصب کروائی جس پر "فرخ فراز منزل" کے الفاظ درج تھے۔ میں اور حسن بھائی اس مکان پر عابدی صاحب کی خدمت میں بدستور جایا کرتے تھے۔

ڈاکٹر ناظر حسن زیدی گورنمنٹ کالج شیخوپورہ میں فارسی کے استاد تھے۔ میری ان سے پہلی ملاقات یہیں ہوئی تھی۔ ان کی ڈاکٹریٹ اردو میں تھی۔ فروری ۱۹۶۳ء میں ڈاکٹر سید عبداللہ انہیں کھینچ کر اورینٹل کالج میں بطور لیکچرار اردو لے آئے۔ زیدی صاحب بڑے کثیر المطالعہ اور فاضل شخص تھے۔ حافظہ بہت اچھا تھا۔ کسی موضوع پر اردو اور فارسی اشعار سنانے لگتے تو سلسلہ ختم ہونے میں نہ آتا۔ مئی ۱۹۶۳ء میں مَیں مظفر گڑھ سے شیخوپورہ (انٹر کالج) آ گیا۔ اب لاہور نزدیک تھا۔ میں جب بھی جاتا اورینٹل کالج میں عابدی صاحب سے ملنا نہ بھولتا۔ وہاں زیدی صاحب سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ وہ اکثر میرے ساتھ ہی عابدی صاحب کے پاس جا بیٹھتے اور کوئی علمی موضوع چھیڑ دیتے۔ پھر عابدی صاحب کی گل افشانی گفتار کا عالم دیدنی اور شنیدنی ہوتا۔ میں تو چپکا بیٹھا رہتا مگر زیدی صاحب جھومتے رہتے اور داد تحسین دیتے جاتے۔ ایک دن عابدی صاحب بعض الفاظ کی تاریخ اور ان کے معانی کے ارتقا پر اظہار خیال کر رہے تھے۔ زیدی صاحب اتنے متاثر ہوئے کہ بے اختیار پکار اٹھے: "عابدی صاحب! ہم آپ کے سامنے کچھ بھی نہیں ہیں۔ ہم آپ کے پیروں کی خاک کے برابر بھی نہیں ہیں۔"

حزیں کاشمیری صاحب کے تحریر کردہ خاکوں کا مجموعہ "کہاں گئے وہ لوگ" ستمبر ۲۰۰۵ء میں لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اس میں ایک مضمون ڈاکٹر ناظر حسن زیدی صاحب پر بھی ہے۔ اس میں

ایک واقعہ ان الفاظ میں درج ہے:

''ایک دن دکان پر تشریف لائے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ آپ کے مزاج کی وہ کیفیت نہیں جو عموماً ہوا کرتی ہے۔ ان کے چہرے اور باتوں سے خفگی کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے بہ اصرار اس کا سبب پوچھا تو فرمایا: 'اورینٹل کالج میں ایک ادبی مسئلے پر عابدی صاحب سے تکرار ہوگئی تھی۔ مجھے چند کتابوں کے حوالے دے کر کہنے لگے کہ ان تک شاید میری دسترس نہیں۔ اس پر میرا مزاج برہم ہوگیا اور ان سے اتنا کہہ کر لوٹ آیا، بس حضرت رہنے دیجیے۔ مدت ہوئی ان کتابوں کے مطالعہ سے گزر چکا ہوں۔ آپ اپنا علم اپنے پاس ہی رہنے دیجیے۔'

''ناظر صاحب سے زندگی میں جتنا عرصہ میرا تعلق رہا، بس ان کی خفگی کا یہی واقعہ میری نظر سے گزرا۔ اس کے علاوہ میں نے کبھی ان کی زبان سے ایسے کلمات نہ سنے۔'' (ص ۸۲۰)

حزیں کاشمیری صاحب کے بیان کردہ واقعے اور میرے ذاتی مشاہدے میں جو تضاد تھا اس سے مجھے اچنبھا ہوا۔ میں نے بعض دوستوں سے بات کی کہ شاید وہ اس معاملے پر روشنی ڈال سکیں تاہم صرف ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب نے بتایا: ''جب میں سرگودھا میں تھا تو ایک بار غالباً ۱۹۶۴ء میں ڈاکٹر ناظر حسن زیدی کسی تقریب سے وہاں گئے تھے اور رات کو قیام کیا تھا۔ چاندنی رات میں ہم دونوں کالج کے سبزہ زار میں دیر تک ٹہلتے رہے۔ اس چہل قدمی کے دوران میں نے ان سے 'شاہنامہ فردوسی' کے کچھ اشعار کا ذکر کیا جن میں قدیم محاوروں کے باعث گنجلک تھی۔ زیدی صاحب نے ان کی مختصر الفاظ میں صراحت کی اور پھر کہا کہ ان ابیات کی سیر حاصل شرح کا حق ہمارے استاد پروفیسر علامہ سید وزیر الحسن عابدی ہی ادا کر سکتے ہیں۔''

اس بات سے تو میرے تجربے کی تائید ہوتی تھی تاہم اصل عقدہ وا نہ ہوسکا۔ آخر طویل غور فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ عابدی صاحب سے زیدی صاحب کی تکرار کا واقعہ ان دنوں کا ہوگا جب وہ نئے نئے شیخوپورہ سے لاہور آئے تھے۔ ایک تو اس وقت تک وہ عابدی صاحب کے علمی مرتبے اور انداز گفتگو سے کماحقہ واقف نہ ہوں گے۔ دوسرے مجھے بخوبی علم ہے کہ اورینٹل کالج میں تدریس کے آغاز پر ایم اے (اردو) کے طلبہ نے انہیں خوش دلی سے قبول نہیں کیا تھا بلکہ کچھ مخالفت کا اظہار بھی ہوا تھا[۱۱]۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیدی صاحب کے دل کو ٹھیس پہنچی ہوگی۔ بس اسی آزردگی کے عالم میں ان کی عابدی صاحب سے تکرار ہوگئی ہوگی۔ پھر جلد ہی وہ ان کے

مخلصین اور محبین میں شامل ہو گئے۔

۱۹۶۶ء میں مجلس ترقی ادب کے زیر اہتمام ''مقالات حافظ محمود شیرانی'' کی پہلی دو جلدیں شائع ہوئیں۔ میں ان کا ایک ایک نسخہ لے کر عابدی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بڑے خوش ہوئے اور سرورق پر نظر ڈالتے ہی کتابوں کو پشت کی طرف سے کھول کر دیکھا۔ اشاریہ موجود پا کر انہیں اطمینان ہوا۔ فرمانے لگے: ''علمی کتابوں کے لیے اشاریہ جزو لازم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی موجودگی میں کتابوں سے استفادہ کرنے والوں کا بہت سا وقت بچ جاتا ہے۔''

بعد میں جب بھی اس سلسلے کی کوئی جلد چھپتی میں سب سے پہلے ان کے نذر کرتا۔ پانچویں یا چھٹی جلد لے کر گیا تو خوشی سے ان کا چہرہ تمتما اٹھا۔ دیر تک اظہار تحسین کرتے رہے۔ یہ بھی کہا: ''اگر آپ کسی علم دوست ملک میں ہوتے تو آپ کو ان مقالات کی ہر جلد پر ایک پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی جاتی۔ لوگ تدوین کے کام کو معمولی سمجھتے ہیں حالانکہ یہ تحقیق کا مشکل ترین شعبہ ہے۔''

جب پنجاب یونیورسٹی نے ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' کا منصوبہ شروع کیا تو اس کے مدیران میں عابدی صاحب بھی شامل تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ میں بھی اس کے لیے کسی موضوع پر کچھ لکھوں۔ چنانچہ ان کے ایما پر ڈاکٹر ناظر حسن زیدی صاحب نے ۲۶ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو مجھے درج ذیل مکتوب تحریر کیا:

''محب مکرم، تسلیم

یہ خط عجلت میں اور سخت ضرورت میں لکھ رہا ہوں اور آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا۔

عابدی صاحب نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ شعبۂ تاریخ ادبیات فارسی پنجاب یونیورسٹی کے لیے مغل عہد کی تاریخ پر یا فنون پر ایک مقالہ آپ سے لکھوائیں یا کوئی اور موضوع جو جناب کی طبیعت پسند کرے۔ اس مقصد کے لیے وہ آپ سے ملنے کے خواہش مند ہیں۔ جواب دیجیے اور ازرہ کرم اثبات میں دیجیے۔ مجھے انتظار رہے گا۔ امید ہے مزاج عالی بخیر ہوگا۔

خادم

ناظر حسن''

اور لفافے کی پشت پر یہ اضافی عبارت تھی:

''اگر ممکن ہو تو اس ہفتے کسی روز عابدی صاحب محترم سے مل لیجیے اور مضمون پسند کر لیجیے۔''

میں حسب ہدایت لاہور جا کر عابدی صاحب سے ملا۔ انہوں نے عہد مغلیہ میں کشمیر کے فارسی شعرا پر مضمون لکھنے کا حکم دیا۔ یہ مضمون تاریخ ادبیات کی چوتھی جلد میں شامل ہے۔

عابدی صاحب کو تدریسی ذمہ داریوں اور علمی مصروفیات کے باعث خط لکھنے کی فرصت کم ملتی تھی، اس کے باوجود اگر کوئی صاحب ان کو کسی استفسار وغیرہ کے لیے عریضہ لکھتا تو وہ اس کا جواب ضرور دیتے تھے۔ ہمارے دوست محمد احسن خاں صاحب علم کے سچے پرستار ہیں۔ انہوں نے مجھے اپنے نام عابدی صاحب کا ۱۹۷۲ء کا نوشتہ ایک پوسٹ کارڈ دکھایا ہے۔ تقریب یہ تھی کہ عابدی صاحب کا مرتبہ ''کلیات غالب'' (فارسی) ''میری لائبریری'' والوں نے چھاپا تھا۔ بعدازاں غالب صدی کے موقع پر مرتب کی نظر ثانی کے بعد یہ کلیات پنجاب یونیورسٹی کے ادارۂ یادگار غالب نے شائع کیا۔ ان دونوں اشاعتوں کے متن میں جو فرق تھا وہ محمد احسن خاں صاحب کی دقیقہ رس نظر سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ چنانچہ انہوں نے بغیر کسی سابقہ تعارف کے عابدی صاحب کے نام خط لکھا جس میں اس اختلاف متن کے بارے میں کچھ باتیں پوچھی تھیں۔ جوابی خط میں عابدی صاحب نے خان صاحب کو ملاقات کی دعوت دی تاکہ مفصل گفتگو ہو سکے۔ یہ خط بطور تبرّک میں یہاں درج کرتا ہوں:

''باسمہ سبحانہ

فرخ فراز منزل

سمن آباد، لاہور

۱۷ جولائی ۱۹۷۲ء

وعلیکم السلام

گرامی نامے کا مضمون پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی (کہ) ہمارے معاشرے میں ایسے سرمست سخن حضرات موجود ہیں جن کی تیز نگاہ ہر حرف کی تہہ تک پہنچ سکتی ہے۔ کوئی راز ان سے چھپ نہیں سکتا۔ دوسری خوشی

اس بات کی کہ ایسے ہی لوگ کسی ہنر کی داد بھی دے سکتے ہیں۔آپ سے ملنے کو دل چاہتا ہے۔عزت افزائی فرمایئے۔میں روز نماز صبح کے بعد کے وقت سے دفتر جانے کے وقت تک اور سہ پہر کو ساڑھے چار بجے سے مغرب کے وقت تک آپ کا چشم براہ رہوں گا۔خار رہت بپای عزیزاں خلیدہ باد۔

مفصل جواب عندالملاقات۔ان شاءاللہ

والسلام

خیراندیش وزیرالحسن''

عابدی صاحب نے خاصا تحریری کام اپنی یادگار چھوڑا ہے جس کا بیشتر حصہ ترتیب وتدوین پر مشتمل ہے۔اس کا آغاز ان کے لاہور آنے کے بعد جلد ہی ہو گیا تھا۔۱۹۵۴ء میں انہوں نے ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے ساتھ ''ارمغان علمی'' کی ترتیب میں حصہ لیا۔غالب کی ''باغ دودر'' کا متن دو قسطوں میں اورینٹل کالج میگزین میں چھپا۔اگست ۱۹۶۰ء کے پرچے میں حصہ نظم اور اگست ۱۹۶۱ء کے شمارے میں حصہ نثر۔بعدازاں اورینٹل کالج کے صد سالہ جشن تاسیس کے موقع پر ان دونوں حصوں کو تعلیقات کے ساتھ جولائی ۱۹۶۸ء میں یکجا چھاپا گیا تاہم اس پر تاریخ اشاعت ۱۹۷۰ء درج ہے۔

۱۹۶۷ء میں شہنشاہ ایران کی تاج پوشی پر عابدی صاحب نے اورینٹل کالج میگزین میں ۱۹۲۵ء سے ۱۹۶۷ء تک شائع ہونے والے فارسی زبان وادب سے متعلق مقالات کا انتخاب کیا۔ یہ دو جلدوں کی صورت میں جامعہ پنجاب کے زیراہتمام اشاعت پذیر ہوا۔اسی سال یونیورسٹی نے ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کی مرتبہ ''وامق وعذرای عنصری'' شائع کی تو عابدی صاحب نے مولوی صاحب کے تحریر کردہ اردو مقدمہ کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اس پر اضافے بھی کیے۔پنجاب یونیورسٹی نے غالب کی صد سالہ برسی کی مناسبت سے پروفیسر حمید احمد خاں کی صدارت میں مجلس یادگار غالب قائم کی۔۱۹۶۹ء میں اس مجلس کی طرف سے متعدد کتابیں شائع کی گئیں جن میں غالب کے اردو و فارسی متون بھی شائع تھے۔ان میں سے تین متن یعنی غزلیات غالب فارسی، سبد چین اور پنج آہنگ کی تصحیح وترتیب کا کام عابدی صاحب نے انجام دیا۔اسی سال ان کی مرتبہ غالب کی ''گل رعنا'' جامعہ پنجاب ہی کے ''ادارۂ تحقیقات پاکستان'' کے اہتمام سے چھپی۔

کلیات غزلیات خسرو کی جمع آوری اور تصحیح کا کام اقبال صلاح الدین نے کیا تھا۔ یہ چار جلدوں میں پروفیسر عابدی صاحب کی تجدید نظر کے ساتھ پیکجز لمیٹڈ، لاہور نے اگست ۱۹۷۳ء تا اگست ۱۹۷۵ء شائع کیں۔ ان کاموں کے علاوہ عابدی صاحب کے متعدد علمی مقالات بھی مختلف جرائد میں چھپتے رہے۔ اس پر مستزاد تحقیقی کام کرنے والے اشخاص کی بھرپور لیکن خاموش اعانت کی مصروفیت تھی۔ با ایں ہمہ کہا جا سکتا ہے کہ عابدی صاحب اپنے علم و فضل کے شایان شان کوئی نمایاں کارنامہ انجام نہ دے سکے۔ اس کی وجوہ تھیں۔ ایک تو ان کو چین سے علمی کام کرنے کا موقع ہی میسر نہ آ سکا۔ تحقیق جس یکسوئی اور فراغت کی متقاضی ہوتی ہے وہ ان کے لیے شجر ممنوعہ بنا دی گئی تھی۔ دوسرا سبب ان کی تکمیل پسندی کی عادت تھی۔ اسی بنا پر وہ ایران میں کئی سال گزارنے کے باوجود اپنی ڈاکٹریٹ مکمل نہ کر پائے۔ لاہور کی ملازمت کے دوران میں انہوں نے جتنے کام کیے (اور سبھی اسی عرصے میں کیے) ان میں سے شاید ہی کوئی ہو جس سے وہ خود مطمئن ہوں۔ وجہ یہ کہ قریب قریب یہ سب کام کسی تقریب اور جشن وغیرہ کی خاطر انجام دیے گئے تھے یا پھر ان کے منصبی تقاضوں کے تحت وجود میں آئے تھے۔

یہاں مجھے محبی رشید حسن خاں بے اختیار یاد آ رہے ہیں جنھوں نے ایک بار میرے نام ایک خط میں لکھا تھا:

''بھائی! یہ جو بڑے لوگ تھے، ان کے یہاں علم کی زیادتی نے ایک گوشہ مراق کے لیے بھی بنا دیا تھا۔ کسی نہ کسی شکل میں یہ بہتوں کے یہاں کارفرما رہا ہے۔ (عبدالستار) صدیقی صاحب کا احوال بھی یہی تھا۔ نتیجتاً کسی کام کو مکمل نہیں کر پاتے تھے۔ قاضی (عبدالودود) صاحب کے یہاں اس کی ایک دوسری صورت تھی۔ تکمیل ان کے یہاں بھی راہ دیکھتی رہ جاتی تھی۔ نو من تیل جمع ہوتا ہی نہیں تھا جو رادھا ناچے۔ کیسا یگانۂ روزگار شخص اور کیسے ناتمام کاموں میں پوری عمر گزار دی...... ذہن میں خوف رہتا تھا کہ لوگ اعتراض کریں گے اور یوں ایک ذہنی حصار میں پناہ گزین رہتے تھے۔

''ہاں صاحب، آپ تو بڑی شگفتہ نثر لکھتے ہیں۔ کیوں نہ بزرگان تحقیق کے اس مراق پر ایک انشائیہ نما تحریر لکھ دیں۔ وہاں بھی تو ایسے ایک دو بزرگوار رہے ہوں گے۔''

اللہ مجھے معاف کرے۔ منقولہ بالا سطور کا آخری فقرہ پڑھتے ہی مجھے عابدی صاحب یاد آئے تھے۔ اتنا ضرور ہے کہ عابدی صاحب کے معاملے میں یہ مراق ان کا اپنا کم اور زیادہ تر ان

کے مہربانوں کا عطا کردہ تھا۔ مجھے ایک ثقہ شخص نے بتایا کہ جب پنجاب یونیورسٹی کے مطبع میں عابدی صاحب کی مدونہ کتابیں چھپ رہی ہوتی تھیں تو ان کے معاندین ان کتابوں کے بیچ میں سے فرمے کھنچوا کر ضائع کرا دیتے تھے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون، بھلا اس ماحول میں وہ کیا علم کی خدمت کرتے اور کیا کارنامے انجام دیتے۔

عابدی صاحب ۳۰ ستمبر ۱۹۷۳ء کو اورینٹل کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ اس بائیس برس سے اوپر کے طویل عرصے میں وہ ترقی کے ایک درجے سے بھی محروم رہے۔ ڈاکٹر آغا سہیل مرحوم اپنی خودنوشت کے ایک ضمنی جملے میں اس افسوس ناک صورت کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

''پروفیسر وزیر الحسن عابدی، جو شیراز یونیورسٹی کے فیلو تھے، بلائے گئے اور تیس سال تک ریڈر رہنے کے بعد بیک بنی و دو گوش گھر بھیج دیا گیا۔''

(''خاک کے پردے'' لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۳۸۹)

کیا ہی اچھا ہوتا کہ انہیں کسی علمی تحقیقاتی ادارے کا سربراہ بنا کر ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جاتا لیکن نظر بہ حالات ایسا کیونکر ممکن تھا۔ غرض باقی ماندہ زندگی کے ایام انہوں نے گھر پر ہی گزار دیے۔ آخر آخر میں کچھ ذہنی اختلال کے آثار بھی نمودار ہو گئے تھے۔ کوئی عقیدت مند ملنے جاتا تو اس کے بے حد ممنون ہوتے اور ایسے مبالغہ آمیز الفاظ میں اظہار ممنونیت کرتے کہ آنے والا شرمسار ہو جاتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ عابدی صاحب کے ایمان کی پختگی، نیکی پر اعتماد اور اخلاق کی بلندی تھی جس کے باعث وہ اتنے طویل عرصے تک ثابت قدم اور سلیم الطبع رہے۔ اگر کسی اور شخص کو ان جیسے حالات کا سامنا کرنا پڑتا تو کب کا دیوانہ ہو چکا ہوتا۔ یہ بھی عبرتناک حقیقت ہے کہ جس جس شخص نے اس سیّد مظلوم کی مخاصمت میں جیسا اور جتنا کردار ادا کیا اسی تناسب سے اپنی زندگی ہی میں مکافات عمل کا مستوجب ٹھہرا:

گندم از گندم بروید، جو ز جو
از مکافات عمل غافل مشو[۱۵]

بالآخر ۲۹ جون ۱۹۷۹ء (۳ شعبان ۱۳۹۹ھ) کو زندگی کا سفینہ کنارے آ لگا۔ وفات کے وقت عیسوی تقویم کی رو سے عابدی صاحب کی عمر ساڑھے چونسٹھ برس تھی۔ روزنامہ ''نوائے

وقت'' (لاہور) میں ۳۰ جون کو ایک چھوٹی سی خبر چھپی:

''یونیورسٹی اورینٹل کالج کے پروفیسر وزیر الحسن عابدی آج یہاں ۶۶ برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔ وہ پاکستان میں فارسی زبان کے ماہر اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ انتہائی خوش خلق، مرنجان مرنج استاد کی وفات پر آج یہاں تعلیمی حلقوں میں گہرے رنج و غم کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ پروفیسر وزیر الحسن عابدی کا شمار ممتاز شیعہ علما میں بھی ہوتا ہے۔

''مرحوم کی رسم قل بروز اتوار شام پانچ بجے شیعہ جامع مسجد کرشن نگر میں ادا ہوگی۔ بعد ازاں مجلس عزا منعقد ہوگی۔ علامہ سیّد محمد جعفر زیدی فضائل و مصائب محمدؐ و اہل بیت محمدؑ علیہم السلام بیان کریں گے۔''

عابدی صاحب کی تدفین گورستان میانی صاحب میں ہوئی۔ ان کی تربت پر ایک بڑا کتبہ نصب ہے جو خطاط اعظم حافظ محمد یوسف سدیدی کے قلم معجز رقم کا شاہکار ہے۔ اس پر دو قطعات تاریخ کندہ ہیں۔ پہلا فارسی میں جو نو اشعار پر مشتمل ہے اور دوسرا دو اشعار پر مبنی اردو قطعہ۔ دونوں سے سنہ ۱۳۹۹ھ برآمد ہوتا ہے۔ استاد محترم و معظم کی وفات پر میں نے بھی پانچ شعروں کا ایک قطعہ بزبان فارسی کہا تھا جس کے کہیں چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ وہ یہاں درج کیے دیتا ہوں:

آہ سیّد وزیر الحسن عابدی — رخت بر بست زیں عالم رنگ و بو
عالم بے بدل، خلق او بے مثل — مشک بیز و سمن بار در گفتگو
مرقدش باد روشن ز انوار حق — رحمت بے کراں باد بر خاک اُو
بہر تاریخ ایں رحلت غم فزا — سر بزانو شدم تا کنم جستجو
ہاتف غیب آہے کشید و بگفت — ''رہگرائے بہشت بریں'' سال گو[۱۶]

آہ=۶ — ۱۴۰۵-۶=۱۳۹۹ھ

آج بھی جب وہ دن یاد آتے ہیں تو دل سے ایک ہوک اٹھتی ہے اور پردۂ تخیل پر کئی مناظر متحرک ہو جاتے ہیں۔ بقول شاعر:

صورتیں آنکھوں میں پھرتی ہیں وہ نقشے یاد ہیں
کیسی کیسی صحبتیں خواب پریشاں ہو گئیں

حواشی

۱- یہ پہلی کتاب بھی عجیب ہی تھی، کاغذ کے بجائے کپڑے پر چھپی ہوئی۔ نستعلیق کتابت ایسی دیدہ زیب کہ آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں۔ میرے والد اور غالباً دادا جان نے بھی اسی سے فارسی پڑھنے کی ابتدا کی تھی۔ میں نے اسے آج بھی سینت کر رکھا ہوا ہے۔

۲- ان دنوں یونیورسٹی لاء کالج بھی اسی عمارت میں تھا۔

۳- یہی حال عربی میں مولانا نور الحسن خاں کا تھا۔ وہ ہمارے ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ بھی تھے۔ ان دنوں وولنر (Woolner) ہوسٹل میں دو ترک طالب علم شوکت بولو (آج کل غالباً انقرہ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے سربراہ ہیں) اور عمر یلماز بھی مقیم تھے۔ یہ دونوں بیروت میں ایک عرصہ زیر تعلیم رہے تھے اور عربی خوب بولتے تھے۔ مغرب اور عشاء کے درمیان جب مولانا ہوسٹل کے دفتر میں، جو میرے کمرے سے متصل تھا، بیٹھتے تو یہ دونوں ان کے پاس پہنچ جاتے۔ دوران گفتگو مولانا کی مسلسل، رواں اور فصیح عربی تقریر سننے کے لائق ہوتی۔ ایسے موقعوں پر عربی زبان کی شیرینی سے لطف اندوز ہونے کی خاطر میں اپنے کمرے سے نکل کر برآمدے میں کھڑا ہو جاتا تھا۔

۴- ''اس کشتی کے ماتھے پر نجات کی روشنی دکھائی نہیں دیتی۔ یا تو مصیبت اس سے دور ہے یا (پھر) کنارہ نزدیک ہے۔''

۵- ''اس مکتب عالم کے عجائبات کی سیر ہماری تنگ چشمی کو دور نہ کر سکی۔ اسی حسرت میں ہماری نگاہ پگھل کر رہ گئی۔ اس کے باوجود پلکوں کی سیاہی تک روشن ہو پائی۔''

۶- ''(گو) بارش کی فطری لطافت میں کوئی شبہ نہیں (لیکن) وہ باغ میں گل لالہ اُگاتی ہے اور شورزمین میں نکمّی گھاس۔''

۷- ''میری ایک نصیحت یاد رکھنا اور اس پر عمل کرنا کیونکہ نصیحت سے فائدہ وہی اٹھاتا ہے جو اس پر عمل کرتا ہے۔''

۸- (۱) ''میں نے رومی کی طرح حرم میں اذان دی ہے اور انہی سے روحانی اسرار سیکھے ہیں۔

(۲) انہوں نے دور قدیم کے فتنے کا مقابلہ کیا تھا اور میں دور جدید کے فتنے کے مقابل ہوں۔''

۹- ملاحظہ ہو مضمون ''اقبال —— جدید فارسی شاعری اور ایرانی معاشرے پر اثرات'' مشمولہ ''فارسی ادب کے چند گوشے'' لاہور، بار دوم، ۱۹۹۷ء

۱۰- ''اے پاک سرزمین! اے میرے ملک! اے میری ولادت گاہ! اے میری پرورش گاہ! اے میرے آشیانے! اے میری پناہ گاہ! اے میرے خدا کے فضل کے سائے!''

۱۱- انہوں نے خود بتایا تھا: ''ہمارے دادا نے ایک شیعہ خاندان میں شادی کرنے کی خاطر یہ مسلک اپنالیا تھا۔''

۱۲- صوفی افضل فقیر اسلامیہ کالج میں مجھ سے ایک سال آگے تھے مگر ہمارا ٹیوٹوریل گروپ ایک ہی تھا۔ اس کے جلسوں میں اپنا کلام سنایا کرتے تھے۔ کسی طرحی مشاعرے میں پڑھی ہوئی اپنی اردو غزل بھی سنائی تھی جس کے مصرع طرح کی تضمین یوں کی تھی:

صوفیا آج تجھے رند ہی کہتے ہیں فقط
''دیکھیے روئے سخن کل یہ کہاں تک پہنچے''

صوفی صاحب صاف گوئی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اسی بنا پر اورینٹل کالج کے زمانۂ طالب علمی میں عابدی صاحب سے قطع نظر تمام اساتذہ ان سے نالاں رہتے تھے۔ بالخصوص صدر شعبہ ڈاکٹر باقر صاحب ان کا نشانہ بنتے تھے۔ ایسے بہت سے لطائف زبان زد عام تھے۔ مثلاً ڈاکٹر باقر صاحب نے صوفی صاحب والی سال ششم کو

الوداعی چائے پر ماڈل ٹاؤن میں اپنے گھر مدعو کیا۔ اپنا کتب خانہ دکھا کر بڑے فخر سے صوفی صاحب کو مخاطب کر کے کہا: ''دیکھا صوفی! اس لائن میں آنا ہو تو اتنی کتابیں رکھنا پڑتی ہیں۔'' صوفی صاحب نے اپنی کھردری آواز میں ہنستے ہوئے فقرہ چست کیا: ''ہاں ڈاکٹر صاحب! کتابیں تو بہت ہیں مگر پڑھا بھی تو کیجیے۔''

ڈاکٹر باقر صاحب کی یہ کمزوری تھی کہ انہیں شعر یاد نہیں ہوتے تھے۔ ایک بار وہ صوفی صاحب والی کلاس کو پڑھا رہے تھے۔ ایک طالب علم اُٹھ کر بطور مثال کوئی شعر پڑھنا چاہتا تھا مگر اڑ گیا۔ صوفی صاحب نے اسے مخاطب کر کے کہا: ''معلوم ہوتا ہے آج تم نے ڈاکٹر صاحب کا جھوٹا پانی پی لیا ہے۔''

۱۳- ''رات کی طوالت اور میری بے خوابی ہی کا مسئلہ نہیں ہے۔ ذرا میری تقدیر کی خبر لاؤ کہ وہ کہاں سوئی پڑی ہے۔''

۱۴- دراصل اپنے علم و فضل کے باوجود زیدی صاحب کے لہجے میں ہلکی سی غناہٹ تھی اور کچھ چبا چبا کر الفاظ ادا کرتے تھے۔ علم و فضل کا پتا تو ذرا دیر سے چلتا ہے مگر گفتگو کا ردعمل فوری ہوتا ہے۔ ہوا یہ تھا کہ طلبہ نے دو دن تو ان کا لیکچر برداشت کیا لیکن تیسرے دن پیریڈ ختم ہوتے ہی سب کے سب پرنسپل کے دفتر کے آگے جمع ہو گئے۔ سید عبداللہ صاحب یونیورسٹی کی کسی میٹنگ میں جا رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ طلبہ کا کوئی نمائندہ اندر آ کر بات کرے۔ ایک طالب علم اندر گیا۔ سید صاحب نے کہا وقت بہت کم ہے، مختصر الفاظ میں اپنا مطالبہ بیان کرو۔ اس ستم ظریف نے کہا: ''جناب یا تو زیدی صاحب کو واپس شیخوپورہ بھیج دیجیے یا پھر ہم سب کو شیخوپورہ بھیج دیجیے۔'' سیّد صاحب سخت ناراض ہوئے اور ڈانٹ کر کہا: ''ناشکرو، میں تو بڑی کوشش سے زیدی صاحب کو لے کر آیا ہوں اور تم میری محنت اکارت کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ بھاگ جاؤ یہاں سے، تمہارا مطالبہ ناقابل تسلیم ہے۔'' غرض یہ کہ چند دنوں میں طلبہ زیدی صاحب کے لہجے کے عادی ہو گئے اور ان پر نئے استاد کی قابلیت ظاہر ہو گئی۔ پھر کبھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔

یہاں میں یہ اعتراف بھی کرتا چلوں کہ زیدی صاحب مجھ پر بڑے مہربان تھے۔

یونیورسٹی لائبریری میں بھی اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ میں ان دنوں ڈاکٹریٹ کے لیے کسی موضوع کی جستجو میں تھا۔ ایک دن فرمانے لگے: ''اگر میرے بس میں ہوتو میں آپ کی فصاحت زبان پر ہی آپ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کردوں۔'' یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عابدی صاحب کی طرح زیدی صاحب کا تعلق بھی ضلع بجنور سے تھا۔ وہ بجنور کے مشہور قصبے کرت پور کے رہنے والے تھے۔ ان کی وفات ۱۸ مارچ ۲۰۰۴ء کو نیویارک میں ہوئی۔

۱۵- ''گندم سے گندم اُگتی ہے اور جو سے جو اُگتے ہیں، (خبردار) اپنے عمل کے بدلے سے (کبھی) غافل نہ ہونا (جو بوؤ گے وہی کاٹو گے)۔''

۱۶- (۱) ''افسوس سید وزیر الحسن عابدی اس جہان رنگ و بو سے رحلت فرما گئے۔

(۲) وہ علم و فضل میں بے مثل اور اخلاق کے اعتبار سے بے نظیر تھے۔ گفتگو میں ان کے منہ سے (چنبیلی کے) پھول جھڑتے تھے اور ان کی باتوں سے مشک کی سی باس آتی تھی۔

(۳) ان کی لحد نور حق سے روشن رہے اور ان کی تربت پر بے حد و حساب رحمتوں کا نزول ہو۔

(۴) ان کی المناک وفات پر میں تاریخ کی جستجو میں سرگرداں تھا۔

(۵) فرشتۂ غیب نے ایک آہ کھینچی اور بولا کہ ''رہگرائے بہشت بریں'' (ان کا) سال وفات کہہ دو۔''

نبّاض الملک

حکیم نیّر واسطی (۱۹۰۱ء-۱۹۸۲ء)

ستمبر ۱۹۴۸ء کا پہلا ہفتہ تھا۔ ہم لوگ کھوکھراپار کے راستے ٹونک سے لاڑکانہ پہنچے تھے۔ ابھی تھکن بھی نہیں اتری تھی کہ نو ستمبر کو دن چڑھے لاہور سے حکیم نیّر واسطی صاحب کا تار موصول ہوا جس میں والد کی شدید علالت کی اطلاع تھی۔ سیلاب کے باعث لاڑکانہ روہڑی ریلوے لائن منقطع ہو چکی تھی۔ حیدرآباد جانے والی واحد ٹرین نکل چکی تھی۔ اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ لہٰذا مجبوراً دس ستمبر کی صبح حیدرآباد روانہ ہوئے۔ غروب آفتاب کے بعد کوٹری جنکشن پہنچے جہاں سے لاہور کے لیے پاکستان میل (اب خیبر میل) پکڑنا تھی۔ یہاں ایک صاحب نے ریڈیو پاکستان لاہور کے حوالے سے والد کے انتقال کی خبر سنائی جسے ہم نے خواتین سے پوشیدہ رکھا۔ گیارہ ستمبر کو غروب کے بعد لاہور سٹیشن پر اترے۔ حکیم صاحب مع چند اعزہ واحباب پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ نیّر منزل پہنچے۔ والد کی نعش میو ہسپتال کے سرد خانے سے اگلے دن صبح لائی جانی تھی۔ علی الصباح آنے والے اخبارات قائداعظم کی وفات کی گرجتی گونجتی سرخیوں سے معمور تھے۔ اسی دن والد کی تدفین عمل میں آئی۔ حکیم صاحب کی خواہش تھی کہ ہم لوگ لاہور میں مستقل قیام کریں لیکن دادی جان نے سردست لاڑکانہ جانے کا فیصلہ کیا جہاں ٹونک سے آئے ہوئے دیگر اعزہ مقیم تھے اور ہم چند روز بعد واپس لاڑکانہ چلے گئے۔ والد کے انتقال کے بعد حکیم صاحب نے ان کے باقی ماندہ کلام کو، جو قبل ازاں کسی مجموعے میں شامل نہیں ہوا تھا، ترتیب دے کر ۱۹۴۹ء میں ''شہرود'' کے نام سے شائع کیا۔ اس کا سرورق مصور مشرق عبدالرحمٰن چغتائی نے بنایا تھا۔

میں ۱۹۵۰ء کے اواخر میں اپنی تعلیم کے سلسلے میں شیخوپورہ آ گیا۔ حکیم صاحب کا دیر سے اصرار تھا کہ میں نیر منزل میں مقیم رہ کر ان کی نگرانی میں تعلیم حاصل کروں۔ چنانچہ ۱۹۵۱ء میں گورنمنٹ ہائی سکول شیخوپورہ سے نویں جماعت پاس کرنے کے بعد مجھے حکیم صاحب کی تحویل میں دے دیا گیا لیکن یہ بیل منڈھے نہیں چڑھی۔ اپریل کے وسط کی کوئی تاریخ تھی۔ اگلے دن مجھے رنگ محل مشن ہائی سکول میں داخل کرایا جانا تھا اور میں سخت گھبرایا ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں مزاج کے اعتبار سے ٹھیٹھ دیہاتی یا زیادہ سے زیادہ قصباتی ہوں۔ بڑے شہروں کی گھما گھمی اور تکلّفات سے میری جان جاتی ہے۔ لاہور میں میری حالت مرغِ نوگرفتار کی سی تھی۔ اتفاق سے میرے ایک پھوپھی زاد ان دنوں اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھتے تھے۔ سہ پہر کو وہ ملنے آئے تو میں نے ان سے صاف کہہ دیا کہ میں لاہور میں رہنے اور پڑھنے کو تیار نہیں، مجھے واپس شیخوپورہ لے چلیں۔ انہوں نے مجھے حکیم صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ حکیم صاحب نے بڑی محبت سے سمجھایا لیکن میں راضی نہ ہوا۔ آخر طوعاً و کرہاً اجازت دی اور میں واپس شیخوپورہ سکول میں آ گیا۔ بعد میں فرمایا کرتے تھے کہ میں تجھ سے بڑا خوش ہوں کہ تو نے کسی کا احسان اٹھانا پسند نہیں کیا۔

۱۹۵۲ء میں میٹرک کرنے کے بعد میں اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہو گیا۔ ساتھ شیخوپورہ کے کچھ ہم جماعت دوست بھی تھے۔ حکیم صاحب نے پھر کوشش کی کہ میں ان کے ہاں قیام کروں لیکن میں دوسرے دوستوں کے ساتھ ریواز ہوسٹل میں ٹھہرا۔ اب میں مہینے میں دو ایک بار حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ اگر مہینے سے اوپر ہو جاتا تو وہ لاڑکانہ میں دادی جان کو لکھ دیتے کہ خوشنود[1] میرے پاس نہیں آتا اور مجھے گھر سے آنے والے خط میں ڈانٹ پڑتی۔ مجھ پر ان کی یہ شفقت والد مرحوم سے ان کی دلی محبت کا نتیجہ تھی۔ مجھے دیکھ کر انہیں اپنا بچھڑا ہوا جگری دوست یاد آ جاتا تھا۔ یہ بھی اپنائیت کا ایک اظہار تھا کہ مجھے ہمیشہ ''تو'' اور ''تجھے'' سے مخاطب کرتے اور بے تکلفی میں ''یار'' بھی کہہ دیتے۔ میں انہیں چچا کہا کرتا تھا۔ کبھی کبھی ہنس کر کہتے: ''تیرا باپ مجھ سے پانچ برس چھوٹا تھا اور تو مجھے چچا کہتا ہے۔'' میں دیر بعد جاتا یا جلدی، بس دیکھتے ہی کھل اٹھتے تھے۔ اس مسرت کا اظہار ایک فرمائشی قہقہے سے ہوتا اور ساتھ ہی یہ ڈھلا ڈھلایا فقرہ: ''ارے یار تو بہت دنوں میں آیا''۔

ان دنوں میری حاضری کا بھی ایک خاص طریقہ کار تھا۔ یہ عموماً سہ پہر کے وقت ہوتی تھی

جب وہ مطب کے اندر مریضوں میں گھرے ہوتے تھے۔ میں کوشش کر کے قریب پہنچتا اور سلام عرض کرتا۔ وہ کھینچ کر سینے سے لگاتے، سر پر ہاتھ پھیرتے، پیٹھ تھپکتے، خیر خیریت پوچھتے، تعلیم کی بابت سوال کرتے، اگر کوئی نمایاں شخصیت موجود ہوتی تو اس سے میرا تعارف ضرور کراتے۔ ابھی یہ عمل جاری ہوتا کہ مریضوں میں بے چینی کے آثار نمودار ہونے لگتے۔ ذرا دیر بعد مجھے بڑی چچی جان کی خدمت میں سلام کے لیے بھجوا دیا جاتا۔ وہاں سے واپسی پر مطب کا پھیرا۔ پھر چھوٹی چچی کے سلام کو روانگی۔ واپسی پر مطب میں ذرا توقف اور الوداعی سلام۔

اگر خلافِ معمول کبھی اتوار کی چھٹی کے دن صبح کے وقت حاضر ہوتا تو گھر پر احباب میں چہک رہے ہوتے۔ ایسی محفلوں میں زیادہ تر شعروادب اور تصوف و عرفان کے موضوع زیر بحث ہوتے یا پھر ان کے غیر ملکی اسفار کے تذکرے چھڑتے۔ ان کی گفتگو بڑی دلچسپ اور معلومات سے مملو ہوتی تھی۔ تہذیبی رچاؤ کے اعتبار سے وہ ہمارے اگلے طبیبوں کی یادگار تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اس وقت ان کی شخصیت کی عظمت اور اہمیت سے ناواقف تھا۔ میرے لیے تو وہ ایک بزرگ اور سرپرست کی حیثیت رکھتے تھے۔

حکیم صاحب ۱۹۰۱ء میں قصبہ نہٹور (ضلع بجنور) میں واسطی سادات کے ایک خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سیّد مظفر حسین، نگینہ (ضلع بجنور) میں وکالت کرتے تھے۔ والدین نے ان کا نام سیّد علی احمد رکھا تھا لیکن آگے چل کر وہ اپنے تخلص ''نیّر'' اور نسبت ''واسطی'' کی ترکیب کے ساتھ نیّر واسطی مشہور ہوئے۔ نو برس کی عمر میں والد وفات پا گئے۔ انہوں نے فارسی اور عربی کی تعلیم سے ابتدا کی اور دونوں زبانوں میں مہارت بہم پہنچائی۔ اوائل عمر ہی میں شعر گوئی سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ نعت گوئی سے آغاز کیا۔ بذریعہ خط و کتابت حضرت اکبر وارثی میرٹھی سے اصلاح لینے لگے۔ تحریک خلافت کے زیر اثر قومی اور ملی نظمیں لکھنا اور جلسوں میں پڑھنا شروع کیا۔ ان نظموں کا ایک مجموعہ ''ترانۂ خلافت'' کے نام سے دھام پور (ضلع بجنور) سے شائع ہوا تھا۔ جو انگریز حکومت نے ضبط کر لیا۔ تحریک خلافت کی مصروفیات، شعروشاعری کی چیٹک اور تعلیم کی جستجو میں حکیم صاحب نے جگہ جگہ کی خاک چھانی جن میں لکھنؤ، کانپور، رام پور، دہلی، بریلی اور دیوبند کے نام نمایاں ہیں۔ ۱۹۲۰ء میں دہلی میں حکیم اجمل خاں کے طبیہ کالج میں داخل ہوئے لیکن علم طب کی تکمیل، تکمیل الطب کالج لکھنؤ سے کی۔ سچ پوچھیے تو حکیم صاحب کی شخصیت کی تعمیر میں مکتب کی

کرامت سے زیادہ بزرگوں کے فیضانِ نظر کا حصہ تھا۔

بیسویں صدی کے ربع اوّل میں برعظیم ہندو پاکستان کے اندر جو عجائب روزگار شخصیات موجود تھیں ان کی نظیر چشم فلک کبھی نہ دیکھ سکے گی۔ حکیم صاحب نے جن لوگوں کی آنکھیں دیکھیں ان میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی اور مولانا آزاد سبحانی جیسے سیاست کار، حکیم اجمل خاں جیسے طبیب، مفتی کفایت اللہ دہلوی جیسے عالم، خواجہ حسن نظامی جیسے صوفی، سید ناصر نذیر فراق جیسے ادیب اور شاعروں میں نواب سراج الدین احمد سائل دہلوی، مولانا وحید الدین بے خود دہلوی، مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی، بے خود موہانی، ثاقب لکھنوی، صفدر مرزا پوری اور جگر مراد آبادی جیسے زعما شامل تھے۔ مذہبی معاملات میں حکیم صاحب کی وسیع المشربی دیکھ کر تعجب ہوتا تھا۔ وہ اپنی نوجوانی ہی میں کبھی لکھنؤ کی مجالس عزا میں مرثیہ خوانی کرتے نظر آتے، کبھی بریلی میں مولانا احمد رضا خاں کی خدمت میں نعت پیش کر رہے ہوتے اور کبھی دیو بند میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کے حضور قصیدہ نذر کرتے دکھائی دیتے۔

۱۹۲۵ء میں حکیم صاحب لاہور آگئے۔ چونا منڈی میں مطب شروع کیا۔ علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں سے متاثر تو پہلے ہی سے تھے، لاہور آکر ان بزرگوں سے ملاقات کی صورت پیدا ہوئی۔ یہ وہ دن تھے جب شرقپور میں حضرت میاں شیر محمد سجادۂ رشد و ہدایت پر متمکن تھے۔ ان سے نیازمندی کا رشتہ استوار ہوا جو ۱۹۲۷ء میں موصوف کی وفات تک جاری رہا۔ ۱۹۳۱ء میں حکیم صاحب کا مجموعۂ کلام ''میکدہ'' کے نام سے شائع ہوا۔

والد مرحوم سے تعلقات کا آغاز ۱۹۲۶ء میں ہوا تھا اور ایسی مثالی دوستی قائم ہوئی جس کی نظیر ملنا محال ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دوستی نبھانے میں بھی حکیم صاحب کی وضعداری اور بردباری کا دخل تھا۔ والد کا مزاج گھڑی ماشہ گھڑی تولہ۔ جب لاڈ میں ہوتے تو قبلہ کہہ کر مخاطب کرتے اور جب ترنگ میں بگڑ بیٹھتے تو مجمع میں بے نقط سنا دیتے۔ مگر واہ رے حکیم صاحب مجال ہے کبھی چتون پر میل آیا ہو۔ ہنس ہنس کر فرماتے: ''مولانا! یہ سب گالیاں پرانی ہوگئی ہیں۔ کوئی نئی گالی دیجیے۔'' غرض یہ کہ ہمیشہ ان کے ناز اٹھایا کیے، یہاں تک کہ ان کی آخری خدمت یعنی تجہیز و تکفین بھی حکیم صاحب کے ہاتھوں انجام پائی اور بعد میں پختہ قبر بھی حکیم صاحب نے اصرار کے ساتھ تعمیر کرائی۔

مجھے کوئی بھی فائدہ پہنچانے کے لیے حکیم صاحب موقع کی تلاش میں رہتے تھے۔ ایک بار اپنے مطب کے کارکن محمد احمد صاحب کے ساتھ مال روڈ پر واقع کسی گراموفون کمپنی کے دفتر میں بھجوایا تاکہ میں والد کی بعض منظومات کے ریکارڈ تیار کرنے کے لیے معاہدے پر دستخط کرسکوں۔ ایک اور موقع پر میں حاضر خدمت ہوا تو فرمانے لگے: ''لاہور کارپوریشن کے ایڈمنسٹریٹر میرے دوست میاں محمد شفیع صاحب[۲] ہیں۔ کارپوریشن کے زیر اہتمام شالامار باغ کے نواح میں ایک نئی کالونی[۳] آباد ہو رہی ہے۔ تم میرا رقعہ لے کر ان سے ملو تاکہ وہ تمہیں کوئی پلاٹ الاٹ کردیں۔'' ساتھ ہی رقعہ لکھ کر میرے حوالے کیا۔ اس کے ابتدائی الفاظ مجھے آج بھی یاد ہیں، جو یوں تھے: ''اختر مرحوم کے صاحب زادے کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ ان کی آرزوئیں، میری تمنائیں ہیں......'' دوچار روز بعد کارپوریشن کے دفتر میں جاکر میاں صاحب سے ملا۔ رقعہ پڑھ کر بولے: ''بیٹا! وہ پلاٹ چھوٹے ہیں، صرف پانچ پانچ مرلے کے ہیں۔ اچھا یوں کرتے ہیں کہ تم دونوں بھائیوں کے نام پر دو پلاٹ الاٹ کیے دیتا ہوں۔ دس مرلے کی جگہ تو ہو جائے۔'' غرض وہیں مجھ سے درخواست لکھوا کر اس پر دو پلاٹوں کی تفویض کا حکم لکھ دیا اور کارپوریشن کے پٹواری سے ملنے کی ہدایت کی۔ پٹواری صاحب اپنے مقررہ مقام پر موجود نہ تھے۔ چند روز بعد ایک بار پھر ان کی تلاش میں گیا۔ ناکامی ہوئی چنانچہ میں نے درخواست پھاڑ کر پھینک دی:

اے کہ اندرین وادی مژدہ از ھما دادی
بر سرم ز آزادی سایہ را گرانی ھاست[۴]

جب مرحوم سیّد امتیاز علی تاج کے ایما پر میں نے ''مقالات حافظ محمود شیرانی'' کی ترتیب اور حاشیہ نگاری کا کام شروع کیا اور مجلس ترقی ادب، لاہور کے زیر اہتمام ۱۹۶۶ء میں اس کی ابتدائی دو جلدیں شائع ہوئیں تو میں ان کا ایک ایک نسخہ لے کر حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بڑی مسرت کا اظہار کیا اور پھر کتابوں کا جستہ جستہ جائزہ لے کر استعجابیہ انداز سے فرمانے لگے: ''ارے یار! تو اتنا کام کیسے کرلیتا ہے؟'' میں سمجھا کہ چچا ابھی تک مجھے بچہ ہی سمجھتے ہیں اور مجھ سے کسی علمی کام کی توقع نہیں رکھتے اس لیے اظہارِ حیرت کر رہے ہیں۔ تاہم میری یہ غلط فہمی بڑے عجیب انداز سے دور ہوئی۔ وہ یوں کہ انہی دنوں میرا تبادلہ انٹر کالج شیخوپورہ سے ڈگری کالج شیخوپورہ ہوگیا۔

ڈگری کالج میں پروفیسر عزیز بھٹی مرحوم پرنسپل تھے۔ وہ شاید پہلے آدمی کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے، لہٰذا ڈائریکٹر تعلیم کے نام ایک نیم سرکاری چٹھی میں انہوں نے اس تبادلے پر ناخوشی کا اظہار کیا۔ اتفاق سے کچھ ہی دنوں بعد ڈگری کالج میں ایک عظیم الشان مشاعرے کا پروگرام تھا۔ عزیز بھٹی صاحب حکیم صاحب کے بڑے معتقد تھے اور چاہتے تھے کہ وہی اس مشاعرے کی صدارت کریں۔ چنانچہ جب وہ حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی خواہش کا اظہار کیا تو جواب ملا: ''مجھے شیخوپورہ آنے کی زحمت کیوں دیتے ہو۔ وہاں اختر کالڑکا خوشنود موجود ہے۔ اس سے مشاعرے کی صدارت کرالو۔'' جب بھٹی صاحب نے اصرار کیا تو بولے: ''میں آپ کو غلط مشورہ نہیں دے رہا ہوں۔ شاید آپ خوشنود کو نہیں جانتے، وہ تو پوری ایک صدی ہے۔'' بھٹی صاحب نے اگلے دن شیخوپورہ آکر خوشنود کی تلاش شروع کی۔ مجھے بلوا کر پوچھا: ''کیا تمہارا کوئی بڑا بھائی خوشنود نامی ہے؟'' میں نے عرض کیا: ''یہ میرا ہی گھر کا نام ہے اور آپ کی پریشانی کا سبب محض حکیم صاحب کا حسنِ ظن ہے۔ آپ فکر نہ کیجیے حکیم صاحب ہی اس مشاعرے کی صدارت کریں گے۔'' چنانچہ میں حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور چند روز بعد ان کی صدارت میں ڈگری کالج کے جناح ہال میں ایک دھوم دھامی مشاعرہ منعقد ہوا جس میں لاہور کے بڑے بڑے شعرائے کرام نے شرکت کی۔

حکیم صاحب کی مجھ سے محبت کا ایک مظاہرہ بڑا دلچسپ تھا۔ یہ ان کے مطب کا واقعہ ہے۔ ان کی شہرت اور حذاقت کے پیشِ نظر دور دور سے مریض آیا کرتے تھے اور کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا ہوتا۔ مریضوں کو باری کے حساب سے دیکھا جاتا تھا۔ میں جب کوئی مریض لے کر جاتا تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہوتا۔ برسوں تک تو یہ دستور رہا کہ میں اپنے مریض کو دواخانے سے ملحقہ چھوٹے سے کمرے میں بٹھا کر خود ان کے پاس پہنچتا۔ جب وہ سینے سے لگاتے تو میں ان کے کان میں کہہ دیتا کہ مریض لایا ہوں۔ وہ آہستہ سے سر ہلا دیتے اور میں وہاں سے ٹل جاتا۔ مریضوں کو پتا بھی نہ چلتا کہ ان کے وقت پر ڈاکا پڑنے والا ہے۔ ذرا دیر بعد حکیم صاحب اپنی نشست سے اٹھ کر چھوٹے کمرے میں چلے آتے۔ مریض کو دیکھتے، نسخہ لکھتے اور واپس تشریف لے جاتے۔ جب پچھلی عمر میں ضعیف ہو گئے تو اس طرح اٹھ کر آنے میں انہیں زحمت ہوتی تھی چنانچہ ان کے نائبین کی وساطت سے وہیں مطب میں مریض دکھا لیتا تھا لیکن یہ عمل بڑی احتیاط کا متقاضی تھا۔ ایک بار

سُوئے اتفاق سے یا شاید میری عجلت کے باعث مطلوبہ احتیاط میں کوئی خامی رہ گئی۔ لہٰذا اس بے اصولی کے خلاف مریضوں نے عام بغاوت کر دی۔ غالباً وہ یہ سمجھے کہ حکیم صاحب کی لاعلمی میں ان کے نائبین باری میں گڑبڑ کر رہے ہیں۔ بہت سے مریض پہلے ہی کھڑے تھے۔ جو بیٹھے تھے وہ بھی اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ہر طرف سے احتجاجی صدائیں بلند ہونے لگیں:

''میں پانچ گھنٹے سے بیٹھا ہوں۔''

''میں رات ہوٹل میں ٹھہرا تھا اور فجر کے وقت مطب کی سیڑھیوں پر آ بیٹھا تھا۔''

''میں مری سے آیا ہوں۔''

''میں ڈیرہ غازی خاں سے۔''

''میں کراچی سے۔''

''یہ زیادتی نہیں چلے گی۔''

حکیم صاحب میرے مریض کی نبض تھامے بیٹھے تھے۔ شور سن کر اوپر دیکھا۔ ان کے لیے یہ مضمون نیا تھا۔ گھبرا کر کھڑے ہو گئے اور ہاتھ ہلا ہلا کر مریضوں کو بیٹھنے کی تلقین کرنے لگے۔ ان کے الفاظ مجھے خوب یاد ہیں: ''کیا بات ہے؟ کیا بات ہے؟ دیکھو! تم اس کو نہیں جانتے! تمہیں معلوم نہیں یہ کون ہے! سنو! سنو! اگر میں اس کا مریض پہلے نہیں دیکھوں گا تو ـــــ تو ـــــ تو یہ مجھے مارے گا!'' ان کے ان الفاظ نے آگ پر پانی کا سا کام کیا۔ ایک سناٹا چھا گیا۔ مریض اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ حکیم صاحب نے اطمینان سے میرے مریض کا معائنہ کیا اور نسخہ لکھ کر فارغ کر دیا۔

حکیم صاحب کی کثیر الانواع مصروفیات کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ وہ واقعی جنوں کی طرح کام کرتے تھے۔ علاج معالجے سے قطع نظر ان کی دلچسپی شعر و ادب، تعلیم و تدریس، تحقیق و تنقید، تصنیف و تالیف، تنظیمِ اطبا اور مختلف ثقافتی سرگرمیوں سے عبارت تھی۔ ان میں سے ہر میدان میں انہیں ممتاز مقام حاصل تھا اور بعض معاملات میں وہ بین الاقوامی شہرت کے حامل تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک چھوٹے سے مضمون میں ان کی شخصیت کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں ان کا آپ سے تعارف کرانے کی کوشش کروں گا۔ مناسب ہوگا اگر حکیم صاحب کے اندازِ تشخیص اور طریقِ علاج کے سلسلے میں اپنے مشاہدات اور بعض دلچسپ واقعات بیان کرنے سے پہلے ان کی دوسری دلچسپیوں اور خدمات کا تذکرہ کر دیا جائے۔

ان کی شاعری کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں بے عیب شعر کہتے تھے۔ ''میکدہ'' کے بعد ان کی شاعری کا ایک اور مجموعہ ''شعر و حکمت'' کے نام سے ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں والد مرحوم کے بارے میں بھی چند نظمیں تھیں۔ ادبی لحاظ سے ان کی تالیف ''اختر و سلمیٰ'' قابل ذکر ہے۔ شعر گوئی کے علاوہ شعر فہمی کا ذوق ایسا پاکیزہ تھا کہ باید و شاید۔

درس و تدریس سے حکیم صاحب کو خاص شغف تھا۔ مدتوں طبیہ کالج لاہور میں تاریخ طب کے پروفیسر رہے۔ علاوہ ازیں لاہور کے انسٹی ٹیوٹ آف ہائی جین اینڈ پری وینٹو میڈیسن میں بھی لیکچر دیا کرتے تھے۔ ان کی تحقیقات کا موضوع بھی ''طبِ اسلامی کی تاریخ'' تھا اور اس شعبے میں ان کو بین الاقوامی شہرت حاصل تھی۔ چنانچہ اسلام آباد کے علاوہ مشہد (ایران) کی یونیورسٹیوں میں تاریخ طب کے وزٹنگ پروفیسر تھے اور تہران (ایران) کی ''ایسوسی ایشن آف ہسٹری آف سائنسز اینڈ میڈیسن'' کے مشاورتی رکن بھی۔ علاوہ ازیں انگلستان، ہسپانیہ اور یونان کی تاریخِ طب کی انجمنوں نے انہیں باقاعدہ اپنا مستقل رکن بنایا ہوا تھا۔ ۱۹۵۸ء میں ''ٹرکش ہسٹری آف میڈیسن ایسوسی ایشن، استنبول'' کے رکن نامزد ہوئے۔ اس تعلق کے نتیجے میں ان کی کتاب ''ترکی نظامِ طب کی تاریخ'' وجود میں آئی جس کا موضوع ترکوں کی قدیم طبی خدمات کا تذکرہ ہے۔ عربوں کی طبی خدمات پر پروفیسر ای۔جی براؤن کے چار خطبات کا اردو میں ترجمہ کر کے اس پر تنقیدی حواشی اور طویل تشریحات کا اضافہ کیا۔ یہ کتاب ''طب العرب'' کے نام سے ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور نے ۱۹۵۷ء میں شائع کی۔ اس عالمانہ کام پر پنجاب یونیورسٹی نے انہیں خصوصی انعام سے نوازا۔ طب کے مختلف موضوعات پر حکیم صاحب کی متعدد تالیفات، کتابچے اور مضامین شائع ہوئے جن کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ میں چند اہم کتابوں کی اسم نویسی پر اکتفا کرتا ہوں:

''تاریخ طب یونان'' (اردو میں خطبات کا مجموعہ)

''مسلم کنٹری بیوشن ٹو میڈیسن'' (بزبانِ انگریزی۔ انگلستان میں شائع ہوئی)

''المساحتہ الاسلامیہ فی الطب'' (عرب ممالک میں طبی موضوعات پر عربی تقاریر کا مجموعہ)

''تاریخ روابطِ پزشکی ایران و پاکستان'' (بزبانِ فارسی۔ شائع کردہ مرکزِ تحقیقاتِ فارسی، ایران و پاکستان ۱۹۷۶ء)

پاکستان میں وہ درجنوں سرکاری اور غیر سرکاری، طبی اور ثقافتی انجمنوں اور کمیٹیوں کے عہدیدار، مشیر یا رکن تھے۔ مثلاً صدر پاکستان طبی کانفرنس اور پریذیڈنٹ بورڈ آف یونانی اینڈ آیورویدک سسٹمز آف میڈیسن (۷۸-۱۹۷۰ء)، پاک چین دوستی اور پاک ایران دوستی کی انجمنوں کے فعال رکن تھے۔ ایران کی طرح ترکی کے برادر ملک سے حکیم صاحب کو خصوصی محبت تھی۔ چنانچہ انہوں نے بڑے شوق سے ترکی زبان سیکھی اور پنجاب یونیورسٹی سے ڈپلومہ حاصل کیا۔ ۱۹۵۸ء ہی میں انہوں نے انجمن ثقافتِ پاکستان و ترکیہ کی بنیاد رکھ دی تھی۔ اس انجمن کے زیر اہتمام مختلف ثقافتی تقریبات برپا ہوتی رہتی تھیں۔ انجمن نے ترکی زبان سکھانے کے لیے باقاعدہ کلاسوں کا اجرا بھی کیا۔ ۱۹۶۸ء میں، میں خود بھی اس کلاس میں شریک تھا۔ ان دنوں ترک پروفیسر عمر یلماز ہمیں پڑھاتے تھے اور کبھی کبھی خود حکیم صاحب بھی تدریس میں حصہ لیتے تھے۔ حکیم صاحب کی جمہوریہ ترکی سے محبت اور ترک زبان و ثقافت کی خدمات کے اعتراف میں حکومت ترکیہ نے انہیں پاکستان میں اپنا اعزازی قونصل جنرل مقرر کیا تھا، چنانچہ ایک عرصے تک نیر منزل پر ترکی کا قومی جھنڈا لہراتا رہا۔ ۱۹۸۰ء میں جب مجلس یادگارِ حافظ محمود شیرانی کا قیام عمل میں آیا تو میری درخواست پر حکیم صاحب نے اس کا سرپرست بننا قبول کیا اور مجلس کا پہلا اجلاس انہی کی زیر صدارت نیر منزل میں منعقد ہوا۔

حکیم صاحب نے اپنی تدریسی، تحقیقی اور ثقافتی سرگرمیوں کے سلسلے میں بہت سے ممالک کے سرکاری اور نجی دورے کیے۔ ایران اور ترکی تو جاتے ہی رہتے تھے، اس کے علاوہ جن ممالک کا سفر انہوں نے کیا، ان میں مغربی یورپ، جنوبی یورپ کے اکثر ممالک، مشرقِ وسطیٰ کے مختلف ممالک، متحدہ عرب امارات، افغانستان، چین اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ شامل ہیں۔

۲۳ مارچ ۱۹۶۱ء کو حکومت پاکستان نے حکیم صاحب کی (اس وقت تک) چالیس سالہ طبی، علمی، ادبی اور ثقافتی خدمات کے اعتراف میں ستارۂ خدمت کا خطاب عطا کیا۔ ۱۹۸۲ء میں جب صدر ضیاالحق نے مرکز میں مجلس شوریٰ قائم کی تو حکیم صاحب کو بھی اس کا رکن نامزد کیا گیا اور وہ اس ایوان میں صحت کی مجلسِ قائمہ کے ممبر بنائے گئے۔

باایں ہمہ، حکیم صاحب کا اصل میدان طبابت تھا اور اس شعبے میں انہوں نے محیّر العقول کارنامے انجام دیے۔ عوام میں ان کی شہرت کا تمام تر دارومدار ان کی حذاقت پر تھا۔ خود میں نے

بلا مبالغہ سینکڑوں مریض ان کو دکھائے جن میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو عرصے تک جگہ جگہ علاج کرانے کے بعد مایوس ہو چکے تھے۔ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کم از کم حکیم صاحب کی تشخیص سے مریض یا اس کے لواحقین مطمئن ہو جاتے تھے۔ اتنا ضرور ہے کہ اگر فوری آپریشن کی ضرورت ہو یا معاملہ ہی اختتام کو پہنچ چکا ہو تو وہ بلطائف الحیل علاج سے معذوری ظاہر کر دیتے تھے اور ہسپتال میں داخل کرانے یا کسی خاص معالج کو دکھانے کا مشورہ دیتے تھے۔ اس موقع پر صاف کہہ دیتے تھے کہ ہمارے ہاں اس چیز کا علاج نہیں ہے۔ شاید اسی بنا پر ان کے بارے میں مشہور ہو گیا تھا کہ جس شخص کی موت کسی بیماری کے باعث مستقبل قریب میں واقع ہونے والی ہو اسے حکیم صاحب پہچان لیتے ہیں۔ پروفیسر عزیز بھٹی مرحوم اس قسم کے بعض واقعات بڑے وثوق سے سناتے تھے۔ بہر حال مرض کی تشخیص میں انہیں جو کمال حاصل تھا اس کو اعجاز ہی کہا جا سکتا ہے۔ ادھر مریض کی نبض پر ہاتھ رکھا اور ادھر بیماری کی کیفیات وتفصیلات بیان کرنا شروع کیں۔ مریض ایک چابی والے کھلونے کی مانند اثبات میں گردن ہلاتا رہتا اور کبھی کبھی تو اتنا متاثر ہوتا کہ اس کی حرکات میں لجاجت بھی شامل ہو جاتی۔

یہاں حکیم صاحب کے ایک اور عمل کا تذکرہ بھی کر دوں لیکن اس کے لیے آپ کو مطب کا نقشہ سمجھنا ہوگا۔ کمرے کے ایک گوشے میں حکیم صاحب کی خصوصی کرسی، کرسی کی پشت پر اور بائیں جانب کمرے کی دیواریں، دائیں جانب ایک ۵×۳ فٹ کی میز۔ اس طرح گویا مریضوں کے ہجوم سے محفوظ رہنے کی ترکیب کی گئی تھی جو صرف سامنے سے آسکتے تھے۔ میز کے دوسری جانب حکیم صاحب کے نائبین حکیم عبدالحئی اور حکیم شمس الحق، ساتھ ہی تیسری کرسی پر اضافی کاموں اور مریضوں کی ترتیب قائم رکھنے کے لیے بھائی محمد احمد، حکیم صاحب کے دائیں ہاتھ میں قلم اور ایک امتحانی گتے کی چٹکی میں سفید کاغذات کی تہہ، فہرست میں مریض کا نام دیکھ کر دائیں ہاتھ سے کاغذ پر وہ نام لکھتے اور بائیں ہاتھ سے مریض کی نبض تھام لیتے۔ اب اس لکھے ہوئے نام کا قلم سے احاطہ کرتے۔ پھر اس چوکھٹے کو افقی اور عمودی لکیروں سے کاٹتے رہتے اور زبان سے مرض کی تفصیلات بیان کرتے جاتے۔ اگر بیماری پیچیدہ ہوتی تو آڑی ترچھی لکیریں بھی لگائی جاتیں۔ غرض اس طرح ورق تمام ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس ترکیب سے ارتکاز توجہ کا کام لیتے تھے۔ لیکن بعض خوش عقیدہ لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ علم جفر کا کوئی عمل کرتے ہیں، جس سے ان کو مرض کی

تشخیص میں مدد ملتی ہے۔

اس عمل کی وجہ سے مطب میں نسخہ خود نہیں لکھ سکتے تھے۔ چنانچہ مریض کے معائنے سے فارغ ہوتے ہی دواؤں کے نام زور زور سے پکارتے اور ان کا ایک نائب نسخہ لکھنے کا کام کرتا۔ تشخیصِ مرض اور تجویزِ دوا کے اس پورے مرحلے میں ان پر ایک جذب و مستی کا سا عالم طاری رہتا اور اکثر الفاظ کی تکرار کیا کرتے۔ میز کے دوسری جانب بیٹھے ہوئے نائبین کو مخاطب کرتے ہوئے، ان کے نام اس زور سے کھینچ کر پکارتے جیسے جنگل میں کسی کو آواز دے رہے ہوں۔ محمد احمد صاحب کی عُرفیت ''سلامتؔ'' تھی، چنانچہ ذرا ذرا دیر بعد مطب ''سلامت'' کی زوردار آوازوں سے گونجتا رہتا اور ادھر سے جب آہستہ سے ''جی'' کہا جاتا تو آوازوں کا یہ تضاد بڑا مزہ دیتا۔ مریضوں سے بڑی خوش مزاجی سے پیش آتے بلکہ موقع کی مناسبت سے مذاق بھی کر لیتے۔ دیہاتی مریضوں سے اردو آمیز پنجابی میں ان کی گفتگو بڑی پر لطف ہوتی تھی۔ بہر حال ان کا لقب نباض الملک نہایت مناسب تھا اور وہ بجا طور پر اس کے مستحق تھے۔

جس طرح مذہبی معاملات میں نہایت غیر متعصب تھے، اسی طرح طریقہ ہائے علاج میں سے کسی کو بھی فضول نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک طب اسلامی، ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی اور آیورویدک تمام طریقے بنی نوع انسان کی خدمت میں کوشاں ہونے کے باعث لائقِ احترام تھے۔ ایلوپیتھی کی جراحی، ایکسرے نیز دواؤں پر ریسرچ وغیرہ کے بڑے معترف تھے۔ نہ صرف بعض مُزمن امراض کی تفصیلات کی خاطر مریضوں کے بول و براز وغیرہ کا معائنہ اور ایکسرے اچھی لیبارٹریز سے کرواتے تھے بلکہ بعض انگریزی دوائیں بھی بلا تکلف اپنے نسخوں میں لکھواتے تھے۔ یورپ اور امریکہ سے شائع ہونے والی میڈیکل ریسرچ کے میگزین ان کے ہاں آتے تھے اور وہ ان کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے تھے۔ اس غرض سے انگریزی زبان کو ناکافی سمجھتے ہوئے انہوں نے باقاعدہ فرانسیسی زبان میں ڈپلومہ حاصل کیا تھا۔

آج مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے کہ میں ابتدائی چند برسوں میں حکیم صاحب کی طبی مہارت کا چنداں قائل نہ تھا۔ یوں کہیے کہ بزعم خود تعلیم یافتہ ہونے کے اعتبار سے جدید دور میں طب اسلامی کی افادیت ہی مجھے مشکوک نظر آتی تھی۔ تاہم میری یہ خام خیالی جلد ہی دور ہو گئی۔ ۱۹۵۵ء کے موسم بہار کا ذکر ہے۔ میں بی اے کا طالب علم تھا اور اپنے چھوٹے بھائی

تاثیر محمود (عرف بہبود خاں) مرحوم کو لاڑکانہ سے لا کر لاہور کے ایک سکول میں داخل کرا چکا تھا۔ چونکہ اس کا میرے ساتھ کالج ہوسٹل میں رہنا ممکن نہ تھا، اس لیے چند دوستوں کے ہمراہ شاہ جہاں روڈ کے نواح میں ایک مکان کرائے پر لے کر رہنے لگے۔ قریب ہی ایک مکان میں چک نمبر ۱۷ والے مولوی خدا بخش مرحوم و مغفور کے صاحب زادے میاں محمد سعید شاد رہتے تھے جو محکمۂ تعلیم میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ تھے۔ انہیں حکیم صاحب کے ساتھ ہمارے مراسم کا علم تھا۔ ایک شام وہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ صبح ذرا میرے ساتھ چلنا۔ حکیم صاحب کو ایک مریض دکھانا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ اس دور میں حکیموں کے چکر میں پڑے ہیں۔ لاہور شہر میں بڑے بڑے ڈاکٹر ہیں، ان میں سے کسی کو دکھایئے۔ اس پر بولے: ''شاید تمہیں امراض کی تشخیص اور علاج میں حکیم صاحب کی مہارت کا تجربہ نہیں ہے۔ جس شخص کو میں دکھانے والا ہوں وہ رحیم یار خاں کا رہنے والا ہے، انلار جمنٹ آف ہارٹ کا مریض ہے، ایک ماہ میو ہسپتال میں کرنل الٰہی بخشؒ کے زیرِ علاج رہا ہے۔ اب اسے لاعلاج قرار دے کر ہسپتال والوں نے جواب دے دیا ہے۔ اندریں حالات اس کو واپس رحیم یار خاں بھجوانے سے قبل حکیم صاحب سے مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔'' ساتھ ہی یہ اضافہ کیا: ''اب تو تم ضرور ہمارے ساتھ چلنا اور حکیم صاحب کی نبض شناسی کا تماشا دیکھنا۔''

صبح ہم لوگ تانگے میں بیٹھ کر نیّر منزل پہنچے۔ مریض چالیس کے پیٹے میں ہوگا۔ جسم مائل بہ فربہی لیکن چہرے پر مُردنی سی چھائی تھی۔ میاں سعید شاد کے ہاتھ میں ایک بڑا سا تھیلا تھا جس میں بہت سے ایکسرے اور قسم قسم کی ٹیسٹ رپورٹوں کا پلندا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں حکیم صاحب کے پاس کسی مریض کو لے کر گیا۔ ابھی وہ نئے مکان سے نکل کر مطب میں داخل ہونے کے لیے درمیانی گلی پار کر رہے تھے کہ میں نے انہیں پکڑ لیا۔ وہ مطب میں جانے کے بجائے چند قدم آگے بڑھ کر دواخانے کے راستے برابر کے چھوٹے کمرے میں آ گئے اور مریض وہاں لانے کو کہا۔ انہوں نے چند سیکنڈ کے لیے مریض کی نبض دیکھی اور کہا اسے باہر بٹھا دو۔ پھر ہم دونوں سے مخاطب ہو کر کہا: ''اس کے دل پر ورم آ گیا ہے اور معاملہ بہت بڑھ چکا ہے۔ میں دوا دیے دیتا ہوں۔ شفا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔'' یہ سنتے ہی میاں سعید صاحب نے وہ رپورٹوں والا تھیلا اُلٹ دیا۔ حکیم صاحب نے سرسری چند ایکسرے دیکھے اور بولے: ''بالکل وہی چیز ہے''۔ پھر دوا

کے استعمال کے بارے میں فرمایا: ''بکرے کی تازہ کلیجی لیں۔ اسے گودکر دیگچی میں ڈال دیں۔ پھر اتنا پانی ڈالیں جس میں وہ ڈوب جائے۔ چٹکی بھر نمک ڈال کر ابال لیں پھر اتار کر چند قطرے اس دوا کے اس میں ڈال دیں۔ ٹھنڈا ہونے کے بعد یہ پانی گھونٹ گھونٹ تمام دن پلاتے رہا کریں۔'' یہ کہہ کر تیزی سے نکلے۔ میں مطب کے دروازے تک ساتھ گیا اور سلام کر کے پھرا۔ میاں سعید نسخہ دکھا کر دواخانے سے دوا لے رہے تھے۔ ان کے پاس آیا تو وہ بولے: ''یار یہ لوگ دوائی کے پیسے نہیں لے رہے۔'' میں نے کاؤنٹر پر موجود کیشئر سے پوچھا: ''آپ پیسے کیوں نہیں لے رہے؟'' اس نے جواب دیا: ''ہمیں یہی حکم ہے۔'' میں سمجھا حکیم صاحب نے گزرتے ہوئے انہیں کوئی اشارہ کیا ہوگا۔ بہر حال ہم واپس چلے آئے۔ بعد میں تجربے سے معلوم ہوا کہ جن مریضوں سے پیسے نہیں لینے ہوتے تھے حکیم صاحب ان کے نسخوں پر کوئی نشان بنا دیتے تھے جو دواخانے والے پہچانتے تھے۔

اب میں نے اس مریض کو ٹیسٹ کیس بنا لیا جو دوا لے کر اپنے گھر رحیم یار خاں جا چکا تھا۔ ہفتے عشرے بعد جب سعید شاد صاحب سے گلی میں مڈبھیڑ ہوتی میں اس کی خیریت پوچھتا۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے بتایا: ''اس کی حالت میں خاصا افاقہ ہوا ہے۔ خط آیا تھا، دوا ختم ہو گئی تھی، میں نے وہی نسخہ دکھا کر دواخانے سے دوا حاصل کی اور اسے بھجوا دی۔'' کچھ دنوں بعد موسم گرما کی تعطیلات ہو گئیں۔ ان کے اختتام پر جب لاڑکانہ سے واپسی ہوئی تو سعید صاحب سے پھر اس مریض کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے بتایا: ''وہ بالکل تندرست ہے۔ پچھلے دنوں لاہور آیا تھا۔ تم سے ملنا چاہتا تھا لیکن تم یہاں نہیں تھے۔''

میرے عزیز دوست پروفیسر فضیلت حسین طارق کے چچا لاہور کے صفِ اوّل کے ہومیو پیتھ ڈاکٹر تھے۔ ایک دن میں کسی کام سے لاہور گیا تو فضیلت صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ کہنے لگے: ''میرے ایک چچا زاد کو عجیب قسم کی بیماری لاحق ہو گئی ہے۔ ابتدا میں تبخیر معدہ کے آثار تھے، پھر مرض بڑھتا گیا۔ پہلے ہومیو پیتھی کا علاج کیا، پھر افاقہ نہ ہونے پر ایلوپیتھ ڈاکٹروں کو دکھایا لیکن بیماری میں اضافہ ہوتا گیا۔ اب تو جنون تک نوبت پہنچ گئی ہے۔ دو بار اس نوجوان کو خودکشی کرتے ہوئے پکڑا۔ اب اس کی سخت نگرانی بھی کرنا پڑتی ہے۔ چچا کا خیال ہے کہ حکیم نیر واسطی صاحب کو دکھایا جائے۔ تم ہمارے ساتھ چلو۔'' میں نے کہا: ''اگر معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے تو

ابھی دکھائے لیتے ہیں۔'' غرض ہم دونوں مریض کو لے کر گاڑی میں حکیم صاحب کے ہاں پہنچے۔ انہوں نے نبض پکڑی اور اس نوجوان سے مخاطب ہو کر کہا: ''جو میں پوچھوں اس کا جواب دیتے جائیں۔ پیٹ سے گیس اٹھتی ہے؟ یہ گیس دل کو چڑھتی ہے؟ کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ گھبراہٹ؟ پریشانی؟ خودکشی کرنے کو بہت دل چاہتا ہے؟'' مریض ہر سوال پر ''جی، جی'' کی گردان کر رہا تھا۔ آخری سوال پر اس نے بڑے خشوع وخضوع سے اثبات میں جواب دیا۔ حکیم صاحب نے نبض چھوڑ دی اور ایک قہقہہ لگا کر پوچھا: ''تو پھر کب ارادہ ہے؟'' غرض ہفتے عشرے کے علاج سے ہی وہ نوجوان تندرست ہو گیا۔ آج کل وہ خود لاہور کا ایک معروف ہومیو ڈاکٹر ہے۔

۱۹۷۰ء میں جب حکیم صاحب بورڈ آف یونانی اینڈ آیورویدک میڈیسن کے پریذیڈنٹ بنے اور اطباء کی رجسٹریشن کا کام شروع ہوا تو اس مقصد سے انہیں پاکستان کے مختلف شہروں اور قصبوں کا دورہ کرنا ہوتا تھا۔ اب ٹھیک یاد نہیں ۱۹۷۰ء تھا یا ۱۹۷۱ء میں موسم گرما کی تعطیلات میں لاڑکانہ میں اپنے نسبتی عزیزوں کے ہاں مقیم تھا۔ اچانک خبر ملی کہ حکیم صاحب لاڑکانہ آئے ہوئے ہیں اور حکیم سراج الدین کے ہاں ٹھہرے ہیں۔ میں ان کے پاس پہنچا۔ دوپہر کا وقت تھا اور وہ طبیبوں کے انٹرویو میں بے طرح مصروف تھے۔ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ بولے: ''ارے یار! تو یہاں آیا ہوا ہے!'' معلوم ہوا کہ صرف ایک روز اور قیام کریں گے۔ میں نے اگلے دن دوپہر کے کھانے کی دعوت دی جو انہوں نے بے حد مصروفیت کے باوجود میرا دل رکھنے کے لیے قبول کر لی۔ اب یہ کیسے ممکن تھا کہ حکیم صاحب آئیں اور مریضوں کا ازدحام نہ ہو۔ یہ تو کنواں پیاسوں کے پاس آنے والی بات تھی۔ میرے ''نا، نا'' کرنے کے باوجود عزیزوں اور محلے داروں میں آٹھ دس خواتین اور چھ سات مرد جمع ہو گئے۔ کھانے کا انتظام دوسری منزل پر تھا۔ نیچے ہال کمرے میں مستورات سفید چادریں اوڑھ کر چارپائیوں پر دراز ہو گئیں۔ اچھا خاصا گنج شہیداں کا منظر تھا۔ مرد حضرات شریکِ طعام تھے۔ حکیم صاحب کے آتے ہی میں ان کو ''زنانہ وارڈ'' میں لے گیا۔ دیکھتے ہی بولے: ''ارے یار! تو نے تو ہسپتال بنا رکھا ہے۔'' اب انہوں نے ایک سرے سے نباضی کا کمال دکھانا شروع کیا۔ بیمار خواتین کو مطمئن کرنا دنیا کے مشکل ترین کاموں میں سے ہے۔ ایک تو کریلا دوسرے نیم چڑھا۔ اسے حکیم صاحب کا اعجاز کہیے کہ ایک مریضہ بھی ایسی نہ تھی جو اپنے امراض کی تشخیص سے غیر مطمئن ہو۔ خیر یہاں سے نمٹ کر اوپر گئے۔ کھانے سے فراغت

پا کر انہوں نے زنانہ وارڈ کے بیڈ نمبروں کی ترتیب کے حوالے سے بعض خواتین کے بارے میں اضافی ہدایات دیں۔ اب مردوں کی باری آئی۔ یہاں بھی حکیم صاحب نے ان کی برسوں پرانی شکایات اور کہنہ امراض کے بارے میں عجیب وغریب انکشافات کیے۔ ایک صاحب کی نبض، جنہیں کچھ عرصے سے پیٹ میں ہلکے ہلکے درد کی شکایت تھی، حکیم صاحب نے صرف چند سیکنڈ کے لیے دیکھی اور پھر اسے چھوڑ کر اگلے مریض پر مصروف ہو گئے۔ میں سمجھا کہ ان صاحب کی بیماری معمولی ہے اس لیے پچانے توجہ نہیں دی کیونکہ میرا تجربہ تھا کہ جتنا پیچیدہ مرض ہوتا اتنا ہی ان کا دماغ زیادہ کام کرتا تھا اور وہ اس کی باریکیاں تک بیان کرتے تھے لیکن جب ہم انہیں الوداع کہنے نیچے اترے تو گاڑی میں بیٹھنے سے قبل انہوں نے مجھے سینے سے لگاتے ہوئے میرے کان میں سرگوشی کی: ''جن صاحب کو دردِ شکم کی شکایت ہے ان کے پیٹ میں کینسر ہے۔''

میں نے یہ بات اپنے تک محدود رکھی کیونکہ وہ صاحب میرے نسبتی پچا تھے۔ کچھ عرصے کے بعد لاڑکانہ کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ ان کی تکلیف بڑھ گئی تھی اور وہ جام شورو ہسپتال میں داخل ہیں۔ چند ماہ بعد ان کا کینسر سے انتقال ہو گیا۔

ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ حکیم صاحب نے مجھ سے بھی حقیقت پوشیدہ رکھی۔ قصہ یہ تھا کہ ہمارے کالج کے ایک پرانے شاگرد کی ہمشیرہ بیمار ہوئیں۔ کچھ عرصہ اِدھر اُدھر علاج کرانے کے بعد انہیں شیخوپورہ کے سرکاری ہسپتال میں داخل کرایا گیا۔ لیکن متعدد ایکسرے اور متفرق ٹیسٹ کرانے کے بعد بھی جب مرض کا تعین نہ ہو سکا تو حکیم صاحب سے مشورہ کرنے کا فیصلہ ہوا۔ انہوں نے مجھ سے ساتھ چلنے کی درخواست کی۔ جاتے ہی حکیم صاحب نے مجھ سے دریافت کیا: ''مریضہ تیری کیا لگتی ہے؟'' میں نے دفع الوقتی کے لیے کہہ دیا کہ ''خالہ زاد بہن ہیں''۔ اب حکیم صاحب نے نبض تو دیکھ لی لیکن خلافِ معمول نسخہ نہیں لکھا۔ مجھ سے اِدھر اُدھر کی ہانکتے رہے اور دوسرے مریض دیکھتے رہے۔ کچھ دیر بعد میں نے دوا کے لیے اصرار کیا تو کہنے لگے: ''یار تم انہیں ہسپتال میں داخل کیوں نہیں کرا دیتے۔'' میں نے کہا: ''دس دن تو شیخوپورہ ہسپتال میں رہی ہیں۔ اب ہم ہسپتال نہیں جائیں گے۔ آپ ہی علاج کریں۔'' میری ضد دیکھ کر بولے: ''اچھا تو ایسا کریں، ڈاکٹر عالمگیر کو دکھا دیں۔ میں رقعہ لکھ دیتا ہوں۔'' میں نے کہا: ''ہم نہیں جاتے۔ آپ رقعہ نہ لکھیں، نسخہ لکھ دیں۔'' پھر کچھ مریض دیکھتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد پھر متوجہ ہوئے اور کہا: ''یار! ضد نہیں کرتے۔

بات یہ ہے کہ ان کا مرض میری سمجھ میں نہیں آیا۔تم ایک بار ڈاکٹر عالمگیر کو دکھالو۔'' مجھے غصہ آ گیا۔ اس لیے کوئی جواب نہیں دیا۔خاموشی نیم رضا۔انہوں نے موقع غنیمت سمجھا اور نعرہ لگایا: ''مولوی عبدالحئی!'' عبدالحئی صاحب نے میز کی دوسری جانب سے پیڈ بڑھایا۔حکیم صاحب نے چند سطریں گھسیٹیں۔سیدھی سی معائنہ و معالجہ کی درخواست تھی۔صاف ظاہر تھا کہ جان چھڑانے کی کوشش کر رہے ہیں۔اتنے میں مولوی عبدالحئی لفافے پر ڈاکٹر عالمگیر کے گھر کا پتا لکھ چکے تھے۔عصر کا وقت تھا۔ہم لوگ گاڑی میں سیدھے ڈاکٹر صاحب کے ہاں پہنچے۔انہوں نے اچھی طرح معائنہ کیا اور ایک لمبا سا نسخہ لکھ دیا۔کچھ انجکشن، کچھ دوائیں۔ہم شیخوپورہ لوٹ آئے۔

اب آگے کی سنیے۔دو دن گزرے تھے کہ مریضہ کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔پھر ڈاکٹر عالمگیر صاحب کے پاس لے جایا گیا۔انہوں نے چٹ لکھ دی کہ میو ہسپتال میں داخل کرا دیں۔ اب وہاں ٹیسٹ در ٹیسٹ اور ایکسرے در ایکسرے کا چکر شروع ہوا۔میں اس تمام پیش رفت سے بے خبر تھا۔اتفاق ایسا ہوا کہ چند روز بعد ایک گل محمد قسم کا دوست آ گیا کہ حکیم صاحب کو مریض دکھانا ہے۔میری چچا سے خفگی دور نہیں ہوئی تھی اس لیے جانے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن مجبوری۔چپ چاپ ساتھ ہو لیا۔حکیم صاحب نے دیکھتے ہی سوال کیا: ''وہ تیری بہن کیسی ہیں؟'' میں نے مختصراً جواب دیا: ''اچھی ہیں!'' انہوں نے یہ سن کر ایک فلمی قہقہہ لگایا اور بغیر کوئی بات کیے، نیا مریض دیکھ کر مجھے فارغ کر دیا۔اب کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ چوتھے پانچویں دن کوئی مریض نکل آتا اور وہ بھی ایسا کہ زمین ٹلد آسمان ٹلد من نہ ٹلم۔اب ہوتا یہ کہ جب میں کسی نئے مریض کے ساتھ حکیم صاحب کے پاس پہنچتا وہ وہی سوال داغتے: ''تیری بہن کیسی ہیں؟'' اور میں جواب میں کہتا: ''بہتر ہیں۔'' اور پھر ان کا وہی بلند مگر کھوکھلا قہقہہ جو میرے فہم سے بالا تھا اور میں اسے ان کی مجذوبانہ کیفیت پر محمول کر کے کوئی اہمیت نہ دیتا۔

کوئی بیس پچیس دن کی سخت کاوش و جستجو کے بعد ڈاکٹر اس نتیجے پر پہنچے کہ مریضہ کو کینسر ہے اور اس تشخیص کے چند ہی روز بعد وہ سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئیں۔اس واقعے کے کچھ دن بعد میرا حکیم صاحب کے پاس جانا ہوا۔وہاں وہی سوال میرا منتظر تھا: ''تیری بہن کیسی ہیں؟'' میں نے عرض کیا: ''پچھلے ہفتے ان کا انتقال ہو گیا۔'' آج ان کا قہقہہ کھوکھلا نہ تھا۔ایک طویل اور بھرپور قہقہہ ختم ہوتے ہی بولے: ''ارے یار! اس کو تو کینسر تھا۔''

اب ایک دوسری قسم کا واقعہ بھی سن لیجیے۔ میرے عزیز شاگرد تنویر عباس تابش ان دنوں یونائیٹڈ بینک میں تھے۔ ایک سہ پہر وہ گھبرائے ہوئے آئے اور بولے: ''میری والدہ صاحبہ علیل ہیں۔ کئی دن سے ہسپتال میں داخل ہیں۔ پیٹ بہت پھولا ہوا ہے۔ آج ڈاکٹروں نے کینسر تشخیص کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ حکیم صاحب کو دکھا دیا جائے۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔'' اتفاق سے اس شام میں ایک ایسی تقریب میں مدعو تھا جہاں میری حاضری اشد ضروری تھی، اس لیے میں نے تابش سے کہا: ''بھائی! اگر میری بجائے، آپ میرا رقعہ لے جائیں تو ہرگز کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ رقعہ کی بھی ضرورت نہیں۔ اگر آپ حکیم صاحب سے یہ کہہ دیں گے کہ ہمیں اس نے بھیجا ہے تو بہت کافی ہے۔'' انہوں نے میری مجبوری کے پیش نظر کہا: ''اچھا آپ رقعہ ہی دے دیں۔'' میں نے رقعہ دے دیا اور تاکید کر دی کہ وہاں سے واپسی پر مجھے صورتحال سے آگاہ کر دیں۔ نمازِ عشاء کے بعد وہ پھر آئے۔ بڑے خوش تھے اور بہت متاثر۔ انہوں نے ڈرامائی کیفیت کے ساتھ سارا واقعہ سنایا۔ مختصراً یہ کہ حکیم صاحب نے نبض دیکھی۔ پھر پیٹ کو تھپتھپایا اور خلا میں گھورتے ہوئے بولے: ''پانی ہے!'' تین چار بار اس عمل کی تکرار کی جیسے اپنے آپ کو یقین دلا رہے ہوں۔ پھر مشورہ دیا: ''آپ کی والدہ کو استسقا کا مرض ہے۔ اگر آپ فوری آرام چاہتے ہیں تو ہسپتال لے جا کر نلکی کے ذریعے پانی نکلوا دیں۔ اگرچہ اس عمل کے بعد دوبارہ پانی جمع ہونے کا خدشہ رہتا ہے۔ لیکن ہمارے طریق علاج میں تو کچھ وقت لگے گا۔'' تابش نے کہا: ''قبلہ ہم تو ہسپتال جانے کے نہیں۔ وہاں تو ہمیں کینسر بتایا گیا ہے۔'' حکیم صاحب نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا: ''غلط! بالکل غلط! ایک دم بکواس!'' دو ایک مریض دیکھ کر پھر تابش سے مخاطب ہوئے: ''اگر آپ کہیں تو میں علاج کروں۔'' ''جی! ضرور کیجیے!'' پھر کچھ توقف کے بعد کہا: ''اچھا! تو میں علاج شروع کروں؟'' ''جی ہاں! ضرور!!'' پھر کچھ سوچ کر بولے: ''امام رضاؑ کی بیاض سے ایک نسخہ استعمال کرتا ہوں۔'' ''جی بہتر!'' ایک آدھ مریض دیکھا۔ پھر دریافت کیا: ''اونٹنی کا دودھ مل جائے گا؟'' ''جی! مہیا کریں گے جیسے بھی بن پڑا۔''

مختصر یہ کہ حکیم صاحب نے چند پڑیاں دیں جن کا بدرقہ اونٹنی کا دودھ تھا۔ اگلے دن شام کو سبز رنگ کے دست جاری ہو گئے اور پیٹ ایسا ہو گیا جیسے غبارے میں سے ہوا نکل گئی ہو۔ حکیم

صاحب کو اطلاع دی گئی۔ انہوں نے دوا تبدیل کر دی اور نئی دوا تین روز کھانے کی ہدایت کی۔ پھر مدت العمر اس عفیفہ کو یہ مرض لاحق نہیں ہوا۔

اب ایک آنکھوں دیکھا واقعہ سنا کر میں یہ سلسلہ ختم کرتا ہوں۔ ایک بار میں حکیم صاحب کے پاس مطب میں فراغت کے ساتھ بیٹھا تھا کیونکہ کوئی مریض ساتھ نہ تھا۔ وہ معمول کے مطابق مریضوں کا معائنہ کر رہے تھے۔ ایک خاتون کی نبض دیکھ کر اس کے شوہر سے انہوں نے کہا: ''آپ کی اہلیہ کے پتے میں پتھریاں ہیں۔ آپریشن کروانا پڑے گا۔'' یہ سن کر اس شخص نے ایکسرے کی رپورٹ پیش کی جس سے حکیم صاحب کی بات کی تصدیق ہوتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں کوئی نسخہ لکھنے کا سوال نہ تھا لیکن وہ شخص جم کر بیٹھ گیا۔ اس کا اصرار تھا کہ آپ خود علاج کریں۔ ہم آپریشن نہیں کروائیں گے۔ حکیم صاحب وقفے وقفے سے اس کو آپریشن کرانے کی تلقین کرتے رہے۔ آخر وہ روہانسا ہو کر بولا: ''حکیم صاحب! میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس دور کے بوعلی سینا ہیں اور یہ بات میں کسی خوشامد کی بنا پر نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ میرا اس پر ایمان کی حد تک یقین ہے۔ اگر آپ کے پاس اس مرض کا علاج نہیں ہے تو پھر اس کا علاج ممکن ہی نہیں ہے۔'' اس شخص نے یہ بات نہایت متاثر کن انداز میں کہی جسے سن کر حکیم صاحب نے سر جھکا لیا جیسے مراقبے میں چلے گئے ہوں۔ ذرا دیر بعد سر اٹھا کر کہا: ''آپ نے بہت بڑی بات کہہ دی ہے۔ آپ کو ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔'' اس شخص نے اپنی بات پر پھر اصرار کیا۔ میں بڑی دلچسپی سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ آخر وہ شخص جیتا اور حکیم صاحب ہارے۔ چنانچہ نسخہ لکھ کر دے دیا گیا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

اس واقعے کے اڑھائی تین ماہ بعد کا ذکر ہے کہ میں حسب معمول ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو مطب میں وہی شخص موجود تھا اور اس کے پاس اپنی اہلیہ کا تازہ ایکسرے تھا۔ میں نے اسے پہچان کر کیفیت دریافت کی۔ وہ بڑی عقیدت سے کہنے لگا: ''میری بات غلط نہیں تھی۔ یہ تازہ ایکسرے اور رپورٹ دیکھ لیں۔ اب پتے میں پتھریوں کا نام ونشان بھی نہیں ہے۔''

حکیم صاحب دیسی مرکب دوائیں اپنی نگرانی میں تیار کرواتے تھے اور اس غرض سے علیحدہ عملہ ملازم تھا۔ ان کے دواخانے کا نام ''دیسی دواخانہ'' تھا۔ ان کی تیار کردہ دوائیں خاصی قیمتی ہوتی تھیں اور ان کے نام بھی مخصوص ہوتے تھے۔ مثلاً شربتِ تریاقِ صدر، تریاق دماغ، قرصِ بنفشہ،

قرصِ اوجاع وغیرہ۔ وہ مریض کے معائنے اور مرض کی تشخیص کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے، البتہ دواخانے میں دوائی کی قیمت وصول کی جاتی تھی لیکن اس معاملے میں بھی ان کا اصول پرانے اطبا کا سا تھا یعنی ایک دوا متمول آدمیوں کو جس قیمت پر ملتی تھی، وہی دوا کسی طالب علم کو اس سے نصف قیمت پر اور کسی غریب آدمی کو چوتھائی قیمت پر دی جاتی تھی۔ مزید برآں کوئی بیس پچیس فیصد مریض مفت دوا حاصل کرتے تھے۔ وہ یوں کہ حکیم صاحب کے قائم کردہ اصول کے تحت کسی شاعر، ادیب، طبیب، فنکار، صحافی، عالم، سماجی یا سیاسی کارکن اور بڑی حد تک سرکاری ملازم سے دوائی کی قیمت وصول نہیں کی جاتی تھی اور اس فہرست میں چھوٹے بڑے یا امیر غریب کی کوئی قید نہ تھی۔ اس غرض سے وہ ہر مریض سے اس کا پیشہ اور سکونت ضرور دریافت کر لیتے تھے۔ پیشوں کی طرح سکونت میں بھی رعایت ملحوظ رکھی جاتی تھی۔ مثلاً اگر کوئی شخص شرقپور کا رہنے والا ہے تو اس کو دوا مفت ملے گی کیونکہ وہاں حکیم صاحب کے مرجع عقیدت حضرت میاں شیر محمد آسودۂ خواب ہیں۔ مجھ پر شفقت کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی مریض میرے ساتھ جائے یا میرا رقعہ لے جائے یا میرا نام لے دے تو اس سے کوئی پیسہ نہیں لیا جاتا تھا۔ حد یہ تھی کہ اگر کسی شخص سے سکونت پوچھی اور اس نے شیخوپورہ کا نام لیا تو اس سے از خود میرا نام لے کر پوچھتے تھے کہ اس کو جانتے ہو؟ اگر وہ کچھ سوچنے لگتا تو اتا پتا بتاتے کہ کالج میں پڑھاتا ہے۔ اس صورت میں اگر مریض یا اس کا کوئی ساتھی جان چھڑانے کے لیے جھوٹ موٹ بھی کہہ دیتا کہ ہاں جانتے ہیں تو اس سے بھی دوا کی قیمت لینا ممنوع ٹھہرتا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس زر پرستی اور خود غرضی کے دور میں ان کی یہ وضعداری اور دوست نوازی صحرا میں چشمۂ صافی کا حکم رکھتی تھی۔ ان کی انہی خوبیوں کے باعث شورش کاشمیری مرحوم نے اپنے ہفت روزہ ''چٹان'' میں لکھا تھا کہ آج کل ''نیرّ واسطی تنہا وجود ہیں جنہیں مل کر یہ احساس قوی ہوتا ہے کہ قدرتِ کاملہ نے ان لوگوں کو پیدا کرنے کے بعد وہ سانچہ ہی توڑ دیا جس میں اس قسم کے انسان ڈھلا کرتے تھے۔''

سچ ہے، ایسے ہی لوگوں کے لیے کہا گیا ہے کہ ''رفتند و آدمیت رابخاک بردند''۔

۲۶ مئی ۱۹۸۲ء وہ اندوہناک دن تھا جب اس بے نظیر نباض، بے بدل طبیب اور بلند پایہ انسان نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کے جسدِ خاکی کو نیرّ منزل کے قریب قلعہ لاہور کے شمالی جانب شیر شاہ ولی کے مزار کے احاطے میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ اللہ اکبر:

ع زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

اللہ تعالیٰ اس مرحوم کو اپنے انوار کی بارش سے شرابور کرے۔ آج بھی جب کوئی عزیز یا دوست کسی ایسے مرض میں مبتلا ہوتا ہے جس کی تشخیص میں دشواری پیش آتی ہے یا جب نہایت قیمتی دواؤں سے بھی کسی مریض کو افاقہ نہیں ہوتا تو ان کی یاد ٹوٹ کر آتی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر دوسری دنیا میں اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ان سے ملاقات میسر ہوئی تو وہ مجھے دیکھتے ہی ایک فرمائشی قہقہہ لگائیں گے اور پھر کہیں گے: ''ارے یار! تو بہت دنوں میں آیا۔''

حواشی

۱- میرے گھر کا نام جو دادا جان کے نام محمود اور والد کے نام داؤد کی مناسبت سے رکھا گیا تھا۔ حکیم صاحب مجھے ہمیشہ اسی نام سے پکارتے تھے۔

۲- مؤلفِ کتاب ''اٹھارہ سو ستاون'' لاہور اور ملتان کے ڈپٹی کمشنر بھی رہے۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۶۶ء کو وفات پائی۔

۳- غالباً انگوری باغ سکیم نام تھا۔

۴- '' مجھے، اس وادی میں ہما کے وجود کی خوشخبری دینے والے (تجھے شاید علم نہیں کہ) آزاد منشی کے باعث ہما کا سایہ بھی مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔''

۵- ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش، مشہور ماہر امراضِ قلب، قائداعظم کے ذاتی معالج رہے تھے۔ کتاب ''قائداعظم کے آخری ایام'' ان کی یادگار ہے۔ ۴ اپریل ۱۹۶۰ء کو دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوا۔

۶- بابت ۱۴ اپریل ۱۹۷۵ء

صاحبِ اکرام

اکرام حسن خاں (۱۸۹۵ء-۱۹۹۴ء)

یہ ۱۹۵۹ء کا سال تھا۔ میں اورینٹل کالج کی ایم اے فارسی کی کلاس میں داخل ہوا۔ ستمبر میں کلاسیں شروع ہوئیں تو ہم جماعتوں میں ایک صاحب اپنے دھیمے لہجے اور مہذب اطوار کے باعث منفرد نظر آئے۔ نام تھا اشتیاق حسن خاں۔ کچھ دن بعد ان سے گفتگو کا موقع ملا تو پتا چلا کہ ان کا تعلق ریاست جے پور سے ہے۔ ٹونک اور جے پور کا تعلق گھر آنگن کا سا تھا اس لیے مجھے قدرتی طور پر دلچسپی پیدا ہوئی اور میں نے ان کے خاندان کے بارے میں دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ ان کے والد اکرام حسن خاں جے پور میں ناظم (ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ) کے عہدے پر فائز تھے اور دادا خان بہادر اشفاق حسن خاںؒ ریاست جے پور کے وزیر مال رہے تھے۔ مجھے یہ نام سنا ہوا محسوس ہوا۔ ایک لمحے کو یادداشت پر زور دیا تو اشتیاق بولے، وہ سر اسرار حسن خاںؒ کے چھوٹے بھائی تھے۔ یہ سن کر تعارف مکمل ہو گیا۔ اسرار حسن خاں سول سروس کا معروف نام تھا۔ وہ ایک عرصے تک ریاست بھوپال کے نصیر المہام (ہوم منسٹر) رہنے کے بعد آخر میں ریاست خیر پور کے وزیر اعظم ہو گئے تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۳۴ء میں ہوا۔ اس خاندان کا وطن شاہجہاں پور تھا جہاں کئی پشت پہلے ان کے ایک بزرگ جہانداد خاں بہ عہد شاہجہاں (۵۸-۱۶۲۸ء) علاقہ یوسف زئی (صوبہ سرحد) سے آ کر بس گئے تھے۔

لاہور میں میری حیثیت مسافر کی سی تھی۔ وولنر ہوسٹل میں قیام تھا۔ حسن (میں اختصار کی غرض سے اشتیاق حسن خاں کو اسی نام سے یاد کروں گا) اپنے والدین کے ساتھ فیروز پور روڈ پر

مقیم تھے۔ تعارف کو کچھ دن گزرے تو انہوں نے اپنے جذبۂ دوست نوازی (اور شاید مسافر نوازی بھی) کے تحت اپنے گھر چلنے کا تقاضا شروع کیا۔ میں پہلے تو اپنی عادت کے مطابق ٹال مٹول سے کام لیتا رہا لیکن پھر ان کے پرخلوص اصرار کے آگے سپر انداز ہونا پڑا۔ طے یہ پایا کہ میں اتوار کے دن صبح نو اور دس بجے کے درمیان ان کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ جاؤں گا۔ مقصد یہ تھا کہ اتوار کو تعطیل کے باعث حسن کے دوسرے بھائی بھی گھر پر موجود ہوں گے اور ان سب سے بھی تعارف ہو جائے گا۔

میں حسب وعدہ فیروز پور روڈ کے نہر والے بس سٹاپ پر اترا، جو ایف سی کالج سٹاپ کہلاتا تھا۔ ذرا آگے چل کر بائیں جانب ایک راستہ سڑک سے نیچے اترتا تھا۔ اس پر چند کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک پر جس کا نمبر ۷۱ تھا، الحاج محمد اکرام حسن خاں کے نام کی تختی لگی تھی۔ ماسوائے سب سے بڑے بھائی ڈاکٹر افضال حسن خاں صاحب کے جو لاہور سے باہر تھے حسن اور ان کے تین بڑے اور تین چھوٹے بھائیوں سے ملاقات ہوئی۔ سب بھائیوں کے نام کا دوسرا جزو ''حسن'' تھا اور سبھی تہذیب و شائستگی سے آراستہ تھے۔ ان ''حسنات'' سے دلچسپ گفتگو کا سلسلہ جاری تھا کہ ان کے والد محترم تشریف لے آئے۔ ہم سب احتراماً کھڑے ہو گئے۔ میں انہیں دیکھ کر بڑا حیران ہوا۔ وہ کسی انداز سے بھی ریٹائرڈ کمشنر معلوم نہ ہوتے تھے۔ اکہرا جسم، درمیانہ قد، نورانی چہرے پر شرعی ڈاڑھی، چہرے پر زہد و تقویٰ کی علامات، کرتے پاجامے اور ململ کی ٹوپی میں ملبوس۔ ان کی شخصیت میں وقار اور انکسار کا انوکھا امتزاج تھا۔ اگر آپ نے علی میاں (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) کو ان کی عمر کے آخری برسوں میں دیکھا ہے یا اس دور کی تصویر دیکھی ہے تو یوں سمجھ لیجیے کہ آپ نے الحاج اکرام حسن خاں کو دیکھ لیا۔ وہ میرے ساتھ نہایت شفقت اور کمال مہربانی سے پیش آئے۔ ریاست ٹونک سے پاکستان منتقلی، والد کے انتقال اور میری تعلیم کے بارے میں پوچھتے رہے۔ کچھ دیر بعد دوپہر کے کھانے کی گھنٹی بجی تو ہم سب نے کھانے کے کمرے کا رخ کیا جو دوسری منزل پر تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ میں اور حسن دیوان خانے میں باتیں کرتے رہے۔ عصر کی چائے پی کر مغرب سے قبل میں واپس ہوسٹل پہنچ گیا۔

میں اکثر اتوار کی چھٹی اپنے گاؤں میں گزارتا تھا۔ اگر کسی اتوار کو گاؤں جانا نہ ہوتا تو حسن

کے ہاں چلا جاتا۔ وقفہ طویل ہونے کی صورت میں حسن بتاتے: ''پاپا آپ کو یاد کر رہے تھے اور خیریت پوچھ رہے تھے۔''

اکتوبر ۱۹۶۰ء میں میرا تقرر بطور لیکچرار گورنمنٹ کالج مظفر گڑھ ہو گیا۔ وہاں سے جب کسی سلسلے میں لاہور آنا ہوتا تو میں حسن کے پاس ٹھہرتا اور یوں ان کے والد صاحب کی زیارت اور بھائیوں سے تجدید ملاقات کا موقع مل جاتا۔ اس طرح اس بزرگ شخصیت کے اوصاف حمیدہ مجھ پر منکشف ہوتے چلے گئے۔ وہ اپنے بارے میں کبھی کوئی گفتگو نہیں کرتے تھے لیکن میں اپنی دلچسپی کے باعث ان کے سوانحی حالات اور گزشتہ واقعات کے بارے میں حسن بھائی اور ان کے برادران بالخصوص عزیزی احمد حسن خاں سے دریافت کرتا رہتا تھا۔

اکرام حسن خاں کی ولادت ۱۹ جون ۱۸۹۵ء (۲۵ ذی الحجہ ۱۳۱۲ھ) کو ہوئی۔ ان سے دو سال بعد ان کے برادر خورد سلطان حسن خاں اور پھر دو سال بعد ان کی ہمشیرہ سلطان جہاں بیگم متولد ہوئیں۔ ابھی سات برس کے تھے کہ ۱۷ اگست ۱۹۰۲ء کو ان کی والدہ وفات پا گئیں۔ اس وقت بہن صرف تین سال کی تھیں اس لیے انہیں ان کے ننہال والوں نے اپنی آغوش شفقت میں لے لیا اور ہمیشہ اپنی کفالت میں رکھا۔[۴] والد نے دوسری شادی کر لی تھی۔ ان کا قیام اپنی ملازمت کے سلسلہ میں مختلف مقامات پر رہتا تھا اس لیے اکرام حسن خاں کی تعلیم مراد آباد، آگرہ، بھرت پور اور علی گڑھ میں ہوئی۔ علی گڑھ سے انٹر کیا تھا کہ تحریک خلافت سے دلچسپی پیدا ہو گئی اور اس میں سرگرم حصہ لینے لگے۔ یہ سرگرمی ان کی تعلیم کی تکمیل میں رکاوٹ بنی اور پھر سرکاری ملازمت میں بھی مزاحم ہوئی۔ ۱۷ جنوری ۱۹۱۹ء کو پھوپھی زاد سے ان کی شادی انجام پائی۔ شاہجہاں پور میں تجارت کا سلسلہ شروع کیا جو پانچ سال تک جاری رہا لیکن مزاج کاروباری نہ تھا اس لیے یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ اس اثنا میں تین فرزند متولد ہوئے۔ سب سے بڑے افضال حسن خاں کو ان کے نانا نے گود لے لیا کیونکہ وہ اولاد نرینہ سے محروم تھے۔ ۱۹۲۴ء میں اکرام حسن خاں جے پور پہنچے جہاں ان کے والد وزارت کے عہدے پر فائز اور نہایت نیک نام تھے۔ وہ مسلمان نوجوانوں کو ملازمت دلوانے میں خاصی دلچسپی لیتے تھے لیکن اپنی اصول پسندی کی بنا پر بیٹے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ بالآخر سر گوپی ناتھ (منسٹر پی ڈبلیو ڈی) نے ریاست کی ریجنسی کونسل[۵] کے صدر آئی آر گلینسی[۶] سے کہہ کر محکمہ کسٹم اینڈ ایکسائز میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ رکھوا دیا۔ ۱۹۲۹ء میں وہ ریاست کی سول

سروس کے لیے منتخب ہوئے۔ ٹریننگ کے لیے مراد آباد بھجوائے گئے اور ۱۹۳۰ء کے آغاز میں بحیثیت ناظم سانبھر[7] پہلا تقرر رہوا۔ اگلے ہی سال ۷ اگست ۱۹۳۱ء کو ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔

سانبھر سے خاں صاحب کا تبادلہ بطور ناظم شیخاواٹی ہوا جس کا صدر مقام جھنجھنوں تھا۔ یہ جگہ اس لحاظ سے بڑی اہم تھی کہ سر پھرے راجپوت سرداروں کے ساتھ ساتھ برعظیم کے متعدد بڑے بڑے صنعتکار مثلاً برلا، ڈالمیا وغیرہ یہیں کے باشندے تھے۔ ایک طرف ٹھاکروں کی مونچھ کا سوال دوسری طرف سیٹھوں کے سرمائے کی ریل پیل۔ کھل کھیلنے والے افسروں کے لیے پسندیدہ جگہ تھی لیکن خاں صاحب نے بڑی دیانت داری اور غیر جانبداری سے وقت گزارا اور بہت سی آزمائشوں کے باوجود ثابت قدم رہے۔ تین برس کے بعد پھر سانبھر تبادلہ ہوا۔ اس مرتبہ یہاں ساڑھے چھ سال تک صحیح معنوں میں لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتے رہے۔[8]

فروری ۱۹۴۰ء میں گنگا پور تبادلے کے احکام ملے۔ جس جذباتی انداز میں سانبھر کے عوام و خواص نے انہیں رخصت کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ سرکاری افسر کی مقبولیت کا پتا اس کے تبادلے یا سبکدوشی کے وقت چلتا ہے ورنہ چڑھتے سورج کی پوجا کے مصداق نئے آنے والے افسروں کی راہ میں تو سب آنکھیں بچھاتے ہیں۔ سانبھر کے نزدیک پھلیرہ جنکشن سے انہیں (اجمیر سے آگرہ براستہ جے پور جانے والی) ایکسپریس ٹرین پر سوار ہونا تھا جس کا وقت مغرب کا تھا۔ اتفاق سے رمضان کا مہینہ تھا۔ خاں صاحب نے افطار میں زحمت کے خیال سے مسلمانوں کو پھلیرہ پہنچنے سے منع کیا لیکن کون سنتا تھا۔ مسلم اور غیر مسلم کی تخصیص کیے بغیر وہ ازدحام تھا کہ سٹیشن میں داخل ہونے کی گنجائش نہ رہی۔

گنگا پور میں تین برس قیام کے بعد مہاراجہ نے بذاتِ خود خاں صاحب کا انٹرویو لے کر ان کی ترقی کا حکم صادر کیا چنانچہ ریونیو کمشنر ہو کر جے پور میں تقرر ہوا۔[9] گنگا پور سے روانگی کا منظر بھی نرالا تھا۔ ریلوے سٹیشن پر الوداع کہنے والے جم غفیر کا والہانہ انداز اور خاں صاحب کا انکسار قابل دید تھا۔ فرنٹیئر میل کو خاصا لیٹ ہونا پڑا۔ بمشکل پولیس نے دورویہ کھڑے ہو کر ٹرین تک راستہ بنایا۔ سچ ہے:

ے جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ

موصوف کا آئندہ تبادلہ ۱۹۴۴ء کی آخری سہ ماہی میں محکمہ کسٹم وایکسائز میں ہوا۔ اس کا سربراہ ایک بااثر شخص تھا جو رشوت کا رسیا بھی تھا اور بدزبان بھی۔ وہ خاں صاحب سے "تعاون" کی توقع رکھتا تھا مگر یہاں تو یہ خانہ ہی خالی تھا۔ چنانچہ ابتدا میں کئی بار تلخ کلامی ہوئی لیکن وہ ان کی بے غرضی اور اصول پرستی کی بنا پر کوئی نقصان نہ پہنچا سکا۔ بالآخر اسے یقین ہو گیا کہ اس شخص سے کوئی ناجائز کام لینا ممکن نہیں۔

۱۹۴۷ء میں ملک کو آزادی کی منزل نصیب ہوئی اور پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ خاں صاحب کے دو فرزند افضال حسن خاں اور اقبال حسن خاں آگرہ میڈیکل کالج میں زیرِ تعلیم تھے۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں آگرہ فسادات کی لپیٹ میں آ گیا۔ دونوں بھائی جے پور آنے کے لیے روانہ ہوئے۔ بھرت پور سٹیشن پر بلوائیوں نے ٹرین پر حملہ کیا۔ بمشکل جانیں بچیں۔ اب آگرہ میں تعلیم جاری رکھنے کی کوئی صورت نہ تھی، چنانچہ دونوں کو لاہور بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔ جے پور کے کسی ہندو سیٹھ نے ملتان سے اپنے رشتہ داروں کو لانے کے لیے ایک ہوائی جہاز چارٹر کیا تھا۔ یہ دونوں اسی جہاز پر ملتان آئے۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، لاہور کے پرنسپل کرنل الٰہی بخش ؒ تھے۔ آئی یو خاں ؒ مرحوم کی اعانت سے مائیگریشن کا مسئلہ حل ہوا۔

ادھر جے پور میں خاں صاحب کی ملازمت کو چوبیس سال ہو رہے تھے۔ پنشن حاصل کرنے کے لیے ۲۵ سالہ مدت درکار تھی۔ چنانچہ انھوں نے مارچ ۱۹۴۸ء میں تین ماہ کی رخصت لی اور اہلِ خانہ کو لے کر لاہور آ گئے۔ جون میں رخصت کے اختتام پر واپس گئے اور پچیس سالہ ملازمت کی تکمیل پر ریٹائرمنٹ کی درخواست گزار دی۔ ان کے بلند کردار اور اچھی شہرت کے باعث متعلقہ وزیر نے ان کو بلوا کر ملازمت جاری رکھنے پر اصرار کیا لیکن وہ اپنے فیصلے پر قائم رہے اور جولائی ۱۹۴۹ء میں سبکدوش ہو کر مستقل طور پر لاہور چلے آئے۔ یہاں آ کر کسی مناسب ملازمت کے لیے درخواست دی لیکن دو سال تک کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ یہ دو برس کا عرصہ خاں صاحب کے لیے ایک امتحان تھا صبر وقناعت اور تسلیم و رضا کا۔ ماشاء اللہ بھرے گھر کا خرچ، آٹھ فرزندوں کی تعلیم کے اخراجات۔ جے پور والی پنشن تو کوئی آٹھ برس بعد جاری ہو سکی۔ متروکہ املاک کے دعاوی کی منظوری اور اس کے عوض اراضی کی الاٹمنٹ کی منزل بھی دور تھی۔ بہرحال انھوں نے یہ کڑا وقت بڑی بردباری سے گزارا۔

ان دنوں سردار عبدالرب نشتر پنجاب کے گورنر تھے[۱۲]۔ خاں صاحب نے بغیر کسی سابقہ تعارف کے ان کو خط لکھا۔ انہوں نے ملاقات کا وقت دیا۔ ملازمت کے لیے درخواست دلوائی۔ حافظ عبدالمجید چیف سیکرٹری پنجاب نے انٹرویو لیا اور مئی ۱۹۵۱ء میں ان کا تقرر بطور لینڈ ایکوزیشن کلکٹر ہوا، جو ابتدا میں صرف چھ ماہ کے لیے تھا تاہم اس ملازمت کا سلسلہ ساڑھے چھ برس تک جاری رہا۔ ان دنوں بی آر بی نہر کی کھدائی ہو رہی تھی اور اس مصرف میں کام آنے والی اراضی کے معاوضوں کا تعین اور ادائیگی کا فریضہ خاں صاحب کے سپرد تھا۔ انہوں نے یہ کام نہایت احسن طریقے پر مثالی دیانت داری سے انجام دیا۔ ۱۹۵۸ء میں وہ اس ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس وقت تک ان کے فرزندوں میں سے بعض تعلیم سے فارغ ہو کر برسرِ روزگار ہو چکے تھے۔ کچھ زرعی اراضی بھی الاٹ ہو چکی تھی۔ اس طرح ان کی مالی پریشانی دور ہو گئی لیکن جلد ہی مکان کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ۱۷۱ فیروز پور روڈ والی کوٹھی انہیں معاوضے میں منتقل ہوئی تھی۔ جب پی سی ایس آئی آر کا ادارہ قائم ہوا تو اس کے لیے نئی تعمیرات کی ضرورت پیش آئی۔ بعض دوسری عمارتوں کے ساتھ خاں صاحب کی قیام گاہ بھی اس سکیم میں آ گئی۔ محکمہ سیٹلمنٹ نے خالی کرنے کا نوٹس دیا تو ان سے متبادل مکان کی درخواست کی گئی لیکن کون سنتا ہے فغان درویش۔ آخر تھک ہار کر ہائی کورٹ میں رٹ دائر کرنا پڑی۔ وہ زمانہ بھی غنیمت تھا۔ عدالت عالیہ نے سیٹلمنٹ والوں کے لتے لیے تو محکمہ مصالحت پر آمادہ ہوا۔ متبادل کے طور پر ۱۹۶۰ء میں اپر مال کی ایک وسیع و عریض کوٹھی[۱۳] انہیں دی گئی۔ اس میں ۱۹۵۸ء تک ہندوستان کا ڈپٹی ہائی کمشنر مقیم رہ چکا تھا۔ لاہور میں اس کا دفتر بند ہوا تو اس کوٹھی میں رینجرز ہیڈ کوارٹر قائم ہو گیا۔ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ قابضین نہ کرایہ دیتے تھے نہ خالی کرتے تھے۔ مجبوراً پھر عدالت عالیہ کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ خدا خدا کر کے آٹھ نو برس کی مقدمہ بازی کے بعد زبردست کرایہ دار ادائیگی پر رضامند ہوئے۔ اس طویل عرصے کا کرایہ یک مشت وصول ہوا تو اس رقم سے ۱۹۷۰ء میں ماڈل ٹاؤن کے ڈی بلاک میں کوٹھی نمبر ۳۵-۳۶ خریدی گئی اور یہ خاندان اس میں منتقل ہو گیا۔ کوٹھی کا نام باذوق فرزندوں نے "بیت الاکرام" تجویز کیا اور حقیقت یہ ہے کہ یہ اسم بامسمیٰ تھا۔

میں نے زندگی میں بہت بااخلاق لوگ دیکھے ہیں لیکن خاں صاحب موصوف بااخلاق نہیں مجسم اخلاق تھے۔ عزیزوں، دوستوں، واقف کاروں حتیٰ کہ گھر کے ملازموں تک سے اس ملائمت

اور شفقت سے گفتگو کرتے تھے کہ باید و شاید۔ حد تو یہ ہے کہ اپنے فرزندوں اور ان کے بچوں سے، بھی بڑے احترام سے مخاطب ہوتے تھے۔ ان کے اس رویے کو دیکھ کر مصرع: جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم، یاد آ جاتا تھا۔ زیادہ تعجب یوں ہوتا تھا کہ ان کا خاندان پشتوں سے سول سروس میں تھا اور وہ خود نیز ان کے اعزہ بڑے بڑے انتظامی عہدوں پر متمکن رہے تھے لیکن جس رعونت اور تکبر کا تصور سول سروس سے وابستہ ہے یہاں اس کا شائبہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جو شخص بھی ایک بار کسی تقریب سے انہیں مل لیتا بندۂ بے دام ہو جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے ملنے والوں کا دائرہ بڑا وسیع تھا۔ ان کے ہاں آنے والوں میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور سید قاسم رضوی (حیدر آباد دکن) سے لے کر فلمی اداکار نذیر[14] اور نذر[15] تک شامل تھے۔ مخیر بھی بہت تھے۔ ضرورت مندوں، بیواؤں اور مساکین کی امداد بڑی خاموشی اور رازداری سے کرتے تھے۔

میں جب بھی جاتا (یہ عموماً عصر کا وقت ہوتا تھا) اور دیوان خانے میں یا باہر چمن میں حسن بھائی وغیرہ سے باتیں کر رہا ہوتا تو خاں صاحب، تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی، ضرور تشریف لاتے تھے۔ چائے آتی تو اس میں شریک ہوتے۔ میں واپسی کے لیے اجازت لیتا تو دیگر حاضرین کے ساتھ خود بھی اٹھ کر کھڑے ہو جاتے جس سے مجھے شرمندگی کا احساس ہوتا۔ وضع داری انہیں بزرگوں سے ورثے میں ملی تھی چنانچہ میری پہلی ملاقات سے لے کر ان کے حین حیات تک میرے ساتھ ان کے رویہ میں ذرہ بھر فرق نہیں آیا۔

زمانۂ ماضی میں مسلمان سلاطین کے اقتدار کی اہم ترین علامات دو تھیں یعنی سکّوں پر ان کا نام کندہ ہوتا تھا اور جمعہ و عیدین کے خطبات کے آخر میں ان کا نام لیا جاتا تھا۔ جب تک ترکی میں خلافت کا ادارہ قائم رہا برِعظیم کے مسلمان خطبات میں عثمانی خلیفہ کا نام لیتے رہے۔ ۱۹۱۹ء میں یہ سلسلہ ختم ہونے کے بعد اس رسم کو ترک کرنا پڑا۔ اس مقام پر خطبے میں کلام پاک کی یہ آیت رکھ دی گئی: اِنَّ اللّٰہَ یَأمُرُ بِالعَدلِ وَالاحسانِ و اِیتآءِ ذِی القربیٰ وَ یَنھیٰ عنِ الفَحشآءِ وَالمُنکرِ وَالبغیِ یَعِظُکم لَعَلّکم تَذَکَّرُون[16]۔

ترجمہ: اللہ حکم کرتا ہے انصاف کو اور بھلائی کو اور دینے کو ناتے والے کے اور منع کرتا ہے بے حیائی کو اور نامعقول کام کو اور سرکشی کو، تم کو سمجھاتا ہے، شاید تم یاد رکھو۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بلیغ آیت انسان کے معاشرتی معاملات کا ایک جامع دستورالعمل

ہے۔ میں جب غور کرتا ہوں تو اکرام حسن خاں مرحوم کی زندگی اس آیت میں پیش کردہ احکام کی عملی تفسیر نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں فحش و منکر یا راہِ حق سے سرتابی کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ رشتہ داروں سے سلوک کے معاملہ میں ان کا معیار بہت بلند تھا۔ بچپن میں والدہ کی وفات کے بعد ان دونوں بھائیوں کے ساتھ ان کے والد کا رویہ خاصا درشت رہا، جس کا اعتراف والد نے ۱۹۳۱ء میں اپنی وفات کے موقع پر خود کیا تھا۔ شاید اسی سختی کے ردعمل میں بہن بھائیوں کے مابین ایسی محبت تھی کہ باید و شاید۔ بہن بھائی ہی کیا، سچ تو یہ ہے کہ وہ بحیثیت فرزند، شوہر، داماد اور باپ غرض ہر اعتبار سے ایک مثالی شخصیت تھے۔ والد کی وفات کے بعد سوتیلی والدہ سے نہایت حسن سلوک سے پیش آئے اور ان کے جملہ مطالبات خندہ پیشانی سے پورے کیے۔ اپنے وسیع و عریض خاندان کے جن گھروں میں کوئی شکر رنجی یا ناچاقی تھی اسے پوری دلچسپی لے کر بطریق احسن دور کیا۔ قریبی اعزہ کے مالی حقوق کی ادائیگی میں بھی ان کا رویہ قابل رشک تھا۔

جہاں تک عدل و انصاف کا تعلق ہے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اصولِ عدل سے کسی جگہ اور کسی وقت سرِ مُو انحراف نہیں کیا۔ وہ دورانِ ملازمت ذمہ دار عہدوں پر فائز رہے لیکن کسی قسم کی ترغیب و تحریص یا مخالفت و مخاصمت انہیں جادۂ اعتدال سے منحرف نہ کر سکی۔ اس قسم کے بہت سے واقعات میرے علم میں ہیں لیکن یہاں ان کے بیان کی گنجائش نہیں لہٰذا میں بعض دلچسپ اور سبق آموز حکایات مختصراً عرض کرنے پر اکتفا کروں گا۔

یہ ۴۹-۱۹۴۸ء کا واقعہ ہے یعنی جے پور کی ملازمت کے آخری سال کا، جب سکھوں کے ہاتھوں مشرقی پنجاب اور دہلی میں مسلمانوں پر قیامت صغریٰ گزر چکی تھی۔ ان دنوں بناسپتی گھی کا رواج ہو چلا تھا تاہم اس کے خلاف تعصب موجود تھا، چنانچہ ریاست جے پور میں یہ گھی لانے پر سخت پابندی تھی۔ ایک سکھ نوجوان اجمیر شریف سے بناسپتی گھی کے دو کنستر لے کر ٹرین پر سوار ہوا اور جے پور سٹیشن پر پکڑا گیا۔ اس کا مقدمہ اسسٹنٹ کمشنر کی عدالت میں پیش ہوا جہاں سے اسے پانچ ہزار روپیہ جرمانہ (یہ ان دنوں بڑی رقم تھی) اور گھی بحق سرکار ضبطی کی سزا ہوئی۔ اس کی اپیل خاں صاحب کے پاس آئی۔ جب انہوں نے مِسل کا معائنہ کیا تو ایک لمحے کے لیے خیال آیا کہ معاملہ بالکل صاف ہے، کیوں نہ ہندو کمشنر کا فیصلہ برقرار رکھا جائے۔ فوراً ہی ضمیر نے احتجاج کیا کہ یہ وسوسہ تمہارے تعصب کی دلیل ہے، چنانچہ لاحول پڑھی، استغفار کی۔ سکھ کو خصوصی موقع

دے کر عدالت میں بلایا اور اس کا مؤقف سنا تو یہ انکشاف ہوا کہ دراصل سردار جی اجمیر سے آگرہ جا رہے تھے۔ راستے میں کسی معمولی سی بات پر محکمہ ایکسائز (جے پور) کے کسی اہلکار سے الجھ پڑے۔ اس نے انہیں جے پور سٹیشن پر اتار لیا اور گھی کا کیس بنا دیا۔ اتفاق سے سکھ کے پاس اس تاریخ کا اجمیر تا آگرہ ریلوے ٹکٹ محفوظ تھا جس نے بڑا کام دیا اور خاں صاحب نے اسے باعزت بری کر دیا۔ کچھ دن بعد وہ سکھ اپنے والدین کو ساتھ لے کر خاں صاحب کا شکریہ ادا کرنے آیا اور بتایا: ''جب ہمیں پتا چلا کہ اپیل ایک مسلمان افسر کی عدالت میں دائر ہوئی ہے تو ہم سزا میں تخفیف سے بھی مایوس ہو گئے تھے لیکن آپ نے انصاف کا حق ادا کر دیا۔''

اپنی ذات اور اختیارات کی حد تک اصول عدل کو ملحوظ رکھنے سے آگے ایک اور مرحلہ بھی ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ دوسروں کو بھی انصاف پر آمادہ کیا جائے۔ خاں صاحب اس دائرے میں بھی بڑے مستعد تھے۔

اعتدال سے انحراف کرنے والا شخص کتنی ہی بڑی حیثیت کا مالک کیوں نہ ہوتا وہ متاثرہ شخص کو اس کا حق دلانے میں ساعی ہو جاتے تھے۔ نظامت شیخاواٹی میں خاں صاحب کے عملے میں ایک ہندو کلرک بھی تھا۔ بڑا محنتی اور دیانت دار۔ ایک دن اتفاقاً اس کے ہاتھ سے عجلت میں ایک مقدمہ کی مِسل پر، جو اپیل کے سلسلے میں چیف کورٹ جے پور جا رہی تھی، دوات الٹی گئی اور بعض اہم نکات پڑھنے کے قابل نہ رہے۔ چیف جسٹس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اہلکار نے یہ سیاہی کسی بد نیتی سے جان بوجھ کر گرائی ہے۔ چنانچہ متعلقہ کلرک کو معطل کر دیا گیا۔ خاں صاحب کو حقیقت حال کا علم تھا۔ انہوں نے اس بات کی پروا کیے بغیر کہ بطور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ وہ خود براہِ راست چیف جسٹس کے ماتحت ہیں، اپنی طرف سے اس کی غلط فہمی رفع کرنے کی مسلسل اور پرزور کوشش کی اور بالآخر اس کلرک کی ملازمت بحال ہونے پر دم لیا۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا سانبھر سے گنگا پور تبادلے کے وقت پھلیرہ جنکشن پر ہزاروں کا مجمع خاں صاحب کو الوداع کہنے کی غرض سے موجود تھا۔ اس موقع پر بڑے جذباتی مناظر دیکھنے میں آئے۔ سانبھر کے ایک معزز ہندو وکیل جیون بخش بار بار ان کے پاؤں پر سر رکھنے کی کوشش کرتے اور خاں صاحب ہر بار پیچھے ہٹ جاتے۔ وکیل صاحب دیوانہ وار پکارتے: ''میں تو یہیں سر رکھوں گا! میں تو یہیں سر رکھوں گا۔'' جب گاڑی چلی تو اہل خانہ نے استفسار کیا کہ ان صاحب کو کیا ہو گیا

تھا۔ اس پر خاں صاحب نے مختصر صراحت کی۔ قصہ یہ تھا کہ وکیل صاحب کا ایک بھائی چیف کورٹ جے پور میں ملازم تھا۔ ایک بار چھٹی لے کر سانبھر آیا اور پھر جعلی میڈیکل سرٹیفکیٹ کے ساتھ چھٹی میں اضافے کی درخواست بھجوادی۔ چیف جسٹس سیتلا پرشاد باجپائی[1] نہایت ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی سخت گیر بھی تھا۔ اس نے تحقیق کی تو اصل صورتحال کا علم ہو گیا۔ اس پر نہ صرف اصل ملزم کو معطل کیا گیا بلکہ ساتھ ہی اس کے بڑے بھائی کی وکالت کا لائسنس بھی منسوخ کر دیا گیا۔ اس پر خاں صاحب خاموش نہ رہ سکے اور بطور ناظم سانبھر چیف جسٹس کو لکھا کہ اس معاملے میں سارا قصور آپ کے اہلکار کا ہے۔ اس کا بھائی بالکل بے قصور ہے۔ اس کو ناکردہ گناہ کی سزا دینا مناسب نہیں۔ بعد ازاں یاد دہانی کی نیم سرکاری چٹھیاں روانہ کرتے رہے۔ اتفاق سے کچھ عرصہ بعد جسٹس باجپائی کو سر کا خطاب ملا۔ موقع مناسب جان کر خاں صاحب نے اسے مبارکباد کا خط لکھا اور ساتھ ہی یہ بھی: ''کتنا اچھا ہو اگر آپ اس خوشی کے موقع پر جیون بخش کی وکالت کا لائسنس بحال کر دیں۔'' چنانچہ پتھر میں جونک لگی اور وکیل صاحب کا لائسنس بحال ہو گیا۔ لطف یہ ہے کہ وکیل موصوف کو اپنے اس بہی خواہ کی مساعی کی کچھ خبر نہ تھی۔ وہ تو خاں صاحب کے تبادلے کے موقع پر وکیل صاحب نے ہیڈ کلرک کے پاس ان چٹھیوں کی نقول کی فائل دیکھ لی اور اس کے نتیجے میں ریلوے سٹیشن پر عقیدت کا یہ والہانہ مظاہرہ ہوا۔

انصاف کی طرح احسان کے معاملے میں بھی خاں صاحب بڑے اونچے مقام پر فائز تھے۔ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کا جذبۂ احسان بھی اپنی حدود پار کر کے ایثار کے دائرے میں داخل ہو جاتا تھا۔ جب لینڈ ایکوئزیشن کلکٹر مقرر ہوئے تو پورا لاہور ڈویژن ان کے حیطۂ اختیار میں تھا۔ دفتر پہلے سے گوجرانوالہ میں تھا۔ چنانچہ پیر کی صبح لاہور سے گوجرانوالہ جاتے اور سنیچر کی شام کو واپس لاہور آ جاتے۔ دو سال کی آمد و رفت کے بعد ملازمت سے استعفیٰ دینے کی ٹھانی۔ درخواست لکھ کر متعلقہ افسر اعلیٰ سے ملے تو اس نے کہا کہ آپ مستعفی ہونے کے بجائے اپنا دفتر لاہور کیوں نہیں لے آتے جبکہ آپ کو اس کا پورا استحقاق ہے۔ خاں صاحب مان گئے اور نئی درخواست تیار کی۔ ان کے دفتر کا بیشتر عملہ گوجرانوالہ کا رہنے والا تھا۔ ان لوگوں کو جب اس بات کی خبر ہوئی تو ان میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ ان میں سے کسی نے اس کیفیت کی اطلاع خاں صاحب کو کر دی۔ انہوں نے اپنے عملے کی زحمت کے پیش نظر اپنی درخواست چاک کر دی اور بدستور گوجرانوالہ میں اپنے

فرائض انجام دیتے رہے۔

خود میرے ساتھ انہوں نے احسان و ایثار کا سلوک مرعی رکھا۔ ہوا یہ کہ دادا جان نے ٹونک میں دریائے بناس کے کنارے کچھ زرعی اراضی اپنی زندگی کے آخری برسوں میں خریدی تھی۔ اس کا کلیم تو منظور ہو گیا تھا لیکن وہ ایک عرصے تک یونہی پڑا رہا اور میں نے کچھ تو اپنی تعلیمی مصروفیات اور کچھ لڑکپن کی بے نیازی کے باعث اس طرف کوئی توجہ نہ کی۔ جب ایوب خان کا دور آیا اور اعلان ہوا کہ جن لوگوں کی زرعی اراضی کے دعاوی باقی ہیں وہ ان پر اراضی الاٹ کروالیں کیونکہ کچھ عرصے بعد محکمہ آبادکاری توڑ دیا جائے گا تو میرے ایک مہربان نے اس کام کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ ان کی کوششوں اور بھاگ دوڑ کے نتیجے میں ضلع شیخوپورہ کی تحصیل فیروز والہ کے موضع چک نمبر ۱۰ میں یہ اراضی الاٹ ہوگئی۔ پٹواری حضرات بڑے کائیاں ہوتے ہیں۔ موضع مذکور کے پٹواری نے یہ حرکت کی کہ منتشر اور بنجر قطعات تو میرے نام الاٹ کر دیے اور بیچ بیچ میں زرخیز اراضی کے ٹکڑے بدستور متروکہ حیثیت میں رہنے دیے کہ وہ یہ قطعات مقامی بے زمین کسانوں کو کاشت کی غرض سے دے کر بٹائی لے کر ہضم کر لیا کرتے تھے۔ کچھ عرصے بعد ہم پر یہ حقیقت منکشف ہوئی۔ پریشانی یہ تھی کہ اگر کسی وقت یہ باقی ماندہ خسرہ نمبر کسی جھگڑالو شخص کو الاٹ ہو گئے تو آئے دن نہری پانی اور حد بندی کے جھگڑوں کا سامنا ہوگا۔ میرے انہی مہربان نے مشورہ دیا کہ کہیں سے زرعی اراضی کے یونٹ خرید کر یہ قطعات بھی حاصل کر لیے جائیں۔ اس میں ایک قباحت تھی۔ جعل سازوں نے متعلقہ محکمے کے اہلکاروں کی ملی بھگت سے بہت بڑی تعداد میں جعلی یونٹ تیار کر لیے تھے جو نہایت سستے داموں مل جاتے تھے۔ بالخصوص غیر طے شدہ علاقوں[۱۸] کے یونٹ تو پانچ روپے فی یونٹ تک گر گئے تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ ان یونٹوں کو خریدنے اور ان پر زمین حاصل کرنے والے لوگ محکمہ مال کے کارندوں کے لیے دودھ دینے والی گائے بن کر رہ جاتے تھے اور یہ میرے بس کا روگ نہ تھا۔

ایک دن حسن بھائی سے ملاقات پر میں نے انہیں اپنی مشکل بتائی اور ان سے درخواست کی کہ وہ اپنے والد ماجد سے بات کریں اور کسی بااعتبار شخص کے کلیم سے مجھے کچھ یونٹ دلوا دیں۔ کچھ دن بعد دوبارہ ملنے پر انہوں نے بتایا کہ آپ کو جتنے یونٹ درکار ہیں مل جائیں گے اور قیمت بھی جو آپ مناسب سمجھیں دے دیں۔ میں نے کہا ایک ہزار یونٹ کافی ہوں گے اور اپنی تسلی کے

لیے بار بار پوچھتا رہا کہ یونٹ ہیں تو اصلی نا؟ حسن ہر بار کہتے کہ آپ مطمئن رہیے۔ میں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ کوئی ضرورت مند فروخت کر رہا ہوگا نیز اپنی جیب کو دیکھتے ہوئے کم سے کم قیمت لگائی اور کہا کہ میں پانچ روپے فی یونٹ کے حساب سے پانچ ہزار روپے دے سکتا ہوں۔ حسن نے کہا ٹھیک ہے۔ کوئی دو ہفتے بعد برادرم احمد حسن خاں (ایڈووکیٹ) نے ایک ہزار یونٹ کی موضع چک نمبر ۱۰ میں منتقلی کا سرٹیفکیٹ میرے حوالے کر دیا۔ میں نے گھر پہنچ کر اسے اطمینان سے دیکھا تو میرے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ یہ یونٹ کسی اور کے نہیں خود خاں صاحب کے سب سے بڑے فرزند ڈاکٹر افضال حسن خاں کے تھے۔ تعجب کے ساتھ ساتھ مجھے جو شرمندگی ہوئی اس کا احساس آج بھی میرے دل میں باقی ہے۔ اس کی دو وجوہ تھیں۔ ایک تو میرا حسن بھائی سے بار بار پوچھنا کہ یونٹ اصلی تو ہیں نا؟ اور دوسرے کم سے کم قیمت لگانا۔ چنانچہ اس کے بعد جب حسن بھائی سے ملاقات ہوئی تو میں نے دبی زبان سے شکوہ کیا کہ آپ نے یہ بات مجھے پہلے کیوں نہ بتائی؟ تب انھوں نے کہا: ''جب میں نے آپ کا مسئلہ والد صاحب کے گوش گزار کیا تو وہ فرمانے لگے کہ آج کل یونٹوں کا معاملہ بڑا مشکوک ہے، مناسب یہ ہوگا کہ اپنے ہی یونٹوں سے شیرانی صاحب کو مطلوبہ یونٹ دے دیے جائیں۔ اتفاق سے افضال بھائی کو ننہال سے (متبنیٰ ہونے کے سبب) جو زرعی اراضی ورثہ میں ملی تھی اس کی جزوی الاٹمنٹ تحصیل فیروز والہ ہی میں ہوئی تھی اور بہت سے یونٹ ابھی باقی تھے۔ اس میں ایک سہولت یہ تھی کہ آپ کا گاؤں بھی اسی تحصیل میں واقع ہے اس لیے منتقلی میں دقت بھی نہیں ہوئی اور وقت بھی کم لگا۔ والد صاحب نے یہ ہدایت بھی کی تھی کہ فی الحال شیرانی صاحب کو یہ بات نہ بتائی جائے۔''

لیکن یہ قصہ یہاں ختم نہیں ہوا۔ کچھ عرصے بعد ایک مارشل لاء ریگولیشن کا اجرا ہوا جس کی رُو سے غیر طے شدہ علاقے کے مہاجرین کے لیے حکم صادر کیا گیا کہ وہ اپنے زرعی اراضی کے یونٹوں کی ایک مقرر حد سے زیادہ تعداد پر حکومت پاکستان کو دس روپے فی یونٹ جرمانہ ادا کریں بصورت دیگر ان کے زائد یونٹ ضبط کر لیے جائیں گے۔ میں مظفر گڑھ میں تھا اس لیے اس ایوب خانی حکم سے لاعلم رہا۔ کئی ماہ بعد شیخو پورہ کا چکر لگا تو اس بارے میں پتا چلا۔ میری آبائی اراضی تو اتنی تھی ہی نہیں کہ اس حکم کی زد میں آتی، البتہ خاں صاحب کے عطا کردہ یونٹوں پر دس ہزار روپیہ حکومت کو ادا کرنا تھا۔ غالباً ادائیگی کی مقررہ تاریخ بھی گزر چکی تھی۔ میں گھبرا کر لاہور پہنچا اور احمد حسن خاں

صاحب سے ملا۔ وہ میری پریشانی دیکھ کر حسب عادت مسکرائے اور بولے: ''آپ کیوں فکر کرتے ہیں؟ پاپا کی ہدایت پر، افضال بھائی کی طرف سے اس ضمن میں جمع کرائے جانے والے گوشوارے میں لکھ دیا گیا تھا کہ مقررہ حد کے اندر والے یونٹوں میں ہمیں سب سے پہلے وہ ایک ہزار یونٹ رکھنا ہیں جو چک نمبر ۱۰ منتقل کیے گئے تھے۔'' ظاہر ہے کہ اس کرم فرمائی کی زد ان کی اپنی اراضی پر پڑنا تھی یعنی جو یونٹ انہوں نے مجھے صرف پانچ ہزار روپے میں عنایت کیے تھے ان پر انہیں حکومت کو دس ہزار روپے ادا کرنا پڑے۔ یقینی امر ہے کہ اگر میں اس سلسلے میں خود جا کر احمد حسن خاں صاحب سے دریافت نہ کرتا تو اس کرم بالائے کرم کا مجھے کبھی علم ہی نہ ہوتا۔ اس خودغرضی اور زر پرستی کے زمانے میں ایسی مثالیں کہاں ملتی ہیں۔

خاں صاحب کی غریب پروری بھی قابل داد تھی۔ گھر میں کئی ملازم تھے جو مع اہل و عیال سرونٹ کوارٹرز میں مقیم رہتے۔ جو ایک بار ملازم ہو گیا پھر اسے جواب دینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ہاں وہ خود کسی مجبوری سے جانا چاہے تو اور بات ہے۔ ان میں سے بیشتر فارغ ہی رہتے تھے۔ بعض نے تو اس فراغت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چھوٹے موٹے کام بھی شروع کر دیے تھے۔ دو ایک کو میں نے خود ماڈل ٹاؤن میں سبزی پھل وغیرہ بیچتے دیکھا۔ میں سمجھا شاید نوکری سے جواب مل گیا ہے لیکن حسن بھائی سے ذکر کیا تو پتا چلا کہ یہ سب خاں صاحب کے علم میں ہے اور ان کی اجازت سے ہو رہا ہے۔ اپنی وفات سے تقریباً ایک سال قبل جب انہوں نے اپنا اثاثہ ورثا میں تقسیم کیا تو اس موقع پر بیواؤں وغیرہ کے وظائف کے ساتھ اپنے پرانے خدمت گاروں کو بھی فراموش نہیں کیا۔

خاں صاحب کو مولانا رسول خاں[19] سے خاص اُنس تھا۔ معمول کی نمازیں قریبی مساجد میں اور جمعہ کی نماز التزام کے ساتھ جامعہ اشرفیہ (فیروز پور روڈ) میں مولانا کی اقتدا میں ادا کرتے۔ یہ سلسلہ مولانا کی وفات کے بعد بھی جاری رہا لیکن وہ باقاعدگی نہ رہی۔ رمضان میں تراویح کی نماز ایک حافظ صاحب کی امامت میں کوٹھی کے وسیع لان میں ادا کرتے تھے۔ اہل خانہ، ملازمین اور مہمانوں سے خاصی رونق ہو جاتی تھی۔ بعد میں جب ان کے پوتوں میں سے بعض نے کلام پاک حفظ کر لیا تو وہ بھی وہیں اسے تازہ کرنے لگے۔ خاں صاحب، صاحب نسبت تھے اور ایک عرصہ قبل بدایوں کے ایک نقشبندی بزرگ مولانا اعجاز احمد سے بیعت ہو چکے تھے۔ سلسلے کی مناسبت سے

لاہور میں ایک بار مولانا رسول خاں سے تجدید بیعت کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے جواب دیا: ''اس کی ضرورت نہیں، آپ تلاوت ہی پر توجہ مرکوز رکھیں۔'' ایک عرصے بعد کا ذکر ہے کہ احمد حسن خاں صاحب نے کسی صاحب بصیرت شخصیت سے پوچھا: ''لاہور میں کسی ایسے شخص کا پتا بتایئے جن کی صحبت میں اطمینان قلب حاصل ہو سکے۔'' انہوں نے جواب میں کہا: ''ہاں! ایک بزرگ ہیں جو پیرانہ سالی اور عوارض کے باعث گھر سے نہیں نکلتے۔'' لیکن نام نہیں بتایا۔ اگلی ملاقات پر احمد حسن خاں نے ان سے نام دریافت کیا تو وہ بزرگ مسکرائے اور بولے: ''میاں! ہر روز اور ہر وقت تو ان کی خدمت میں حاضر رہتے ہو اور نام پتا مجھ سے پوچھ رہے ہو۔'' اتفاق سے خاں صاحب نے اپنی وفات سے ٹھیک ایک ہفتہ قبل جمعے کے دن (۱۶ ستمبر ۱۹۹۴ء) احمد حسن خاں سے مخاطب ہو کر کہا: ''افسوس اب کوئی بزرگ نظر نہیں آتا۔ سب اللہ کو پیارے ہو گئے۔'' اس پر احمد نے ان صاحب سے اپنی محولہ بالا گفتگو کا ذکر کیا تو ردعمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے باصرار فرمایا: ''ایسی بات مت کیا کرو۔'' اور پھر آئندہ جمعے کے روز واصل بحق ہو گئے:

اسرارِ ازل را نہ تو دانی و نہ من
ویں حرف معما نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پسِ پردہ گفتگوی من و تُو
چون پردہ بر افتد نہ تو مانی و نہ من[۱]

خاں صاحب کے قریبی اعزہ سب بھارت کے مختلف شہروں میں تھے۔ وفور شفقت کے سبب چونکہ مجھے اپنے گھر کا ایک فرد سمجھتے تھے اس لیے بھارت سے جب کوئی عزیز ملنے آتا تو بڑی محبت سے میرا تعارف کراتے۔ ۱۹۸۱ء میں ان کے ہم زلف ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل ملنے آئے اور کئی ماہ ان کے پاس مقیم رہے۔ وہ لکھنؤ یونیورسٹی سے بطور صدر شعبہ اردو و فارسی ریٹائر ہوئے تھے۔ کیا خوش وضع، جامہ زیب اور نستعلیق آدمی تھے۔ میں ان سے مل کر بڑا متاثر ہوا۔

اللہ کے مقبول بندوں کی آزمائشیں بھی بہت ہوتی ہیں۔ خاں صاحب کی بھی ہوئیں۔ ان کا آغاز ان کے سب سے چھوٹے فرزند امداد حسن خاں کی وفات سے ہوا۔ مرحوم نے انگلستان سے آٹو موبائل انجینئرنگ کا کورس کیا تھا اور ''کارساز''[۱۱] کے نام سے فیروز پور روڈ پر ایک جدید موٹر

ورکشاپ قائم کی تھی۔ ۲۷ جولائی ۱۹۷۸ء کو عین عالم جوانی میں اچانک دل کا دورہ پڑنے سے بوڑھے والدین کو داغ مفارقت دیا۔

ایں ماتمِ سخت است کہ فرزندِ جواں مرد[۲۲]

خاں صاحب نے بڑے حوصلے کا مظاہرہ کیا لیکن دل کا کام تمام ہو گیا۔ اس واقعہ کے کوئی ڈیڑھ سال بعد ۹ جنوری ۱۹۸۰ء کو میرا چھوٹا بھائی عزیزی تاثیر محمود بھی آناً فاناً حرکت قلب بند ہونے سے چل بسا تو خاں صاحب نے اس موقع پر مجھے اپنے ہاتھ سے جو تعزیت نامہ لکھا وہ میں یہاں درج کرتا ہوں:

"عزیزی شیرانی صاحب۔ السلام علیکم

عزیزی اشتیاق حسن سلمہ نے آپ کا خط دکھایا جس سے جانکاہ حادثہ کا علم ہو کر مجھے دلی صدمہ ہوا۔ امداد کی دائمی جدائی سے دل دکھا ہوا ہے اس لیے اس واقعہ کا خاص طور پر دل پر اثر ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور جملہ پسماندگان کو صبر کی توفیق اور ہمت عطا فرمائے اور مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں اعلیٰ مقام سے مستفیض فرمائے۔ آپ کو جس قدر بھی صدمہ ہو کم ہے مگر بجز صبر چارہ نہیں۔ میں خود حاضر ہوتا مگر میں اب تقریباً معذور ہو گیا ہوں۔ کہیں جانے آنے کے قابل نہیں رہا ہوں۔ میں آپ کے اس غم میں شریک ہوں۔

والسلام خیر طلب محمد اکرام حسن عفی عنہ"

۳ مارچ ۱۹۸۰ء کو خاں صاحب کے سب سے بڑے فرزند ڈاکٹر افضال حسن خاں بھی چل بسے۔ ۱۱ فروری ۱۹۸۲ء کو ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل نے لکھنؤ میں وفات پائی۔ ۵ جنوری ۱۹۸۴ء کو خاں صاحب کی اہلیہ محترمہ دو بیٹوں کا داغ دل پر لیے رخصت ہوئیں۔ خاں صاحب نے کمال تسلیم و رضا سے کام لیا اور اپنے معمولات اور رویوں میں کوئی فرق نہ آنے دیا لیکن پے در پے صدموں سے نڈھال ہو چکے تھے۔ اسی سال ۳ اکتوبر کو جب ان کے برادر حقیقی سلطان حسن خاں (ریٹائرڈ ایڈیشنل کمشنر) نے علی گڑھ میں وفات پائی اور صرف ایک ہفتے بعد ان کی اہلیہ بھی سفر

آخرت پر روانہ ہوگئیں تو ان سے یہ امور مخفی رکھے گئے۔ لیکن دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔

؎ رہِ چمن نتواں بست تا صبا اینجاست[۲۳]

چند روز بعد فرمانے لگے: ''میں نے خواب میں دیکھا کہ مسجد سے سلطان حسن کے انتقال کا اعلان ہو رہا ہے۔'' سب نے تردید کی اور کہا کہ ان کی بینائی بہت کم ہوگئی ہے اس لیے خط نہیں لکھ سکتے۔ پھر کسی صاحب سے کہہ کر علی گڑھ سے ایک مجعول خط لکھوایا: ''بینائی خراب ہونے کے باعث میں خود لکھ نہیں سکتا اس لیے ایک عزیز سے یہ مکتوب لکھوا کر روانہ کر رہا ہوں۔'' غرض ان کی اپنی وفات تک یہ حقیقت ان پر افشا نہ کی گئی۔

۲۹ نومبر ۱۹۸۹ء کو خاں صاحب کے صاحبزادے انعام حسن خاں (خان میڈیکوز، بیڈن روڈ، لاہور) کے نوجوان بیٹے مع اپنے کم سن بچے کے سڑک کے ایک حادثے میں جاں بحق ہوئے۔ ان تازہ صدمات سے خاں صاحب بالکل ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے اور صاحب فراش ہو گئے۔ بظاہر کوئی بیماری نہ تھی لیکن نقاہت بہت بڑھ چکی تھی۔ با ایں ہمہ انہوں نے اپنے اخلاق عالیہ میں آخر دم تک سرِ مُو فرق نہ آنے دیا۔ اس کی ایک اعلیٰ مثال میں یہاں پیش کرتا ہوں۔

خاں صاحب کی وفات سے کچھ عرصہ قبل برادرم احمد حسن خاں اپنے والد کے کمرے میں ان کی بڑی مسہری پر سوتے تھے کہ رات کو کوئی ضرورت پیش نہ آئے۔ ملحقہ غسل خانہ احمد بھائی کی جانب تھا۔ ایک شام انہوں نے عرض کیا کہ آپ غسل خانے کی سمت سویا کیجیے تاکہ عند الحاجت کم فاصلہ طے کرنا پڑے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا۔ رات کو جب خاں صاحب کی آنکھ کھلی تو ان کے ذہن میں نہیں رہا کہ آج دوسری طرف سوئے ہیں لہٰذا معمول کے مطابق جب سابقہ سمت سے اترنا چاہا تو احمد بھائی پر ہاتھ پڑا جس سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے صورتحال سمجھ کر عرض کی: ''پاپا! غسل خانہ آپ ہی کی طرف ہے، ادھر سے اترنا سہل ہوگا۔'' اس پر بیٹے سے معذرت کرتے ہوئے یہ فقرہ دوبار کہا: ''معاف کیجیے گا، آپ کو زحمت ہوئی۔''

مرض الموت کا آغاز وفات سے چند روز قبل ہوا۔ مغرب کی نماز پڑھ کر لیٹے ہوئے تھے کہ آٹھ بجے کے قریب فالج کا حملہ ہوا۔ اسلام حسن خاں (ریٹائرڈ ڈپٹی ڈائریکٹر انڈسٹریز) اور احمد حسن خاں ان کے پاس تھے۔ اطلاع ملتے ہی دونوں ڈاکٹر بیٹے اقبال حسن خاں اور ارشاد حسن

خاں اپنے اپنے مطب چھوڑ کر پہنچ گئے۔ اتفاق ہسپتال لے جایا گیا۔ تین روز انتہائی نگہداشت کے کمرے میں عالم بے ہوشی میں رہے، پھر ہوش آنے پر دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ تین روز اس حالت میں گزرے کہ ہوش وحواس قائم تھے لیکن گفتگو کے قابل نہ تھے۔ بالآخر جمعہ ۲۳ ستمبر ۱۹۹۴ء (۱۷ ربیع الاوّل ۱۴۱۵ھ) کو قبل از نماز جمعہ تقریباً ایک بجے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اس وقت آپ کی عمر ننانوے سال تین ماہ اور چار دن تھی البتہ سنہ ہجری کے اعتبار سے وہ ایک سو ایک برس سے اوپر کے ہو چکے تھے۔ اسی روز عصر و مغرب کے درمیان انہیں ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں سپردِ لحد کر دیا گیا اور یوں بہت سے لوگ ایک عمیم الاحسان شخصیت کی فیض رسانی اور خیر و برکت سے محروم ہو گئے۔

اخلاق میں بے مثل تھے، الطاف میں یکتا
تھا جن کا کرم عام، وہ اکرام حسن خاں
یاد ان کی فراموش نہ ہو گی مرے دل سے
"وہ صاحب اکرام، وہ اکرام حسن خاں"

۱۴۱۵ھ

حواشی

۱- ریاست جے پور راجپوتانہ کے قلب میں واقع تھی۔ آزادی کے بعد جب ریاستیں ختم کر کے راجستھان کا قیام عمل میں آیا تو یہی شہر صوبے کا دارالحکومت بنایا گیا۔

۲- اشفاق حسن خاں اپنی سابقہ سروس سے سبکدوش ہو کر ۱۹۲۳ء میں جے پور آئے تھے۔

۳- دیوان سنگھ مفتون نے اپنی کتاب ''ناقابل فراموش'' میں اسرار حسن خاں کی وضعداری کو سراہا ہے۔

۴- آگے چل کر ان کی شادی خان بہادر خادم حسین خاں سے ہوئی جو شاہجہانپور کے رئیس اعظم تھے۔

۵- مہاراجہ مان سنگھ ثانی (۷۰-۱۹۲۲ء) کے نابالغ ہونے کی وجہ سے ریاست کے انتظام کی خاطر یہ کونسل قائم کی گئی تھی۔

۶- سر آئز یڈورڈ رابرٹ گلینسی آئی سی ایس۔

۷- سانبھر نہایت قدیم شہر ہے اور برعظیم میں سب سے بڑی نمک کی جھیل کے باعث معروف ہے۔

۸- محمد شاہی دور میں سانبھر کے فوجدار کالے خاں کی ہجو میں مرزا احمد یار نامی ایک غیر معروف شاعر نے اس وقت رائج اردو زبان میں ایک نظم لکھی تھی۔ اس پر راقم کا مضمون رسالہ ''مخزن'' (لاہور۔ شمارۂ مسلسل ۱۸) میں چھپا ہے۔

۹- ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اس ترقی اور تبادلے سے کئی ماہ قبل ایک ہندو جیوتشی نے

خان صاحب کا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا کہ آپ ملازمت میں ترقی پا کر ۱۱ فروری ۱۹۴۳ء کو گنگا پور چھوڑیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

۱۰۔ کرنل ڈاکٹر الٰہی بخش (۶۰-۱۹۰۹ء) قائداعظم کے معالج تھے۔ انہوں نے ''قائداعظم کے آخری ایام'' نامی کتاب لکھی ہے۔

۱۱۔ عنایت اللہ خاں آئی سی ایس پاکستان میں مختلف انتظامی عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۵۸ء میں انہیں ستارۂ پاکستان ملا تھا۔

۱۲۔ سردار عبدالرب نشتر ۲ اگست ۱۹۴۹ء سے ۲۶ نومبر ۱۹۵۱ء تک پنجاب کے گورنر رہے تھے۔

۱۳۔ اس کوٹھی میں سردار سکندر حیات، وزیراعظم پنجاب نے ایک عرصے تک قیام کیا تھا۔

۱۴۔ پاکستان کے ابتدائی برسوں میں نذیر اور ان کی بیوی سورن لتا، لاہور میں بننے والی فلموں میں مرکزی کردار ادا کرتے تھے۔

۱۵۔ اس زمانے کے معروف مزاحیہ اداکار۔

۱۶۔ سورۃ النحل، آیت ۹۰

۱۷۔ سر گرجا شنکر باجپائی جو ۱۹۳۵ء میں وائسرائے ہند کی کونسل کا رکن ہوا، اسی سیتلا پرشاد باجپائی کا بیٹا تھا۔

۱۸۔ طے شدہ اور غیر طے شدہ علاقوں کی تخصیص کے ذریعہ مہاجرین کو دو خانوں میں بانٹا گیا تھا۔ طے شدہ علاقوں میں مشرقی پنجاب، دہلی اور الور و بھرت پور کی ریاستیں تھیں۔ باقی ماندہ بھارت کو غیر طے شدہ قرار دیا گیا تھا۔

۱۹۔ مولانا رسول خاں نندھیاڑ (ضلع ہزارہ) کے رہنے والے تھے۔ انہیں ۱۹۳۵ء میں دارالعلوم دیوبند سے اورینٹل کالج کے شعبۂ عربی میں لایا گیا تھا۔ ۱۹۵۴ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر جامعہ اشرفیہ (لاہور) میں شیخ التفسیر ہو گئے تھے۔ صاحب علم و فضل ہونے کے ساتھ اہل دل بھی تھے اور سلسلۂ نقشبندیہ میں صاحب اجازت بھی۔ خاصی طویل عمر پا کر ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو موضع اچھڑیاں (نزد بفہ ضلع ہزارہ) میں وفات پائی۔ ''رفعنا لك ذكرك'' سے سال رحلت (۱۳۹۱ھ) نکلتا ہے۔ ان کے شاگردوں میں

پاکستان کے مشاہیر علما شامل ہیں اور مریدوں میں بھی بڑے نامور اشخاص داخل ہیں۔

۲۰- ''(کائنات کے) ازلی رازوں سے نہ تو واقف ہے نہ میں۔ یہ ایک ایسی پہیلی ہے جو نہ تو بوجھ سکتا ہے نہ میں۔ ہماری گفتگو (گویا) کسی پردے کی اوٹ میں ہو رہی ہے۔ جب یہ پردہ اٹھتا ہے تو نہ تو رہتا ہے نہ میں۔''

۲۱- یہ نام مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کا تجویز کردہ تھا۔

۲۲- ''جوان بیٹے کی موت کا سانحہ سخت ماتم کا مقام ہوتا ہے۔''

۲۳- ''جب تک بادِ صبا کا وجود ہے چمن کا راستہ بند نہیں کیا جا سکتا۔''

ضیائے علم و دیں

ڈاکٹر ضیاالدین دیسائی (۱۹۲۵ء-۲۰۰۲ء)

احمد آباد سے ڈاکٹر ضیاالدین دیسائی صاحب کا خیریت نامہ ملے چھ ماہ سے اوپر ہو گئے تھے۔ جب گجرات میں مسلم کش فسادات شروع ہوئے تو یہ جاں کاہ خبریں پڑھ کر بار باران کا خیال آتا تھا لیکن رابطے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ ''معارف'' (اعظم گڑھ) کا ماہ مئی ۲۰۰۲ء کا شمارہ کراچی پہنچا تو اس میں بذیل وفیات، دیسائی صاحب پر ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کا سوا تین صفحات پر مبنی مضمون شامل تھا۔ عزیزی محمد راشد شیخ نے اسے پڑھ کر اپنے ۱۳ جون کے مکتوب میں مجھے اس سانحے سے مطلع کیا۔ یوں تو وہ ایک عرصے سے علیل اور صاحب فراش تھے لیکن قلم فرسائی کا کام برابر جاری تھا۔ ان کے علمی تبحر، تحقیقی خدمات اور تحریری منصوبوں کے پیش نظر دل سے یہی دعا نکلتی تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کو سلامت باکرامت رکھے۔ تاہم قدرت کے اپنے قوانین ہوتے ہیں جن کے آگے انسان بے بس ہو کر رہ جاتا ہے:

گر بمیریم عذر ما بپذیر
اے بسا آرزو کہ خاک شدہ[1]

ڈاکٹر دیسائی مرحوم کی رحلت کا صدمہ کئی اعتبار سے اندوہناک ہے۔ ایک تو میرے لیے یہ ذاتی محرومی کا باعث ہے کہ ان جیسے بے لوث محبت اور شفقت کرنے والے لوگ بہت کم ملتے ہیں۔ دوسرے ہند اسلامی تاریخ و تہذیب پر اس جاں فشانی سے کام کرنے والا شخص دور دور تک نظر

نہیں آتا اور کام بھی کیسا؟ انتہائی معیاری ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت وسیع اور ہمہ گیر۔ اس تخصص پرستی کے دور میں ان کے علمی دائرہ ہائے کار کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ بیسویں صدی کے منصف دوم میں کم از کم ہندو پاکستان کی حد تک ایسا کثیر الجہت اور اتنا وافر تحریری کام انجام دینے والا فاضل ڈھونڈے نہیں ملتا۔ انہیں بلاشبہ شیرانی دبستان تحقیق میں ماہِ درخشاں کی حیثیت حاصل ہے۔ ایک سانحہ یہ ہے کہ پاکستان کے علمی حلقوں میں ایک بڑی اکثریت تو شاید مرحوم کے نام سے بھی واقف نہ ہوگی اور یہاں جو لوگ ان کے کام اور اس کی اہمیت سے بتمام وکمال آشنا ہیں ان کی تعداد یقیناً ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔

پھر ان کی وفات جن دردناک حالات میں ہوئی اس کے تصور ہی سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ انہوں نے ۲۴ مارچ ۲۰۰۲ء (مطابق ۹ محرم الحرام ۱۴۲۳ھ) کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اسی روز عصر کے وقت انہیں جوہاپورہ کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ بقول "معارف": "وہ کئی ماہ سے علیل تھے اور احمد آباد کے ایک ہسپتال میں داخل تھے۔ ان کی وفات کی اطلاع اس لیے تاخیر سے ملی کہ ان دنوں احمد آباد بلکہ گجرات میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی جس میں ہزاروں انسان زندہ جلا دیے گئے اور لاکھوں بے خانماں اور برباد ہو کر اپنے ہی وطن میں بے وطن ہو کر رہ گئے۔ خود دیسائی مرحوم کے صاحبزادے کی دواؤں کی دکان بھی شرپسندوں نے جلا دی تھی۔ چنانچہ اس ہولناک قتل عام کی وجہ سے اور خبریں دب گئیں۔ یوں ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی کے حادثۂ انتقال کی خبر بھی نہ لگ سکی اور وہ کرفیو کے دوران سپرد خاک کر دیے گئے۔"

مرتے ہیں میر سب پہ نہ اس بے کسی کے ساتھ
میت پہ تیری کوئی نہ رویا پکار کے

۶۱۷ھ کے اوائل میں جب چنگیز خان نے بخارا کو فتح کیا تو تاتاری گھڑسواروں نے جامع

مسجد میں داخل ہو کر وہاں پناہ لینے والے مردوزن واطفال کا قتل عام شروع کر دیا۔ یہ نظارہ دیکھ کر امام فقیہ مولانا رکن الدین مسعود نے بے قراری کے عالم میں مقدم ومقتدائے سادات ماوراالنہر، امام جلال الدین علی بن ابی الحسن الرندی سے مخاطب ہو کر پوچھا: ''ایں چہ حالتست؟'' جواب ملا: ''خاموش باش! باد بے نیازی خداوند است کہ می وزد، سامان سخن گفتن نیست'' (خاموش رہو! اللہ کی بے نیازی کی آندھی چل رہی ہے، بولنے کی مجال نہیں ہے)۔

میں نے دیسائی صاحب کا نام سب سے پہلے ڈاکٹر عبداللہ چغتائی مرحوم کے مضامین کے حواشی میں دیکھا تھا۔ چغتائی صاحب اپنے مختصر حواشی میں ان کا ذکر محض ڈاکٹر دیسائی صاحب کے الفاظ سے کرتے تھے اور ان کی کسی تالیف یا مضمون کا حوالہ مطلق نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ میں ایک عرصے تک دیسائی صاحب کے بارے میں صرف اتنا جانتا تھا کہ وہ آل انڈیا آرکیالوجیکل سروے میں کسی اہم عہدے پر متمکن ہیں اور انہوں نے تہران سے فارسی میں ڈاکٹریٹ کیا ہوا ہے۔ سچ پوچھیے تو میں انہیں بھی محکمہ آثار قدیمہ کا ایک روایتی افسر سمجھتا تھا۔ ۱۹۸۰ء میں جب حافظ محمود شیرانی کی صد سالہ تقریبات ولادت کے انعقاد کی تیاریاں شروع ہوئیں تو اس موقع پر پڑھے جانے کے لیے پاک وہند کے اہل علم حضرات سے حصول مضامین کی غرض سے رابطہ کیا گیا۔ علی گڑھ سے محبی پروفیسر نذیر احمد صاحب نے اپنے ۲ اگست ۱۹۸۰ء کے خط میں مجھے لکھا:

''معلوم نہ ہو سکا کہ آپ نے مقالے کے لیے شیرانی صاحب کے شاگرد پروفیسر ڈارؒ کے عزیز ترین شاگرد ڈاکٹر ضیا الدین دیسائی کو، جو محکمہ آثار قدیمہ کے بڑے عہدے پر ہیں، لکھایا نہیں۔ ان کا پتا درج ذیل ہے۔ اگر نہ لکھا ہو تو اب بھی لکھیں۔ ویسے میں نے اپنی طرف سے مقالہ لکھنے کی فرمائش کر دی ہے، گو ان کی صحت خراب ہے۔ وہ موٹر کے ایک حادثے سے دوچار ہو گئے تھے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے بڑا فضل کیا۔''

پتا ناگ پور کی سرکاری قیام گاہ کا تھا۔ چنانچہ میں نے انہیں مقالہ لکھنے کی دعوت دی۔ اس کے جواب میں انہوں نے ۱۶ ستمبر ۱۹۸۰ء کو مجھے لکھا:

''میں اس تقریب میں اپنے آپ کو کسی نہ کسی صورت شامل کرنا فخر کی بات سمجھتا ہوں، گو (محترم ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے حسن ظن کے باوجود) اس کا اہل نہیں۔ حافظ صاحب سے ذاتی طور پر نیاز کا شرف حاصل نہیں رہا لیکن اپنے آپ کو ان کے شاگرد کا شاگرد کہلانے میں فخر محسوس

کرتا ہوں۔ ان کے عزیز شاگرد پروفیسر محمد ابراہیم ڈار صاحب مرحوم سے، جو میرے استاد تھے، حافظ صاحب کی فوق العادت علمی استعداد کا چرچا سنتا ہی رہتا تھا اور بعد میں خود حافظ صاحب کی کتابیں اور مقالے پڑھ کر اسے اس سے بھی زیادہ پایا۔ میرے نزدیک ہندوستان میں فارسی زبان وادب کا عالم، اس پائے کا آج تک پیدا نہیں ہوا۔''

مقالہ لکھنے کی بابت ان کا کہنا تھا:

''بہرحال عرض یہ کرنا تھا کہ میں ضرور اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ لکھنے کی دلی خواہش رکھتا تھا اور رکھتا ہوں، لیکن ابھی میرے جسمانی قویٰ معمول پر نہیں ہیں۔ دوسرے ایک اور کمزوری یہ ہے کہ میں انگریزی میں لکھنے کا عادی ہوں اور (یہ ندامت کی بات ہے کہ) اردو حتیٰ کہ میری مادری زبان گجراتی میں لکھنے کے مقابلے میں، عادت کی وجہ سے انگریزی میں لکھنا میرے لیے زیادہ آسان ہے۔ کیا اس جشن میں انگریزی میں لکھے ہوئے مقالوں کی گنجائش ہے؟''

میری درخواست پر ان کا ارادہ شیرانی صاحب کی ''تنقید پرتھی راج راسا'' پر توسیعی مضمون تیار کرنے کا تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''پیر کا فریکچر ہوجانے کی وجہ سے کچھ دن پہلے تک فراش تھا اور کہنا مشکل تھا کہ کب تک نقل وحرکت چہ جائے کہ نوشت وخواند کے قابل ہو پاؤں گا۔ نیز ایسا وعدہ بھی کرنا نہیں چاہتا تھا جس سے عہدہ برآ نہ ہوسکوں ورنہ حسب ارشاد کتب خانے سے 'پرتھی راج راسا' منگوا کے رکھی تھی۔''

ان کے اسی پہلے خط سے مجھے یہ اطلاع بھی ملی کہ وہ پروفیسر ڈار مرحوم کے داماد بھی ہیں اور یہ شادی ڈار صاحب کی وفات کے کئی سال بعد ہوئی تھی۔

مقالہ تو وہ نہ لکھ پائے لیکن اس تقریب کی وساطت سے ہمارے درمیان خط کتابت کا مستقل سلسلہ شروع ہوگیا جو کم وبیش اکیس برس تک جاری رہا۔ افسوس کہ ان کے سارے خطوط محفوظ نہ رہ سکے۔ ان کی وفات کی اطلاع پا کر جب میں نے ان کی یادیں تازہ کرنے کے لیے یہ خط تلاش کیے تو سردست سترہ مکاتیب دستیاب ہوسکے جو اس وقت میرے سامنے ہیں۔ ان خطوں کو پڑھ کر مرحوم کی دینی حمیت، اخلاقی عظمت، علمی جستجو، کتاب دوستی اور استاد پرستی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی زبان بھی معیاری اور بے عیب ہے، جیسا کہ ان کے بعض اقتباسات سے اندازہ ہوگا،

اور کہنا پڑتا ہے کہ اپنے نتائج فکر اردو میں پیش کرنے سے گریز دراصل ان کے انکسار کا شاخسانہ تھا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ آزادی کے بعد ہندوستان کا ماحول، وہاں کی حکومت کی پالیسی کے باعث ایک اعلیٰ سرکاری ملازم کی اردو میں تصنیف وتالیف کے حق میں سازگار نہیں تھا اور ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا کہ انہوں نے انگریزی کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا جس کی بدولت انہیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔

میری ان سے دو مختصر ملاقاتیں بھی ہوئیں، ایک لاہور میں اور دوسری دہلی میں، اور سچی بات یہ ہے کہ ان کے خطوط سے میں نے ان کی شخصیت کا جو معیار قائم کیا تھا وہ اس پر بدرجہ احسن پورے اترے۔ وہ مجھ سے عمر، علم، عہدہ اور عمدہ اخلاق غرض ہر اعتبار سے بڑے تھے۔ مجھے ان سے دوستی کا دعویٰ بھی نہیں۔ میری حیثیت ان کی متنوع خوبیوں کے باعث محض ایک عقیدت مند کی سی ہے اور ان سطور کی تحریر کا مقصد بھی اپنے جذبات کا اظہار ہی ہے۔ البتہ اس مضمون کے ذریعے پاکستان کے علمی حلقوں سے ایک بڑی شخصیت کا تعارف ہو سکے گا اور طالبان علم کے لیے ایک مثال فراہم ہو سکے گی۔

ضیاالدین دیسائی صاحب ایک سچے اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور دینی فرائض کے معاملے میں کسی غفلت کے روادار نہ تھے۔ اپنے ہر مکتوب کا آغاز وہ ''باسمہ سبحانہ'' کے الفاظ سے کرتے تھے اور مکتوب الیہ کے نام کے بعد ''سلام مسنون'' لکھنا کبھی نہ بھولتے تھے۔ وہ طرح طرح کے عوارض اور حادثات کا شکار رہے لیکن اللہ پر ان کا ایمان کبھی متزلزل نہیں ہوا۔ ہمیشہ اس کے فضل وکرم پر اعتماد کرتے تھے۔

عالمانہ انکسار کی یہ کیفیت تھی کہ مجھ جیسے ہیچ مدان کو ایسے الفاظ سے مخاطب کرتے کہ میں شرمسار ہو جاتا۔ میں نے ایک دوبار احتجاج بھی کیا لیکن وہ اپنی عادت مستمرہ پر قائم رہے۔ اکثر خطوں کی ابتدا محترم ومکرم بندہ، مشفق ومکرم بندہ، کرم فرمائے بندہ اور مشفقی ومحبی کے القابات سے کرتے۔ اختتام کے معاملے میں مخلص یا اخلاص کیش تو خیر اظہار حقیقت تھا لیکن دعا کا طالب اور دعائے خوشنودی کا طالب، میری شرمندگی کا باعث ہوتا تھا۔ جب دہلی کے محمود شیرانی سیمینار میں عندالملاقات انہوں نے ''مضامین ڈار'' کا پرانا ایڈیشن مجھے عطا کیا تو اس پر اپنے قلم سے یہ الفاظ لکھے:

''محبی ومشفقی مظہر محمود خان صاحب شیرانی بہ تقریب حافظ محمود خان

صاحب شیرانی سیمینار ملاقات پر۔ شیرانی صاحب کے شاگرد کا شاگرد ضیاالدین دیسائی۔

دہلی نو، ۱۱ فروری ۱۹۹۰ء"

دراصل وہ اگلی وضع کے مطابق اپنے استاد پروفیسر ابراہیم ڈار اور ان کے استاد پروفیسر شیرانی سے بے انتہا محبت کرتے اور عقیدت رکھتے تھے۔ مجھ پر ان کی نوازشات کا اصل سبب بھی میرا حافظ صاحب سے نسبی تعلق تھا۔

میں ایک عرصے سے حافظ صاحب کے مکاتیب بغرض اشاعت جمع کر رہا تھا۔ پروفیسر ابراہیم ڈار صاحب کے نام ان کے صرف دو خط مجھے مل سکے تھے جو "نوائے ادب" (بمبئی) میں چھپے تھے۔ میں نے دیسائی صاحب سے اس معاملے میں اعانت کی درخواست کی۔ انہوں نے ڈار صاحب کے باقی ماندہ کاغذات کو کھنگالا، لیکن کوئی مکتوب دستیاب نہ ہو سکا۔ البتہ جب وہ مارچ ۱۹۸۱ء کی ابتدا میں پندرھویں صدی ہجری کے آغاز کی تقریبات میں شرکت کے لیے پشاور اور اسلام آباد آئے تو ۱۰ مارچ کو اسلام آباد ہوٹل کے لیٹر پیڈ پر مجھے خط لکھا کہ وہ مختصر وقت کے لیے لاہور آئیں گے اور پھر عازم کراچی ہوں گے۔ اسی خط کے ساتھ انہوں نے حافظ صاحب کی پروفیسر ابراہیم ڈار کے نام ایک تحریر روانہ کی جو قصائد انوری کے بعض مشکل اشعار کی تشریح پر مشتمل تھی۔ اس کے ساتھ حافظ صاحب کا منسلکہ خط تو نہ ملا تاہم یہ تحریر میں نے "مکاتیب حافظ محمود شیرانی" میں شامل کر دی[۴]۔

لاہور میں ان کا مختصر قیام پروفیسر ابراہیم ڈار مرحوم کی بھتیجی مس اقبال ڈار، پرنسپل لاہور کالج برائے خواتین کے ہاں تھا۔ میں نے مرحوم خورشید یوسفی صاحب کے ہمراہ وہاں جا کر ان سے ملاقات کی۔ ان کی شخصیت سلاست و اعتدال کا نمونہ تھی۔ قد، جثہ، رنگت ہر اعتبار سے موزوں اور معتدل۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ، کلین شیو، انگریزی لباس میں ملبوس، بہرحال تہذیب و اخلاق مجسم تھے۔ بڑی چاہت اور اپنائیت سے ملے۔ مسرت ان کے انگ انگ اور بات بات سے پھوٹ رہی تھی۔ اثنائے ملاقات میں میں نے ان سے دو چیزوں کا بطور خاص ذکر کیا۔ ایک تو سلاطین کے عہد کا ایک شکستہ کتبہ[۵] جو حافظ صاحب کو کھٹو کے نواح میں کسی غیر آباد مسجد کے فرش پر پڑا ملا تھا اور انہوں نے تحفظ کی خاطر اسے اٹھوا کر اپنے گاؤں والی حویلی میں دفن کروا دیا تھا۔ دوسرے

مہاراجہ بوندی کی ایک پرانی توڑے دار بندوق جو غیر معمولی طور پر طویل تھی۔ اس کی فولادی نال پر چاندی منڈھی ہوئی تھی، جس پر طلائی کوفت کا نہایت نفیس کام تھا۔ دستہ آبنوس کا تھا اور اس پر ہاتھی دانت سے بیل بوٹے کندہ کیے گئے تھے۔ جب ہم لوگ ۱۹۴۸ء میں ٹونک سے روانہ ہوئے تو بہت سا سامان ایک کمرے میں مقفل کر دیا تھا لیکن یہ بندوق بعض پرانے ہتھیاروں، یعنی زرہ بکتر، خود و خفتان اور جوشن و چار آئینہ وغیرہ کے ساتھ ایک مہربان کے ہاں امانت رکھ دی گئی تھی۔ بعد میں انہوں نے خصوصی حفاظت کی غرض سے شہر سے دور اپنی زرعی اراضی پر بنے ہوئے مکان میں اس بندوق کو ضروری احتیاطی تدابیر کے ساتھ زمین میں دبا دیا۔ دیسائی صاحب سے ان دونوں چیزوں کا تذکرہ اس لیے کیا گیا تھا کہ ان کی وساطت سے انہیں کسی پبلک ادارے یا عجائب گھر میں منتقل کیا جاسکے۔

اس ضمن میں انہوں نے ناگ پور سے ۲ اگست ۱۹۸۱ء کو خط میں مجھے لکھا:

''آپ نے وطن مالوف کے جس کتبے کا ذکر کیا ہے اس بارے میں عرض یہ ہے کہ اس سلسلے میں آپ جو چاہتے ہیں وہ انشاء اللہ بآسانی ہو جائے گا۔ ایسی قوی امید ہے۔ وطن سے مراد آپ کی ڈھانی[7] ہے یا ٹونک پھر یہ کتبہ وہ تو نہیں جو کھاٹو کے ہی (اب مرحوم) حافظ محمد صدیق[ؒ] صاحب کے گھر میں رکھا گیا تھا؟ بہر حال تفصیلات سے مطلع فرمائیں۔ وہ جودھ پور میوزیم میں بھی بھیجا جا سکتا ہے[8]۔ دوسری چیز کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ کارروائی کرنے کی حتی الامکان کوشش کی جائے گی۔ یہ چیز نیشنل میوزیم وغیرہ کے لائق ہے۔ بہر حال اس بارے میں دہلی جا کر دریافت کروں گا اور آپ نے جن چیزوں کے خدشے کا اظہار کیا ہے ان کے بارے میں تبادلۂ خیالات کروں گا۔''

خدشہ یہ تھا کہ یہ گراں بہا بندوق اس کے امانت دار سے برآمد ہونے کی صورت میں کہیں ان پر اسلحہ ایکٹ وغیرہ کے تحت کوئی مقدمہ نہ قائم ہو جائے اور نیکی برباد گناہ لازم والا معاملہ ہو[9]۔

اسی خط میں یہ اطلاع بھی دی گئی ہے کہ ۲۴ اگست (۱۹۸۱ء) کو ناگ پور ریڈیو سٹیشن کے اردو پروگرام میں بسلسلہ عظیم شخصیات دیسائی صاحب کی ایک تقریر بعنوان ''حافظ محمود شیرانی'' نشر ہو گی[10]۔

لاہور کا قیام انتہائی مختصر ہونے پر اپنے ملال کا اظہار وہ کئی خطوں میں کرتے رہے۔ انہیں یہاں کے اہل علم سے نہ مل سکنے اور بالخصوص پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں شیرانی صاحب کا ذخیرہ

کتب نہ دیکھ سکنے کا افسوس تھا۔ البتہ کراچی میں وہ کچھ زیادہ وقت کے لیے ٹھہرے اور پیر حسام الدین راشدی مرحوم نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری۔ پیر صاحب نے ایک پورا دن صرف کر کے دیسائی صاحب کو مکلی کا شاہی قبرستان دکھایا اور بعد میں مالک رام جی کے نام ایک خط میں ان کے بارے میں لکھا: ''ایک عرصے کے بعد ایک فنافی العلم شخص سے ملاقات ہوئی[۱۱]۔''

اتفاق سے اسی سال ۱۹۸۱ء میں مجھے دہلی میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ۲۴ تا ۲۷ دسمبر منعقد ہونے والے سیمینار میں شرکت کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ میں اپنے محکمے سے نوآبجیکشن سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کی غرض سے سیکرٹریٹ پہنچا تو وہاں ایک دوست نے مشورہ دیا کہ آپ اپنی درخواست میں بجائے سیمینار میں شرکت کا ذکر کرنے کے محض عزیزوں سے ملنے کا مقصد ظاہر کریں۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں خطاب و عتاب کے جھمیلے سے گزرنا پڑے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے ٹونک اور شیرانی آباد کا ویزا تو مل گیا لیکن دہلی کا ویزا نہ مل سکا۔ میں نے دہلی پہنچ کر غالب سے متعلق اپنا مضمون ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے حوالے کیا اور ان کے روکنے کے باوجود ٹونک روانہ ہو گیا جہاں حافظ محمود شیرانی سیمینار منعقد ہو رہا تھا۔ دیسائی صاحب کمال مہربانی سے ۲۳ دسمبر کو ناگ پور سے دہلی پہنچے۔ صورتحال کا علم ہونے پر ۲۴ دسمبر کو میرے نام ایک خط لکھ کر صاحبزادہ شوکت علی خاں، ڈائریکٹر ادارہ تحقیقات عربی و فارسی راجستھان، ٹونک کی معرفت ارسال کیا، جس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

''میری مایوسی کا اندازہ کیجیے جب کل غالب انسٹی ٹیوٹ پہنچنے پر مکرمی ڈاکٹر نذیر احمد نے آپ کا تحفہ دیتے ہوئے یہ بتایا کہ آپ ٹونک تشریف لے گئے ہیں۔ خدا کرے آپ سیمینار کے لیے تشریف لائیں اور ملاقات ہو۔''

اس کے بعد اپنے آئندہ ایک ماہ کے پروگرام کی تفصیل لکھی تھی اور آخر میں یہ کہ ''آپ کا قیام کب تک رہے گا...... اگر آپ کی آمد کی تاریخوں کا پہلے پتا ہوتا تو میں ٹونک آجاتا......''

میں ایک ہفتہ ٹونک اور ایک ہفتہ شیرانی آباد قیام کر کے واپس چلا آیا لیکن دیسائی صاحب بعد کے کئی خطوں میں ملاقات نہ ہونے پر افسوس کا اظہار کرتے رہے۔ مثلاً تیسرے یا چوتھے خط میں، جو ۱۵ اپریل ۱۹۸۲ء کو لکھا گیا ہے، فرماتے ہیں: ''مجھے بڑا قلق ہے کہ آپ سے ملاقات

نہ کر سکا۔ زیادہ اس لیے کہ میں خود پہنچ سکتا تھا لیکن آپ کا پروگرام معلوم نہ ہونے کی وجہ سے مجبوری تھی۔"

اسی اثنا میں ادارہ تحقیقات عربی و فارسی راجستھان، ٹونک نے "راجستھان میں تصوف" کے عنوان سے ایک سہ روزہ سیمینار (۲۰ مارچ تا ۲۳ مارچ ۱۹۸۲ء) کا انعقاد کیا۔ اس میں دیسائی صاحب بطور خاص شریک ہوئے اور اپنا مقالہ پڑھا۔ اس موقع پر انہوں نے بڑے اشتیاق اور عقیدت سے حافظ محمود شیرانی مرحوم کے مزار پر حاضری دی۔ اسی ۵ اپریل ۱۹۸۲ء والے خط میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ زندگی کی ایک تمنا ماہ گزشتہ میں پوری ہوئی۔ اپنے استاذ کے استاذ کو دیکھنا تو قسمت میں نہ تھا لیکن یہ بھی حسرت رہ جاتی کہ وہ مقام جہاں وہ رہے اور بالآخر آسودۂ خواب ابدی ہوئے اس کی زیارت سے بھی کہیں محرومی نہ ہو اور یہ حسرت حسرت ہی رہ جائے۔ الحمدللہ مارچ کی بائیس کی صبح، خدا جناب مولانا عمران خان[۱۲] صاحب کو جزائے خیر عطا فرمائے، ان کی معیت میں، ان کی اور شوکت صاحب کی وساطت سے مہیا کی گئی سواری پر جا کر اس تمنا کو بھی پورا کیا اور مرحوم کے مزار پر حاضری اور فاتحہ خوانی کے فرائض اپنی اور اپنے استاذ کی جانب سے ادا کر کے سعادت مندی حاصل کی۔ واللہ کیا پُر فضا مقام ہے۔ مرحوم کو دنیا ان کی تحریروں سے تو غالباً ایک خشک طبیعت انسان کی صورت میں جانتی ہو گی لیکن انہوں نے اپنی بود و باش اور آخری آرام کی جگہ کے لیے جو مقام پسند فرمایا وہ واقعی ایک نہایت ہی زندہ دل اور مناظر فطرت کے شیدائی کا ہی حصہ تھا۔ دریا کے کنارے اور باغات کے درمیان وہ آسودۂ خواب ابدی ہیں اور کس مزے سے۔ طبیعت کو وہاں حاضری دے کر جو سکون و اطمینان ہوا وہ بیان سے بالا ہے۔ فرحمہ اللہ تعالیٰ رحمتہ واسعتہ۔"

دیسائی صاحب ۱۹۸۳ء میں ڈائریکٹر اپی گرافی کے عہدے سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن احمد آباد میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔ احمد آباد سے باہر سرکھیج[۱۳] جانے والی شاہراہ پر ایک نئی بستی خورشید پارک میں انہوں نے اپنا مکان بنالیا تھا۔ ان کی علمی مصروفیات پہلے سے بھی بڑھ گئی تھیں۔ ملک اور بیرون ملک کے دورے ہوتے رہتے تھے۔ ۱۹۸۶ء میں وہ پھر ایک حادثے کے نتیجے میں پیر کے فریکچر کا شکار ہوئے۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ میں آئندہ ہندوستان آنے کے موقع پر احمد آباد کا

ویزا ضرور لے کر آؤں۔ اپنے خطوں میں تقاضا کرتے رہتے تھے۔ میں ویزا کے حصول میں دقتوں کا عذر کرتا۔ اس ضمن میں ۸ ستمبر ۱۹۸۶ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

''اسلام آباد میں مسٹر اے اے مفتی[۱۱] حکومت پاکستان کے اٹارنی جنرل ہیں۔ وہ ہمارے رفیق اور ابراہیم صاحب ڈار مرحوم کے شاگرد پروفیسر ڈاکٹر احمد حسین قریشی کے برادر نسبتی ہیں۔ ان سے اگر اس سلسلے میں مدد کی ضرورت ہو تو ضرور ہم دونوں کا حوالہ دیں۔ بہر حال آپ کی آمد ہم لوگوں کے لیے باعث مسرت تو ہوگی ہی لیکن اپنے دادا استاد کے پوتے کی زیارت وضیافت کر سکنے کے موقع کی بازیافت بھی......''

نومبر ۱۹۸۸ء میں دیسائی صاحب کو دل کا عارضہ لاحق ہوا۔ ڈاکٹروں نے مکمل آرام کا مشورہ دیا لیکن ان کی زندگی تو لکھنے پڑھنے سے عبارت تھی۔ کہاں تک اس مشورے پر عمل کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان کی تالیفات اور علمی مقالات کا سنہ وار جائزہ لیا جائے تو یہ انکشاف ہوتا ہے کہ بیماریٔ دل میں مبتلا ہونے سے لے کر اس کے ہاتھوں کام تمام ہونے تک کے عرصے میں انہوں نے کوئی دس کتابیں اور سو ڈیڑھ سو کے درمیان عالمانہ مقالات تحریر کیے جن میں سے بیشتر معیاری جرائد میں شائع ہوئے۔

۱۱ فروری ۱۹۹۰ء کو غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی نے تین نشستوں پر مشتمل حافظ محمود شیرانی سیمینار منعقد کیا۔ اس میں ہندوستان کے متعدد اہل علم نے شرکت کی۔ میں بھی حاضر ہوا تھا۔ دیسائی صاحب اپنی علالت اور معالجین کی تنبیہ کے باوجود نہ صرف بذریعہ ہوائی جہاز تشریف لائے بلکہ ''فارسی اردو تحقیق کا مکتب شیرانی'' کے عنوان سے ایک مضمون بھی پڑھا جو پروفیسر ابراہیم ڈار مرحوم سے متعلق تھا۔ اس کے آغاز میں وہ کہتے ہیں:

''آج میں آپ کے سامنے ایک ایسے فاضل و عالم محقق کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہوں جسے مکتب شیرانی کا نامور ترین فرد مانا گیا ہے۔ اس ناچیز کو بھی کم از کم طفل دبستاں کی حیثیت سے ہی سہی اس عظیم مکتب سے ایک گونہ وابستگی کا شرف حاصل ہے۔''

اور مضمون کا اختتام ان الفاظ پر کرتے ہیں:

''شیرانی سکول کے اس عظیم رکن کے شاگردوں نے بھی فارسی درس و تدریس اور تحقیق میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ ان میں سے دو ایک تو اپنے میدان میں بین الاقوامی شہرت کے بھی مالک

ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اپنے استاد کی گرد تک نہ پہنچ سکا۔"

ان دونوں اقتباسات کے آخری فقرے دیسائی صاحب کے طبعی انکسار کے آئینہ دار ہیں۔ یہ امر واقع ہے کہ دبستان شیرانی کے تحقیقی طریق کار سے قطع نظر اس کے وابستگان میں اخلاقی اعتبار سے تین خصوصیات نمایاں طور پر پائی جاتی ہیں یعنی انکسار، نام و نمود سے گریز اور اپنے اساتذہ بلکہ ان کے اخلاف کا دلی احترام جو محبت کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔

اس سیمینار کے موقع پر بھی دیسائی صاحب نے میرے ساتھ وہی محبت آمیز اور مشفقانہ برتاؤ کیا جس کی ان سے توقع تھی۔ اس کا ایک دلچسپ اظہار یوں ہوا کہ مجھ سے کہنے لگے: "میں آپ کے ساتھ ایک فوٹو بنوانا چاہتا ہوں۔" میں نے عرض کیا: "یہ تو میرے لیے باعث فخر ہوگا۔" بولے: "نہیں بلکہ میرے لیے۔" باوجود علالت اور نقاہت کے وہ سیمینار کی تینوں نشستوں میں برابر شریک رہے۔ بعد میں وہ احمد آباد لوٹ گئے اور میں ٹونک روانہ ہو گیا، جہاں ۱۶ فروری کو شیرانی صاحب کی چوالیسویں برسی کی مناسبت سے ایک تقریب تھی۔ ٹونک سے شیرانی آباد ہوتا ہوا میں واپس آ گیا۔ ابھی تھکن بھی اتارنے نہ پایا تھا کہ ان کا گرامی نامہ موصول ہوا۔ لکھا تھا:

"امید ہے آپ بخیر و عافیت وطن کی زیارت کے بعد واپس پہنچ گئے ہوں گے۔ دہلی کی ملاقات تشنہ رہی، لیکن آپ سے ملاقات کر سکا، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی عنایت اور مہربانی تھی، کیونکہ بڑی مشکل سے ڈاکٹر سے اجازت لے کر آنے کی ہمت کی تھی۔ سیمینار یہاں کے معیار کے مطابق نہایت اچھا رہا۔ کم از کم ہماری آئندہ نسل کے فارسی دان حضرات کو حافظ صاحب مرحوم کے کام اور مقام کا اندازہ تو ہوا۔"

مکتوب کے آخر میں پھر اس ملاقات کی طرف بدیں الفاظ اشارہ تھا:

"بہرحال آپ سے مختصر ہی ملاقات کر کے حافظ صاحب مرحوم کے شاگرد کے اس شاگرد کو بے انتہا خوشی ہوئی بلکہ اسے میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔ کاش میری صحت اجازت دیتی تو ٹونک حاضر ہوتا۔"

دیسائی صاحب نے منجملہ علمی خدمات کے راجستھان کے عربی و فارسی کتبات پر بھی قابل قدر کام کیا ہے۔ حافظ صاحب کو ان کتبات کے تحفظ اور ان کا ریکارڈ تیار کرنے کی بڑی فکر رہتی تھی۔ ان کی تشویق پر ڈاکٹر عبداللہ چغتائی مرحوم نے اس موضوع پر خاصا کام کیا تھا[15] لیکن ابھی

بہت کچھ کرنے کی گنجائش باقی تھی۔اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے ''مقالات حافظ محمود شیرانی'' (جلد اوّل) کے آغاز میں حافظ صاحب کے حالات زندگی کے ذیل میں لکھا تھا:

''اس علاقے پر اسلامی تاریخی نقطہ نظر سے بہت کام کرنے کی گنجائش ہے جس میں تقسیم ملک کے باعث دشواریاں حائل ہوگئی ہیں۔''

قسام ازل نے یہ خدمت ڈاکٹر دیسائی کی قسمت میں لکھی تھی جنھوں نے اس کام کا صحیح معنی میں حق ادا کر دیا۔ انہوں نے نہ صرف چغتائی صاحب اور بعض دیگر کتبہ شناسوں کے کام میں در آنے والی اغلاط کی تصحیح کی بلکہ متعدد نئے کتبات دریافت کیے۔ میری اس موضوع پر ان کے ساتھ خطوط میں گفتگو رہتی تھی اور وہ ازراہ کرم مجھے اس بارے میں اپنی تالیفات اور مضامین کے آف پرنٹ روانہ کرتے رہتے تھے۔اس ضمن میں ۲۲ جون ۱۹۹۰ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

''راجستھان کے میں نے کئی کتبے شائع کیے ہیں اور دریافت بھی ہوئے ہیں۔ انگریزی میں آج سے تقریباً پندرہ سال[۱] پہلے راجستھان کے شائع شدہ فارسی عربی کتبات پر ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس میں کتبوں کا متن نہیں لیکن خلاصہ تھا اور اس کا اشاریہ بہت ہی مفصل اور کار آمد تھا۔ اس کی شاید میرے پاس ایک نقل (ہو) ء میں انشاءاللہ ارسال خدمت کردوں گا۔ کچھ کتبات مع عکس متنی، اور تاریخی نوٹس کے ساتھ ہمارے رسالے اپی گرافیکا انڈیکا (عریبک اینڈ پرشین سپلیمنٹ) میں بھی شائع کیے تھے۔ ان میں جن کے آف پرنٹ ہیں وہ بھیجوں گا، انشااللہ ورنہ زیروکس......''

اسی خط میں آگے چل کر لکھا ہے:

''چغتائی صاحب مرحوم کے شائع کردہ کتبوں کے مضامین میں کافی اغلاط ہیں۔ ان میں اچھی خاصی اغلاط والوں کو میں نے دوبارہ شائع کیا ہے۔ ویسے ناگور کے خان زادوں، لاڈنوں وغیرہ کے کتبوں کو شائع کیا ہے۔ لاڈنوں کے علاقے میں مسلمانوں کی ایک برادری موہل ہے...... اس پر میرا ایک مضمون، ایک کتبے کی بنیاد پر میں نے لکھا تھا...... وہ بھی تلاش کر کے بھیجوں گا۔''

راجستھان کے کتبوں کو شائع کرنے اور ان کی وساطت سے یہاں کی تاریخ کے بعض پہلوؤں پر نئی روشنی ڈالنے کی خدمت کے اعتراف میں جے پور کی ایک تقریب میں راجستھان

کے وزیر اعلیٰ نے دیسائی صاحب کو طلائی تمغا بھی عطا کیا تھا۔

کتبوں سے قطع نظر وہ اپنی دوسری علمی سرگرمیوں سے بھی مطلع فرماتے رہتے تھے مثلاً: ''شیخ احمد کھٹو مغربی کے ملفوظ مرقاۃ الوصول الی اللہ والرسول پر میں نے پٹنہ میں، مرقاۃ الوصول سے دستیاب چودھویں پندرھویں صدی کے راجستھان اور گجرات کی سیاسی، ثقافتی اور ادبی تاریخ سے متعلق مواد پر جو لیکچر دیا تھا، وہ بھی ابھی شائع ہوا ہے...... آف پرنٹ آنے پر ایک انشاءاللہ ضرور آپ کے لیے رکھوں گا۔''

ان کی سرکاری اور غیر سرکاری اداروں سے شائع ہونے والی بعض تالیفات میں براہ راست اپنے ذرائع سے بھی حاصل کر لیتا تھا۔

دیسائی صاحب کی وسیع علمی دلچسپیوں کی بنا پر انہیں پاکستان میں شائع ہونے والی متعدد مطبوعات یا پھر مخطوطات کی عکسی نقول کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس سلسلے میں کراچی میں ان کے بعض قدردان اور علم دوست حضرات مثلاً ڈاکٹر ریاض الاسلام اور مشفق خواجہ[17] صاحب ان کی معاونت کرتے تھے۔ مجھے اس بات پر طمانیت محسوس ہوتی ہے کہ میں بھی اس معاملے میں کسی حد تک ان کے کام آتا رہا۔ ان کا ارشاد تھا: ''ادھر جب بھی میرے کام کی...... فارسی ادب، ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ، فن تعمیر، خطاطی وغیرہ پر فارسی اردو کتب طبع ہوں تو ضرور مطلع فرماتے رہیں۔''

چنانچہ میں ان کے مطلب کی تازہ چھپنے والی کتابیں یا پرانی مطبوعات نہ ملنے کی صورت میں ان کے عکس بنوا کر ارسال کر دیتا تھا۔ بعض مخطوطات کے فوٹوسٹیٹ یا مائیکروفلمیں درکار ہوتی تھیں یا کسی قلمی کتاب کے مخصوص صفحات کے عکس۔ مثال کے طور پر غالباً ۱۹۸۶ء کے[18] ایک گرامی نامے میں یہ سطور ملتی ہیں:

''مجھے خیال سا رہ گیا ہے کہ حافظ صاحب مرحوم نے کہیں لکھا ہے کہ دیوان قاضی محمود دریائی[19] کی نقل ان کے ذخیرہ کتب میں موجود ہے۔ اگر وہاں یونیورسٹی یا کہیں موجود ہو تو کیا اس کی زیروکس مل سکتی ہیں؟

''پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں...... دیوان جلالی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی مرتبہ فہرست کی جلد اوّل کے صفحہ ۳۷۷، شمارہ ۵۳۶ پر اس کا ذکر ہے (یہ فہرست یہاں تو ہے نہیں۔ میں نے امریکہ

میں دیکھی تھی) اگر اس کی بھی زیروکس مل سکے تو عنایت ہوگی۔

''اسی کے صفحہ ۱۹۲، شمارہ ۲۸۸ کے تحت نسخہ ناسخہ مثنوی از عبداللطیف عباسی کا ذکر ہے۔ اس کے ورق ۱۴ پر مہریں اور عبارت ہے۔ اس صفحے کا عکس بھی اگر مہیا ہو سکے تو کرم ہوگا۔

''اسی فہرست کے صفحہ ۱۳۹، شمارہ ۲۰۴ پر لطائف الحقائق، حدیقتہ الحقائق مصنفہ سنائی کی شرح ہے۔ اس کے صفحہ ۲۰ پر ایک نوٹ ہے...... اگر اس صفحے اور اس کے ترقیمے کے عکس مل جائیں تو عنایت ہوگی۔''

ابھی میں یہ چیزیں مہیا نہ کر پایا تھا کہ ان کا اگلا مکتوب پہنچ گیا جس میں متذکرہ بالا اشیا کی فہرست میں ڈاکٹر سید عبداللہ والی مطبوعہ فہرست مخطوطات کے حوالے سے ایک اور فرمائش تھی یعنی:

''مثنویات بیدل...... (ایضاً صفحہ ۳۹۰) میں ہر مثنوی کی ابتدا میں غالب کی مہر اور اس کے اپنے خط میں نوشتہ ایک شعر...... ان صفحوں کا عکس۔''

آخر میں لکھتے ہیں: ''مندرجہ بالا چیزیں آپ اپنی سہولت سے مہیا فرما کر عنایت فرمائیں۔ میں تکلیف اور زحمت آپ کو بار بار دے رہا ہوں۔ 'کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ' والا معاملہ ہے اور 'خاموشی ما گشت بدآموز بتان را' آپ کا مسلک۔ بہر حال 'برگ سبز است تحفۂ درویش' کے مصداق دست بدعا اور دعا بدہن ہوں، جزاک اللہ احسن الجزاء۔''

۱۹۹۱ء کے بعد دیسائی صاحب کی صحت بتدریج گرتی گئی لیکن ان کے علمی مشاغل میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ۲۰ اگست ۱۹۹۱ء کے خط میں رقم طراز ہیں: ''میں الحمدللہ یوں تو بخیریت ہوں، لیکن زیر علاج اور پابندی خصوصی نقل و حرکت پر۔ شہر کے باہر رہتا ہوں اس لیے شہر میں جانا کم ہوتا ہے...... احمد آباد کے باہر بغیر ہمراہی کے اجازت نہیں۔ ٹرین یا بس کا سفر تقریباً ممنوع ہے۔ صرف دہلی جاتا آتا رہتا ہوں، تین چار ماہ میں ایک مرتبہ ہوائی جہاز سے۔ ہمارے ایک امریکن دوست نے 'بادشاہ نامہ لاہوری' کے انگریزی ترجمے اور 'تاریخ شاہجہاں' پر ایک پروجیکٹ لیا ہے۔ ان سے ملنے ملانے کے لیے جاتا ہوں۔ یہ پروجیکٹ بڑا کارآمد ہوگا۔ انشاء اللہ تمام ہونے پر تاریخی حلقوں میں کافی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ کیونکہ اس میں ترجمے کے علاوہ نوٹس ہوں گے۔''

علاوہ ازیں وہ ''مضامین ڈار'' کے نئے اور جامع ایڈیشن کی تیاری بھی کر رہے تھے نیز ''سیرت احمدیہ'' (اردو ترجمہ مرقاۃ الوصول از مولانا سید ابوظفر ندوی مرحوم) اور شیخ محمود بن سعید

ایرجی کی ''تحفۃ المجالس'' کے اردو ترجمے (از سید ابوظفر ندوی) کی اغلاط سے پاک نئی اشاعتوں میں بھی دلچسپی لے رہے تھے۔ ''مضامین ڈار'' کی اشاعت ثانی کا کام مکتبہ جامعہ (دہلی) کے شاہد علی خاں نے اپنے ذمے لیا تھا لیکن وہ اس کی تکمیل نہ کر سکے بلکہ دیسائی صاحب کے فراہم کردہ پروفیسر ڈار مرحوم کے بعض اضافی مضامین بھی گم کر بیٹھے۔ بالآخر یہ مجموعہ اردو ساہتیہ اکادمی، گاندھی نگر (گجرات) کی طرف سے شائع کیا گیا لیکن دیسائی صاحب کے حسب منشا اضافوں سے محروم رہا جس کا ان کو بڑا قلق تھا۔ اس کا اظہار وہ اپنے خطوں میں کرتے رہے۔ ''سیرت احمدیہ'' بھی اردو ساہتیہ اکادمی نے شائع کی جس کا صحت نامہ دیسائی صاحب نے ترتیب دیا۔ ''تحفۃ المجالس'' دیسائی صاحب کی نظر ثانی کے بعد حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سنٹر، احمد آباد کے اہتمام سے اشاعت پذیر ہوئی۔

۱۹۹۶ء کے وسط سے دیسائی صاحب کو ہوائی جہاز کے ذریعہ سفر ترک کرنا پڑا۔ یوں دہلی کے پھیرے ختم ہوئے لیکن فارسی محاورہ ''بالائے سیاھی کہ رنگی نیست'' کے مصداق علمی جستجو کے نشے سے بڑھ کر کوئی نشہ نہیں ہوتا اور وہ تو دود چراغ کے قدیم تریاکی تھے[۲۱]۔ چنانچہ اپنی مصروفیات کے بارے میں ۲۰ نومبر ۱۹۹۷ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''اپنا یہ حال ہے کہ کچھ نہ کچھ پڑھ لکھ لیتا ہوں۔ زیادہ تر مضامین لکھتا ہوں۔ یادناموں، پیش کش ناموں وغیرہ کی فرمائش کی تعمیل میں مقالے لکھتا ہوں۔ 'تاریخ شاہ جہاں' کا منصوبہ ابھی اشاعتی صورت اختیار نہیں کر پایا۔ معاصر فارسی تاریخوں پر مبنی تاریخ نویسوں کے الفاظ میں ہی شاہجہاں کی پوری زندگی کے حالات انگریزی میں تیار ہو چکے ہیں، ایک امریکن دوست کے ساتھ...... اس کے بعد...... شاہجہاں کے منصب دار، اس کے کتبے، سکے اور فرامین وغیرہ کر کے مزید دو تین جلدوں کا منصوبہ بنائے ہوئے ہیں۔''

اسی خط میں انہوں نے محمد راشد شیخ صاحب کا مجھ سے بدیں الفاظ تعارف کرایا:

''ایک صاحب اصل گجرات کے لیکن وہیں کے پلے اور بڑھے ہوئے محمد راشد شیخ صاحب جو کسی بڑی فرم میں کام کرتے ہیں...... ان کو خطاطی کا شوق ہے اور 'تذکرہ خطاطین' تالیف کی ہے جو طباعت کے لیے تقریباً تیار[۲۲] ہے۔''

حسن اتفاق سے راشد صاحب سے میری ملاقات اس سے قبل ہو چکی تھی۔

کتابوں وغیرہ کی فرمائش وہ اب بھی کرتے رہتے تھے۔ اسی محولہ بالا مکتوب میں انہوں نے ذخیرہ شیرانی میں موجود گلستان سعدی کے ایک اہم مخطوطے کے سرورق اور ترقیمے کے عکس روانہ کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نسخے کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ شاہ جہاں کے صدر الصدور، احمد آباد کے مشہور سہروردی خاندان، مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے پوتے، حضرت برہان الدین عبداللہ قطب عالم بخاری کے صاحبزادے حضرت شاہ عالم کے سجادہ (نشین) سید جلال الدین مقصود عالم رضا کا کتابت کردہ ہے اور اسے یاقوت المستعصمی کے کتابت کردہ نسخے سے، جو جہانگیر کی ملکیت میں تھا، نقل کیا گیا تھا۔''

جب میں نے مطلوبہ عکس ان کی خدمت میں روانہ کیے تو انہوں نے ۱۴ فروری ۱۹۹۸ء کے خط میں ان کی رسید سے مطلع کرتے ہوئے اس نسخے کی اہمیت پر مزید روشنی ڈالی:

''گلستان سعدی نسخۂ شیرانی کا زیروکس ملا۔ بہت بہت شکریہ۔ ڈاکٹر چغتائی صاحب مرحوم نے بھی اپنی 'پاک و ہند میں اسلامی خطاطی'[۲۳] میں اس کا عکس دیا ہے۔ اس نسخے کی اہمیت کی طرف فہرست نگار ڈاکٹر بشیر حسین نے اشارہ[۲۴] ضرور کیا ہے لیکن ان کا بیان نامکمل اور تشنہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس پر ایک مختصر مقالہ لکھوں۔ قلمی نسخوں کے سفر کی یہ بھی ایک نہایت دلچسپ اور اہم مثال ہے۔ یہ نسخہ شیرانی، جیسا کہ اس پر ثبت مہر سے پتا چلتا ہے، احمد آباد کے قاضی خاندان کی مِلک تھا۔ قاضی محمد نظام الدین خاں، گجرات کے اپنے زمانے کے جید عالم اور استاد مولانا نورالدین صاحب محمدی صدیقی، جن کے لیے اورنگ زیب عالمگیر کے قاضی لشکر شیخ عبدالوہاب کے بیٹے یا پوتے (اس وقت ذہن میں نہیں) قاضی محمد اکرام الدین خاں نے مدرسہ ہدایت بخش سوا لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر کرایا تھا اور جس کے لیے ولی گجراتی نے فارسی رسالہ 'نورالمعرفت' تصنیف کیا تھا، کے صاحبزادے ہیں۔ دوسری دلچسپی کی بات یہ ہے کہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ کے کتاب خانے میں گلستان کا ایک نسخہ ہے جو تیرھویں صدی کے وسط میں نسخہ شیرانی سے اس وقت کے قاضی کے ہمشیرزادے نے نقل کیا ہے اور اس میں اس کی تفصیل بھی دی ہے۔ بہرحال آپ کا بہت مشکور ہوں کہ آپ نے یہ زیروکس بہم پہنچائیں۔ جزاک اللہ۔''

اپریل ۱۹۹۸ء میں انہوں نے مجھے ''سیرت احمدیہ'' اور ''تحفۃ المجالس'' کی پہلی اشاعتوں کے نسخے بذریعہ ڈاک ارسال کیے۔ میں نے ان کی رسید کا اطلاعی عریضہ لکھا لیکن وہ انہیں نہ مل سکا۔

قسمت کی خرابی دیکھیے کہ ۸ جنوری ۲۰۰۰ء کی شام عین عیدالفطر (۱۴۲۰ھ) کے دن گھر کے قریب سڑک عبور کرتے ہوئے ایک تیز رفتار موٹر سائیکل نے انہیں ٹکر ماردی اور تیسری باران کے پاؤں کا فریکچر ہوا۔ پانچ چھ ماہ صاحب فراش رہے۔ فریکچر تو جوں توں کر کے ٹھیک ہو گیا لیکن بیماری قلب میں شدت پیدا ہوگئی۔ ذیابیطس نے، جو پہلے خوراک میں احتیاط کے ذریعہ قابو میں رہتا تھا، اب دواؤں کا محتاج کر دیا۔ گھر سے باہر نکلنا بھی ممکن نہ رہا۔ اپریل ۲۰۰۱ء میں دونوں آنکھوں میں موتیا اتر آنے کے باعث آپریشن ہوئے جو بحمد للہ کامیاب رہے۔ ان عوارض وشدائد کے باوجود انہوں نے انہی دنوں گلستان (مخطوطہ شیرانی) پر انگریزی مضمون مکمل کیا اور بمبئی کے مؤقر جریدے ''مارگ'' میں اشاعت کے لیے دیا۔ مجھے یہ اطلاع دیتے ہوئے اپنے ۱۲ اگست ۲۰۰۱ء کے خط میں ایک بار پھر یہ موضوع چھیڑا ہے:

''یہ نسخہ نہایت اہم اس لیے ہے کہ سید جلال بخاری (احمد آبادی) نے وہ نسخہ اس نسخے سے نقل کیا ہے جسے یاقوت المستعصمی نے خود شیخ سعدی کے نسخے سے لکھا تھا اور جب وہ جہانگیر کے پاس آیا تو اس میں سے کچھ اوراق غائب تھے۔ خود جہانگیر کا اس نسخے پر جو نوٹ ہے اور جسے سید جلال نے نقل کیا ہے (اس سے) یہ پتا چلتا ہے کہ جہانگیر نے نہ صرف اچھے سے اچھے کاتب سے نسخے کو مکمل کرایا لیکن (کذا۔ بلکہ؟) اس میں چوالیس تصویریں اپنے تصویر خانے کے مصوروں سے بنوا کر لگوائیں...... ڈاکٹر چغتائی مرحوم نے...... اس کا ذکر اور عکس شائع کیا ہے لیکن انہوں نے جہانگیر والا نوٹ نظر انداز کر دیا ہے، اور بھی کچھ چیزیں چھوڑ دی ہیں۔''

اس خط میں بھی دیسائی صاحب اپنی فطری علمی جستجو کے اظہار سے باز نہ رہ سکے چنانچہ لکھتے ہیں:

''ہاں، ڈاکٹر چغتائی نے مجھے ایک بار لکھا تھا کہ ان کے پاس ڈار صاحب مرحوم کے آئے ہوئے کئی خطوط ہیں۔ میں نے ان کو لکھا تھا کہ مجھے بھیج دیں لیکن وہ نہیں بھیج سکے۔ آپ کبھی لاہور جا کر معلوم کریں۔ اگر ہوں تو خطوط یا زیروکس کاپیاں مل جائیں تو یہاں اردو اکادمی کا رسالہ 'سابرنامہ' نکلتا ہے اس میں شائع کراؤں۔''

اسی خط میں یہ اطلاع بھی دی گئی تھی کہ ''سیرت احمدیہ''، ''تحفۃ المجالس'' اور ''مضامین ڈار'' کی تازہ اشاعتوں کے نسخے وہ میرے لیے لاہور کے ایک صاحب کے ہاتھ، جن کا تعلق احمد آباد

کے ''ٹوپی والا'' خاندان سے تھا، روانہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ میں ان کے درج کردہ پتے پر جا کر یہ تینوں کتابیں لے آیا۔

خط کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا تھا: ''خط کافی طویل ہو گیا ہے۔ دعا فرماتے رہیں۔''

بس یہ ان کا آخری خط تھا۔ میں نے کتابوں کی وصولی کی اطلاع پر مبنی خط لکھا۔ بلکہ اس کے بعد دو ایک خطوط خیریت طلبی کی غرض سے بھی لکھے لیکن صدائے برنخاست۔ تشویش یوں تھی کہ یہ رویہ ان کے معمول اور وضعداری سے بہت بعید تھا۔ یہی نتیجہ نکالا کہ وہ اتنے علیل ہیں کہ لکھ نہیں سکتے۔

طبیب عشق ببرد طمع ز بیمارے
کہ شب براحت ازین درد بے دوا خفتست[۲۵]

بس اس کے بعد ان کی کوئی خیر خبر نہیں آئی یہاں تک کہ ''معارف'' کے ذریعے سناؤنی آ گئی۔

گلی میں اس کی گیا، سو گیا، نہ بولا پھر
میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا

ڈاکٹر ضیاالدین دیسائی مرحوم ۷ امئی ۱۹۲۵ء کو احمد آباد کے ایک مضافاتی گاؤں ''دھندوکا'' میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام عبدالحیٔ دیسائی تھا، اسی لیے وہ اپنا نام زیڈ اے دیسائی لکھا کرتے تھے۔ میں ایک عرصے تک ان کا نام ضیاالدین احمد سمجھتا رہا[۲۶] پھر خیال آیا کہ ماضی کے احاطہ بمبئی (جس میں سندھ، گجرات اور کاٹھیاواڑ کے علاقے بھی شامل تھے) کے رواج کے مطابق ''اے'' احمد کا نہیں بلکہ ان کے والد کے نام عبدالحیٔ کا مخفف ہے۔ ان کا تعلق گجرات کے ہندوؤں کی مشہور گوت دیسائی سے تھا اور چند پشتوں پہلے ان کے بزرگ مسلمان ہو گئے تھے۔

ضیاالدین بڑے ہونہار طالبعلم تھے اور ان کا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا تھا۔ انھوں نے ۱۹۴۶ء میں گجرات کالج، احمد آباد (ملحقہ بمبئی یونیورسٹی) سے بی اے کیا اور یونیورسٹی میں اوّل آنے کے سبب رستم جی ہرمزجی مودی پرائز اور گورنمنٹ سپیشل سکالر کا اعزاز ملا۔ ۱۹۴۸ء میں ایم اے (فارسی) میں بھی بمبئی یونیورسٹی میں اوّل رہے اور چانسلرز میڈل اور جعفر قاسم موسیٰ گولڈ میڈل حاصل کیے۔

ایم اے میں انہیں پروفیسر ابراہیم ڈار جیسے نابغہ استاد کی شاگردی میسر آئی۔ آگے چل کر ۱۹۵۹ء میں انہوں نے تہران یونیورسٹی سے ''احوال و آثار فیضی بحوالہ خصوصی مثنوی نل ودمن'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری حاصل کی۔

دیسائی صاحب نے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۳ء تک گجرات کالج، احمد آباد، اسماعیل یوسف کالج، بمبئی اور دھرمندر کالج، راجکوٹ میں بطور لیکچرار کام کیا۔ پھر آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے محکمے میں کتبہ شناسی (عربی و فارسی) کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۱ء میں ترقی پاکر سپرنٹنڈنٹ اور بالآخر ۱۹۷۷ء میں ڈائریکٹر اپی گرافی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۸۳ء میں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انہیں انڈین کونسل فار ہسٹاریکل ریسرچ (دہلی) کے سینئر فیلو کے عہدے پر متعین کیا گیا جہاں انہوں نے نو سال تک مفید خدمات انجام دیں۔ یہاں انہوں نے ہندوستان کے طول و عرض میں پائے جانے والے عربی، فارسی اور اردو کتبوں کی پانچ جلدوں میں ایک جامع فہرست کی اشاعت کا منصوبہ بنایا۔ ان جلدوں کا تعلق بالترتیب جنوبی، مغربی، شمالی، مشرقی اور وسطی ہند کے کتبوں سے تھا۔ ان میں پہلی دو جلدیں دیسائی صاحب کی حین حیات شائع ہوئیں۔ ۱۹۹۲ء سے لے کر اپنی وفات تک وہ امریکن انسٹی ٹیوٹ فار انڈین سٹڈیز (نئی دہلی) کے تاریخ شاہجہاں پروجیکٹ کے جائنٹ چیف کولیبوریٹر کے فرائض انجام دیتے رہے۔

کہنے کو تو دیسائی صاحب کا اصل میدان کتبہ شناسی تھا لیکن انہیں متعدد شعبہ ہائے علوم وفنون میں نمایاں مقام حاصل تھا۔ ان میں فارسی زبان و ادب بالخصوص ہند فارسی ادبیات، تاریخ ہند، تاریخ گجرات، ہند اسلامی ہنرمندی، فن تعمیر، علم مسکوکات اور فن خطاطی کے نام سرفہرست لیے جا سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان جیسی علمی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے اور ان کی وفات دنیائے علم وفن کا ناقابل تلافی سانحہ ہے۔ اپنی ہمہ گیری کی بنا پر وہ اپنے بیک واسطہ استاد پروفیسر حافظ محمود شیرانی سے بڑی مشابہت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ صاحبزادہ شوکت علی خاں نے عریبک پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ جرنل (ٹونک) کے شمارہ نمبر ۴، سنہ ۸۵-۱۹۸۴ء کے تعارف میں لکھا تھا کہ ''ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی...... اس دور کے پروفیسر شیرانی ہی ہیں۔''

علوم وفنون کی اس جامعیت کے باعث دیسائی صاحب بہت سی علمی مجالس اور اداروں کے عہدے دار یا رکن تھے۔ ان سب کی تفصیل مہیا کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ جن انجمنوں کے وہ

تاحیات رکن تھے ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

۱- ایران سوسائٹی، کلکتہ

۲- انڈین ہسٹری کانگریس

۳- اپی گرافیکل سوسائٹی آف انڈیا

۴- پلیس نیمز سوسائٹی آف انڈیا

۵- گجرات اتہاس پریشد، احمد آباد

۶- گجرات ودیا سبھا، احمد آباد

۷- سوراشٹرا اتہاس پریشد، جوناگڑھ

۸- ''انڈو ایرانیکا'' کے مراسلاتی مدیر

علاوہ ازیں متعدد سرکاری اور غیر سرکاری تنظیموں کی رکنیت بھی انہیں حاصل رہی۔ مثلاً:

۱- سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف آرکیالوجی

۲- پرچیز کمیٹی نیشنل آرکائیوز آف انڈیا

۳- آرٹس پرچیز کمیٹی نیشنل میوزیم آف انڈیا

۴- چیئرمین ایڈوائزری کمیٹی، انڈین نیشنل سائنس کانگریس

۵- ریجنل ریکارڈز کمیٹی، ڈیپارٹمنٹ آف آرکائیوز، گورنمنٹ آف گجرات

۶- مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکیڈمی

بہت سی قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں انہوں نے جز وقتی اور کل وقتی صدارتی فرائض انجام دیے۔ دیسائی صاحب کی کثیر علمی اور تحقیقی خدمات کا اعتراف بھی ہوا اور قدر شناسی کے طور پر ان کی خدمت میں متعدد اسناد اور تمغے پیش کیے گئے جن میں سے ایسے، جن کا مجھے علم ہے، یہ ہیں:

۱- تامرا پترا (اعزازی سند) منجانب اپی گرافیکل سوسائٹی آف انڈیا ۱۹۸۲ء

۲- فارسی زبان و ادب کی نمایاں خدمات پر صدر جمہوریہ ہند ایوارڈ ۱۹۸۳ء

۳- ڈاکٹر ایل پی ٹیسی ٹوری طلائی تمغا ۱۹۸۴ء

۴- سر جادوناتھ سرکار طلائی تمغا منجانب ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ۱۹۹۳ء

۵- سنسکار ایوارڈ، وڈودرہ (بڑودہ) ۱۹۹۳ء

۶- گوراو پرسکار منجانب گجرات اردو اکادمی ۱۹۹۵ء

۷- فخر الدین علی احمد پرائز منجانب غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی ۱۹۹۹ء

ڈاکٹر دیسائی نے متعدد توسیعی اور یادگار خطبات بھی دیے جیسے:

۱- ایس آر یونیورسٹی بڑودہ میں گجرات کے عربی فارسی کتبہ جات پر ۱۹۷۶ء

۲- مائتھک سوسائٹی آف انڈیا (بنگلور) میں ڈاکٹر نرسمہا چار توسیعی خطبہ ۱۹۷۹ء

۳- ایران سوسائٹی، کلکتہ میں ڈاکٹر ایم اسحاق یادگار خطبہ ۱۹۸۳ء

۴- خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری (پٹنہ) میں مولوی خدا بخش یادگار خطبہ ۱۹۸۵ء

۵- ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگلہ دیش کے زیر اہتمام منشی آفتاب الدین یادگار خطبہ ۱۹۹۳ء

دیسائی صاحب اپنے سرکاری اور نیم سرکاری فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں ہندوستان کے طول و عرض میں بکثرت سفر کرتے تھے۔ علاوہ ازیں ذاتی علمی جستجو کی خاطر یا اپنے ملک کی نمائندگی کے ضمن میں انہوں نے افغانستان، ایران، پاکستان، بنگلہ دیش، شام، روس، برطانیہ، (چند بار) اور امریکہ (کئی بار) کے دورے بھی کیے۔

ایسے فعال آدمی اگر نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ اتنی مصروفیات کے باوجود ان کا تحریری کام بھی بڑا وسیع ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مجھے حافظ محمود شیرانی پر حیرت ہوتی ہے کہ بیس بائیس برس کے قلیل عرصے میں وہ اتنا وافر اور معیاری علمی کام اپنی یادگار چھوڑ گئے۔ مجھے یہی تعجب دیسائی صاحب پر ہوتا ہے کہ گو انہیں تالیفی کام کے لیے چالیس بیالیس سال ملے تاہم ان کی بے پناہ غیر تالیفی مصروفیات کو دیکھتے ہوئے اتنے زیادہ تحریری کاموں کے لیے یہ مہلت بھی بہت کم معلوم ہوتی ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر یہاں مرحوم کی تحریری خدمات کا مختصر تعارف، تاریخی ترتیب کو مدنظر رکھتے ہوئے پیش کر دیا جائے:

۱- دیسائی صاحب کی منظر عام پر آنے والی پہلی کتاب ان کا ڈی لٹ کا مقالہ تھا جو بزبان انگریزی ''لائف اینڈ ورکس آف فیضی'' (احوال و آثار فیضی) کے عنوان سے ۱۹۶۱ء میں کلکتہ سے شائع ہوا۔

۲- مشہور ماہر آثار قدیمہ اے گھوش کی انگریزی تالیف ''انڈین آرکیالوجی'' کا اس کی

اہمیت کے پیش نظر دیسائی صاحب نے اردو ترجمہ کیا۔ یہ بھی ۱۹۶۱ء ہی میں لکھنؤ سے شائع کیا گیا۔

۳۔ ان کی ایک نہایت ہی قابل قدر تالیف ''موسکس آف انڈیا'' (ہندوستان کی مساجد) ہے جو پہلی بار ۱۹۶۶ء میں گورنمنٹ آف انڈیا (منسٹری آف انفرمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ، پبلی کیشنز ڈویژن) کی جانب سے چھاپی گئی۔ پھر ۱۹۹۰ء تک اس کے متعدد ایڈیشن نکلے۔ میرے پیش نظر ۱۹۹۰ء والی اشاعت ہے۔ ممکن ہے اس کے بعد بھی چھپی ہو۔ اس کی ابتدا میں انہوں نے اسلام میں مسجد کے مرتبے اور مقام کی نشاندہی کی ہے۔ پھر اس کی تعمیر کے آغاز وارتقا اور ہندوستان میں اوّلین مساجد کی تعمیر اور طرزِ تعمیر کو زیر بحث لائے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں مسلمانوں کی علاقائی حکومتوں مثلاً بنگال، گجرات، مالوہ، جونپور، دکن اور کشمیر کی اہم مساجد کا تذکرہ ہے۔ کتاب میں متعدد ممتاز اور منفرد مساجد کی تصاویر بھی شامل ہیں۔ اس کتاب کی اہمیت اور مقبولیت کے پیش نظر اس کے اردو اور ہندی توجمے بھی شائع ہوئے۔

۴۔ ''پبلشڈ مسلم انسکرپشنز آف راجستھان'' (راجستھان میں مسلمانوں کے تاحال شائع شدہ کتبے) حکومت راجستھان کے ڈائریکٹوریٹ آف آرکیالوجی اینڈ میوزیمز کی طرف سے ۱۹۷۱ء میں جے پور سے شائع کی گئی۔

۵۔ ''انڈو اسلامک آرکیٹیکچر'' (ہند اسلامی فن تعمیر) پبلی کیشنز ڈویژن (نئی دہلی) نے ۱۹۷۷ء اور پھر ۱۹۸۶ء میں چھاپی۔ اس کتاب کو اختر الواسع نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔

۶۔ ''سنٹرز آف اسلامک لرننگ ان انڈیا'' (ہندوستان میں اسلامی علوم کے مراکز) ایک اور وقیع کتاب ہے جو ۱۹۷۹ء میں دہلی سے اشاعت پذیر ہوئی۔ بہار برنی نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس کا ہندی ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔

۷۔ ''پرسوعریبک اپی گرافی آف گجرات'' (گجرات کے عربی وفارسی کتبات)۔ یہ کتاب مہاراجہ سیاجی راؤ یونیورسٹی، بڑودہ نے ۱۹۸۲ء میں شائع کی۔

۸۔ ۱۹۸۲ء ہی میں دیسائی صاحب کی ایک اور تالیف ''تاج محل'' جو ایچ اے کول کے

اشتراک سے لکھی گئی تھی، چھپی۔

۹- ''فتح پور سیکری...... اے سورس بک'' ۱۹۸۵ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے شہر کیمبرج (میساچوسٹس) سے شائع ہوئی۔ دیسائی صاحب اس کے شریک مؤلف تھے۔

۱۰- ''مسلم مونومینٹل کیلی گرافی آف انڈیا'' (مشترکہ تالیف)۔ یہ کتاب بھی ۱۹۸۵ء میں امریکہ کے شہر آیووا سے اشاعت یاب ہوئی۔

۱۱- ''دفتر ودیا''۔ دیسائی صاحب کی یہ تالیف ان کی مادری زبان گجراتی میں ہے اور اس کا موضوع علم الآثار قدیمہ ہے۔ یہ احمد آباد سے ۱۹۸۶ء میں چھپی تھی۔

۱۲- ''کورپس آف انسکرپشنز سٹورڈ ان دی میوزیم آف گجرات'' (گجرات کے عجائب گھر میں موجود کتبہ جات کی جامع فہرست)۔ شائع شدہ ۱۹۸۷ء

۱۳- ''تاج محل...... این الومینیٹڈ ٹومب'' (تاج محل...... ایک منقش مقبرہ)۔ یہ کتاب ڈاکٹر بیگلے کی رفاقت میں لکھی گئی اور ۱۹۸۹ء میں آیووا سٹی (امریکہ) اور نئی دہلی سے بیک وقت شائع ہوئی۔

۱۴- ''اے ٹوپوگرافیکل لسٹ آف عریبک، پرشین اینڈ اردو انسکرپشنز آف ساؤتھ انڈیا'' یہ وہی فہرست کتبات ہے جو دیسائی صاحب نے انڈین کونسل فار ہسٹاریکل ریسرچ کے سینئر فیلو کی حیثیت سے تیار کی تھی۔ یہ نئی دہلی سے ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی۔

۱۵- شاہجہان نامہ عنایت خاں کا انگریزی ترجمہ جو انہوں نے مسٹر بیگلے کے اشتراک سے کیا تھا۔ یہ واشنگٹن ڈی سی سے ۱۹۹۰ء میں شائع کیا گیا۔

۱۶- ''ملفوظ لٹریچر'' دراصل یہ دیسائی صاحب کا دیا ہوا مولوی خدا بخش (لائبریری) توسیعی خطبہ ہے۔ اس مختصر تالیف میں انہوں نے مولانا محمد بن ابی القاسم کے مرتبہ ملفوظات حضرت شیخ احمد کھٹو بعنوان ''مرقاۃ الوصول الی اللہ والرسول'' کے گہرے مطالعے سے تیرھویں چودھویں صدی عیسوی کے راجستھان اور گجرات کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی تاریخ کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اسے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے ۱۹۹۱ء میں چھاپا۔

۱۷- ''ذخیرۃ الخوانین'' مؤلفہ شیخ فرید بخاری کے حصہ اوّل کا انگریزی ترجمہ جو ۱۹۹۲ء میں

نئی دہلی سے شائع ہوا۔

۱۸- ''عریبک اینڈ پرشین مینسکرپٹس ان دی خدا بخش لائبریری'' جلد اوّل: تصحیحات و اضافہ مطبوعہ پٹنہ، ۱۹۹۵ء

۱۹- ''کیٹلاگ آف مسلم کوائنز سٹورڈ ان دی بڑودہ میوزیم اینڈ آرٹ گیلری'' یہ فہرست مسکوکات ۱۹۹۵ء میں زیرِ طبع تھی۔ لیکن یہ میری نظر سے نہیں گزری۔

۲۰- ''ہسٹری آف شاہجہاں'' (بہ اشتراک ڈاکٹر بیگلے) یہ کتاب بھی ۱۹۹۵ء کے لگ بھگ طباعت کے لیے تیار تھی لیکن اس میں تاخیر اس لیے ہو رہی تھی کہ بقول دیسائی صاحب مسٹر بیگلے اس کی انگریزی کو امریکی رنگ دینا چاہتے تھے۔

۲۱- ''عریبک، پرشین اینڈ اردو انسکرپشنز آف ویسٹ انڈیا...... اے ٹوپوگرافیکل لسٹ'' یہ کتاب جو ۱۹۹۹ء میں دہلی کے ایک نجی ادارے نے چھاپی دراصل انڈین کونسل فار ہسٹاریکل ریسرچ والے منصوبے کی دوسری کڑی تھی۔ مغربی ہند سے متعلق اس جلد میں گوا، گجرات، مہاراشٹر اور راجستھان کے ۲۱۶۸ کتبات کا تعارف شامل ہے۔ ان میں راجستھان سے تعلق رکھنے والے کتبوں کی تعداد ۵۴۰ کے قریب ہے۔

۲۲- احمد آباد کے مشہور کتب خانہ درگاہ پیر محمد شاہ کی فہرست مخطوطات کی چھ جلدیں بھی دیسائی صاحب کی نگرانی اور سرپرستی میں شائع ہوئیں۔

۲۳- ''کیٹلاگ آف دی سپیسیمینز آف اسلامک کیلی گرافی ان سارابھائی میوزیم، احمد آباد'' یہ فہرست نمونہ ہائے خطاطی احمد آباد سے شائع ہوئی لیکن سنہ اشاعت کا مجھے علم نہیں ہے۔

۲۴- ''کیٹلاگ آف پینٹنگز، البمز اینڈ السٹریٹڈ مینسکرپٹس ان دی رضا لائبریری رام پور'' اس کا مقام اشاعت نئی دہلی اور سنہ اشاعت ۲۰۰۱ء ہے۔

ان باقاعدہ تالیفات کے علاوہ دیسائی صاحب کا مقالات و مضامین کی شکل میں بکھرا ہوا علمی کام بھی بہت زیادہ ہے۔ ان کے ایک تعارف نامے کے مطابق، جو ۱۹۹۵ء میں تیار کیا گیا تھا، اس وقت تک ان کے مقالات کی تعداد ۲۵۰ سے اوپر تھی۔ ان کی کتاب ''مغربی ہند کے عربی، فارسی اور اردو کتبات'' (سال اشاعت ۱۹۹۹ء) کے فلیپ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال تک یہ

تعداد ۳۵۰ تک پہنچ چکی تھی۔ کیونکہ مضامین لکھنے کا سلسلہ اس کے بعد بھی کم از کم دو برس تک جاری رہا اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ مرحوم کے مقالات کی کل تعداد، جس میں ریڈیو سے نشر ہونے والے مضامین بھی شامل ہیں، چار سو سے کم نہ ہوگی۔ ان میں سے بیشتر مقالات ملک کے مختلف علمی مجلّات اور ادبی رسائل میں چھپے۔ دیسائی صاحب کے بیسیوں مقالے مختلف اہم علمی شخصیات کے اعزاز میں شائع ہونے والی تقریبی اور یادگار جلدوں کی زینت بنے۔ ان میں سے کئی نام ہمارے جانے پہچانے ہیں مثلاً:

ڈاکٹر غلام یزدانی (حیدرآباد ۱۹۶۶ء)، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (نئی دہلی، ۱۹۶۸ء)، پروفیسر سید حسن عسکری (پٹنہ، ۱۹۶۸ء)، مالک رام جی (نئی دہلی، ۱۹۷۱ء)، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (حیدرآباد، ۱۹۷۵ء)، حکیم عبدالحمید (نئی دہلی، ۱۹۸۱ء)، پروفیسر محمد حبیب (علی گڑھ، ۱۹۹۵ء)، ڈاکٹر فخر الدین علی احمد (۱۹۹۵ء میں زیر طبع)۔

متعدد کتب حوالہ میں بھی دیسائی صاحب کے مختلف موضوعات پر مضامین شامل کیے گئے۔ یہاں ایسی کچھ تالیفات کے نام درج کرنے پر اکتفا کرتا ہوں:

- ''گزیٹیئر آف انڈیا'' (جلد دوم وسوم)، نئی دہلی
- ''ہسٹری آف میڈی ایول دکن'' (جلد دوم)، حیدرآباد، ۱۹۷۴ء
- ''گجرات نوراجا کیہ انے سنسکریتک اتہاس'' (گجرات کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ۔ بزبان گجراتی)، جلد چہارم-۱۹۷۶ء، جلد پنجم-۱۹۷۷ء، جلد ششم-۱۹۷۹ء، احمد آباد
- ''گجراتی وشواکوشا'' (گجرات انسائیکلوپیڈیا۔ بزبان گجراتی)، احمد آباد
- ''اردو انسائیکلوپیڈیا''، حیدرآباد
- ''ڈریویڈین انسائیکلوپیڈیا''، ٹریونڈرم
- کنّاڈا انسائیکلوپیڈیا''، میسور
- ''فائن آرٹس والیوم آف تیلیگو بھاشا''، حیدرآباد
- ''ڈکشنری آف آرٹ''، لندن
- ''انسائیکلوپیڈیا پرسکا''، نیویارک
- ''کلچرل ہیریٹیج آف انڈیا'' (جلد ہفتم)، کلکتہ

دیسائی صاحب کے کل مقالات کی تقریباً اسی فیصد تعداد انگریزی میں لکھی گئی ہے۔ کم وبیش چالیس مضامین اردو زبان میں ہیں اور کوئی تیس کے قریب گجراتی میں ہوں گے۔ چند مضامین ہندی میں بھی ملتے ہیں۔ فارسی میں بعض مقالات بتائے جاتے ہیں لیکن مجھے ان میں سے کوئی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

موضوعات کے اعتبار سے ان مقالات کو آٹھ خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سب سے بڑا موضوع کتبہ شناسی ہے جس پر تحریر کردہ مقالات کی تعداد ڈیڑھ سو سے کیا کم ہوگی۔ ان میں سے نصف کے قریب ''اپی گرافیکل جنرل آف دی آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا'' میں شائع ہوئے۔ دیسائی صاحب ایک طویل عرصے تک ''اپی گرافیکا انڈیکا (عربک اینڈ پرشین)'' کے مدیر رہے اور ان کے زیر ادارت اس مجلّے کے اکیس ضخیم شمارے نکلے۔ کتبہ شناسی سے متعلق باقی مضامین مختلف کتابوں، جرائد اور رسائل میں چھپے۔

دوسرا اہم موضوع آرٹ اینڈ آرکیٹیکچر ہے جس پر ساٹھ کے قریب مقالات ان کی یادگار ہیں۔ تیسرا موضوع تاریخ (تعداد مقالات تقریباً پچاس) اور چوتھا فارسی زبان وادب (کم وبیش چالیس مضامین) کہا جا سکتا ہے۔ علم مسکوکات اور گجراتی اردو پر بھی متعدد مضامین موجود ہیں۔ بیس کے قریب متفرق مضامین ہیں۔ آٹھواں اور آخری موضوع علمی کتابوں پر تبصرے کا ہے۔

اگر کسی صاحب علم کو توفیق ہو اور وہ ڈاکٹر دیسائی مرحوم کے تمام مقالات کو جمع کر کے اشاعت کی غرض سے مرتب کرے تو یہ کئی ضخیم جلدوں میں سمائیں گے۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ہند اسلامی تاریخ وتہذیب اور بالخصوص کتبہ شناسی پر وہ مرحوم جیسا اور جتنا کام اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔

ان کے محاسن اخلاق کے بارے میں سب سے اہم شہادت پروفیسر سید عبدالرحیم کی ہے جنھیں چالیس برس تک دیسائی صاحب کی شاگردی اور رفاقت کا شرف حاصل رہا۔ وہ اپنے مضمون ''ڈاکٹر ضیاالدین دیسائی'' (مطبوعہ ''معارف'' بابت جون ۲۰۰۲ء) میں لکھتے ہیں:

''ایمانداری، خلوص، خوف خدا، سچائی، پاس نفس، بے نفسی، پاکبازی، غیرت اسلامی، بے خوفی، حق گوئی، محنت، لگن اور نہ جانے کتنے صفاتی اور کمالاتی جواہر ڈاکٹر صاحب کی سیرت میں تابندہ نظر آتے تھے۔ صحبت ناجنس سے گریز، علمی اور تحقیقی کاموں میں انہماک، پے در پے اسفار اور کم

آمیزی نے آپ کو بالکل یکسو کر کے رکھا تھا۔ وہ زندگی کے ایک ایک لمحے کی قدر و قیمت جانتے تھے۔ ان کے نزدیک کام کا انعام صرف کام ہے۔ قدر دانی، صلہ و ستائش محض اضافی چیزیں ہیں۔"

آخر میں دیسائی صاحب کی رحلت پر موزوں کردہ ایک قطعہ تاریخ وفات درج کیا جاتا ہے:

لو ضیاالدین دیسائی ہوئے واصل بحق
کیا کہوں یہ سن کے کیسا میرے دل کو ہے قلق
غفراللہ تعالٰی کے سوا اب کیا کہیں
فرط غم سے صاحبان علم کا سینہ ہے شق
احمد آباد آج تیرے بام و در تاریک ہیں
اب ضیائے علم و دیں سے ہے تہی تیرا افق
دودِ دل سے دن بھی تیرا شام کی مانند ہے
جوئے خون چشم سے گلزار ہے تیری شفق
اب کہاں سے لاؤں گا ایسا محب بے ریا
اب کہاں سے پاؤں گا ایسا عزیز مستحق
"آہ" کھینچی "ہائے" نکلی تب ہوا رحلت کا سنہ
۶ + ۱۶
"جا بیابد فی الجوار رحمت رب الفلق"
۱۴۴۵-۲۲=۱۴۲۳ھ

حواشی

۱۔ ''اگر ہم چل بسیں تو ہمیں معذور سمجھنا (کہ یہاں) کتنی ہی آرزوئیں خاک میں مل جاتی ہیں۔''

۲۔ پروفیسر محمد ابراہیم ڈار مرحوم کا تعلق لاہور وامرتسر کے ایک کشمیری خاندان سے تھا۔ ۴ اگست ۱۹۰۴ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ میٹرک اسلامیہ ہائی سکول، امرتسر اور بی اے خالصہ کالج، امرتسر سے کیا۔ ۱۹۲۷ء میں پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج سے ایم اے (عربی) میں کامیابی حاصل کی۔ لاہور میں مولوی محمد شفیع اور پروفیسر حافظ محمود شیرانی سے خصوصی استفادہ کا موقع ملا۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۱ء تک بطور میکلوڈ ریسرچ سکالر تحقیق میں مصروف رہے۔ ۱۹۳۱ء میں بطور استاد ادبیات فارسی، گجرات کالج احمد آباد میں تقرر ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں اسماعیل یوسف کالج، بمبئی تبادلہ ہو گیا۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۸ء تک پھر احمد آباد رہے اور جون ۱۹۴۸ء میں بمبئی واپس آئے۔ ۱۷ مئی ۱۹۵۳ء کو بمبئی ہی میں وفات پائی اور باندرہ سٹیشن کے گورستان میں مدفون ہوئے۔ ان کے چھوٹے بھائی مولوی عبدالغنی ڈار کا شمار اہم قوم پرست رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ وہ تقسیم ملک کے بعد مشرقی پنجاب اسمبلی کے رکن رہے۔

ابراہیم صاحب کے ایک بڑے بھائی محمد یامین ڈار کا انگریز حکومت کی نظر بندی کے دوران میں ۱۲ اپریل ۱۹۴۵ء کو انتقال ہوا۔ ان کی صاحبزادی مس اقبال ڈار صاحبہ لاہور کالج برائے خواتین کی پرنسپل تھیں۔

ابراہیم ڈار صاحب اپنے استاد پروفیسر شیرانی کے شیدائی تھے اور فن تحقیق میں ان کے پیروکار بھی۔ پروفیسر ظہیر الدین مدنی کا کہنا ہے: ''تحقیق وتنقید کے میدان میں ڈار صاحب نے اپنے استاد حافظ محمود شیرانی کے نقش قدم پر چلنے کی کامیاب کوشش کی ہے'' (''مرحوم ڈار صاحب'' مشمولہ مضامین ڈار)۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، جو خود بھی شیرانی صاحب کے عزیز شاگرد تھے، ''مضامین ڈار'' کے پیش لفظ میں اعتراف کرتے ہیں: ''ابراہیم تحقیق وتنقید میں شیرانی سکول کے ممتاز ترین فرد تھے۔'' اس کا ثبوت ڈار صاحب کے مقالات سے بخوبی فراہم ہوتا ہے۔ اسی مناسبت سے دیسائی صاحب نے ان پر جو مضمون لکھا تھا اس کا عنوان ''دبستان شیرانی کا ایک محقق'' تجویز کیا تھا۔ یہ اردو مضمون رسالہ ''سابرنامہ'' بابت سال ۱۹۹۰ء میں چھپا تھا۔

۳۔ ''معارف'' کے شمارہ جون ۲۰۰۲ء میں پروفیسر سید عبدالرحیم کے مضمون سے یہ انکشاف ہوا کہ دیسائی صاحب نے حج بھی کیا ہوا تھا۔ سید صاحب لکھتے ہیں: ''دیسائی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے حج کی سعادت بھی نصیب فرمائی تھی۔ نماز کے بہت پابند تھے۔ بیماری کی حالت میں بھی بیٹھ کر اور اشاروں سے نماز ادا کرتے۔''

۴۔ ملاحظہ ہو ''مکاتیب حافظ محمود شیرانی''، صفحہ ۳۰۲-۲۹۸، لاہور ۱۹۸۱ء

۵۔ یہ مسجد بعہد سلطان ناصر الدین محمود (۶۶۴-۶۴۴ھ) خلف سلطان شمس الدین التمش سنہ ۶۵۵ھ میں تعمیر ہوئی تھی۔ ان دنوں ناگور کا علاقہ مستقبل کے سلطان غیاث الدین بلبن کی جاگیر تھا۔ شکستہ ہونے کے سبب اس عربی کتبے کے کچھ الفاظ ضائع ہو چکے تھے لیکن سنہ تعمیر صاف پڑھا جاتا ہے۔ مایقرا الفاظ یہ ہیں:

''ھذا عمارۃ المسجد...... ابن السلطان ناصر امیر المومنین خلد اللہ ملکہ......
العبد الضعیف ابی بکر الشامی الغرۃ من ذی الحجۃ سنہ خمس وخمسین وستمایہ۔''

۶۔ ڈھانی شیرانیاں حال شیرانی آباد۔

۷۔ حافظ محمد صدیق بڑی کھاٹو کے ایک دردمند اور درویش منش بزرگ تھے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی مرحوم نے اپنے مضمون ''کھٹو...... راجستھان کی ایک قدیم بستی'' (سہ ماہی ''اردو''، بابت جنوری ۱۹۶۸ء) میں ان کا ذکر کیا ہے۔ میری ۱۹۶۴ء میں ان سے

ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے کچھ عرصے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ ڈاکٹر دیسائی نے ان کے مقبوضہ جس کتبے کا ذکر کیا ہے وہ الگ تھا اور ایک مسجد کی محراب سے تعلق رکھتا تھا جو سلطان علاء الدین خلجی کے دور میں تعمیر ہوئی تھی۔

۸- بالآخر یہ کتبہ مولانا ابوالکلام آزاد عربک پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ راجستھان ٹونک کے مجموعہ نوادرات میں منتقل کر دیا گیا۔

۹- بہرحال اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ امانت دار شریف آدمی تھے۔ ایک بار اس خیال سے کہ کہیں زمین میں دفن ہونے کے باعث یہ بندوق خراب نہ ہو جائے انھوں نے کسی آثار عتیقہ کے تاجر سے اس کا ذکر کیا۔ اس نے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اسے بتایا گیا کہ شہر میں نہیں ہے، فارم والے مکان میں دفن ہے۔ وہ شاطر آدمی تھا۔ اسے اتنا اشارہ کافی ہوا۔ وہ دیہی مکان اکثر مقفل رہتا تھا۔ اس شخص نے کوئی موقع تاڑ کر بندوق نکال لی۔ پھر خدا جانے اس کا کیا حشر ہوا۔

۱۰- بعد میں یہ تقریر عربک پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ جرنل (جلد۴، بابت ۸۵-۱۹۸۴ء) میں شائع ہوئی۔

۱۱- ''ڈاکٹر ضیاالدین دیسائی'' از پروفیسر سید عبدالرحیم مطبوعہ ''معارف''، بابت جون ۲۰۰۲ء

۱۲- مولانا عمران خاں، مولانا قاضی عرفان خاں مرحوم (ناظم محکمہ شرع شریف، ٹونک) کے صاحبزادے اور قاضی شہر کے منصب پر فائز تھے۔ گریجویٹ تھے لیکن عربی، علوم اسلامیہ اور فارسی کا علم بڑا ٹھوس تھا۔ ادارہ تحقیقات میں تحقیق و تدوین کا کام کرتے تھے۔ ادارے کے مخطوطات کی فہرست سازی کا کام بھی انجام دیا۔ بڑے ہمدرد اور مخلص انسان تھے۔ شیرانی صاحب کے مزار کی تعمیر کا کام بھی انہی کی نگرانی میں مکمل ہوا تھا۔ ۱۹۸۶ء میں اعزہ سے ملنے پاکستان آئے ہوئے تھے کہ ۱۳ فروری کو حیدرآباد (سندھ) میں دل کے دورے سے وفات پائی اور ٹنڈو یوسف کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

۱۳- سرکھیج غالباً ''سرخیز'' کی مقامی صورت ہے۔ یہ قصبہ مغربی سلسلے کے معروف بزرگ

حضرت شیخ احمد کھٹو کے مزار مبارک کی بنا پر مشہور خلائق ہے۔

۱۴- پورا نام عبدالعزیز عبداللہ میاں منشی۔ عبداللہ میاں ان کے والد کا نام تھا۔

۱۵- اس موضوع پر چغتائی صاحب کے کاموں میں

۱- کھٹو......راجستھان کی ایک قدیم بستی۔

۲- قدیم تاریخی بستی......بیانہ

۳- Nagaur...... A Forgotten Kingdom اور

۴- Some inscriptions from Didwana, Jalore, Ladnun and Nagaur قابل ذکر ہیں۔

۱۶- یہ کتاب "Published Muslim Inscriptions of Rajasthan" اس مکتوب سے پندرہ نہیں بلکہ انیس سال پہلے ۱۹۷۱ء میں جے پور سے شائع ہوئی تھی۔

۱۷- خواجہ صاحب نے ایک بار انہیں دو مخطوطوں، جن میں ایک حضرت شاہ عالم گجراتی کے حالات پر مبنی ضخیم تالیف ''روضات شاہی'' تھی (جس کا منحصر بفرد مخطوطہ ڈاکٹر معین الحق مرحوم کے پاس تھا) کے تقریباً آٹھ سو صفحات کے فوٹوسٹیٹ بنوا کر ارسال کیے تھے۔

۱۸- اس خط پر کوئی تاریخ درج نہیں اور ڈاک خانے کی مہریں مبہم ہیں۔

۱۹- قاضی محمود دریائی بیرپوری کے دیوان کا واحد معلوم نسخہ درگاہ پیر محمد شاہ لائبریری احمد آباد میں تھا۔ پروفیسر ابراہیم ڈار نے شیرانی صاحب کی فرمائش پر اس کی نقل تیار کروا کر روانہ کی تھی۔ بعد میں اصل مخطوطہ ضائع ہو گیا، اس لیے دیسائی صاحب کو لاہور والی نقل کی نقل درکار تھی۔

۲۰- یہ امریکن دوست تھے پروفیسر ڈاکٹر بیگلے (W.E. Begley) جو ۱۹۸۰ء کے منتصف دوم میں امریکن انسٹی ٹیوٹ برائے پاکستانی مطالعات لاہور میں ریسرچ فیلو کے طور پر کام کرتے رہے تھے۔ بعد میں یہ امریکن انسٹی ٹیوٹ فار انڈین سٹڈیز (دہلی) سے وابستہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر دیسائی کے اشتراک سے شاہ جہاں اور اس کے عہد سے متعلق خاصا کام کیا۔ ان کاموں کا تعارف آگے دیسائی صاحب کی تالیفات کے تذکرے میں دیکھا جاسکتا ہے۔

۲۱- دیسائی صاحب واقعی فنافی العلم تھے۔ ان کے نزدیک زندگی اور علمی مصروفیت مترادف حیثیت رکھتی تھیں۔ ان کے اس شغف کے بارے میں ان کے پڑوسی پروفیسر محبوب حسین عباسی کا بیان ہے: ''میں دیسائی صاحب سے آخری بار ۲۱ تاریخ کی صبح یعنی وفات سے صرف تین روز قبل ملا تو آکسیجن لگا ہوا تھا۔ پھر بھی اچھی طرح بات چیت کی۔ کچھ وقت پہلے امریکہ کے پروفیسر ڈاکٹر جان سیلر (John Seyller) کے ایک مقالے پر نوٹس لکھے تھے، اس کی کاپی مجھے دی اور امریکہ روانہ کرنے کے لیے کہا۔ ان کا پتا خود انہوں نے ڈائری سے تلاش کر کے مجھے لکھوایا......'' (''ڈاکٹر ضیاالدین دیسائی'' از پروفیسر سید عبدالرحیم، مطبوعہ ''معارف'' جون ۲۰۰۲ء)

۲۲- آرٹ پیپر پر یہ دیدہ زیب کتاب شیخ راشد صاحب نے ۱۹۹۸ء میں ادارہ علم و فن، کراچی کے زیر اہتمام شائع کی۔ اس میں عالم اسلام سے تعلق رکھنے والے دور جدید کے بیس بڑے خطاطوں کا تذکرہ اور ان کی خطاطی کے نمونے شامل ہیں۔

۲۳- ملاحظہ ہو ''پاک و ہند میں اسلامی خطاطی'' ، لاہور، ۱۹۷۶ء

۲۴- دیکھیے ''فہرست مخطوطات شیرانی''، (جلد دوم) صفحہ ۳۳۴، لاہور، جون ۱۹۶۹ء

۲۵- ''مرض عشق کا معالج اس مریض سے مایوس ہو جاتا ہے جو اس لاعلاج بیماری کے ہوتے ہوئے رات کو چین کی نیند سوتا رہے۔''

۲۶- چنانچہ میں نے ''مکاتیب حافظ محمود شیرانی'' (صفحہ ۲۹۸، لاہور، ۱۹۸۱ء) میں ضیاالدین احمد ہی درج کیا تھا اور میں ہی کیا بیشتر لوگ یہی سمجھتے تھے۔ مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن نے اپنی تالیف ''پیر حسام الدین راشدی اور ان کے علمی کارنامے'' (صفحہ ۳۵، کراچی، ۱۹۸۴ء) میں بھی ضیاالدین احمد لکھا ہے۔

کچھ ایسی ہی غلط فہمی ان کی گوت دیسائی کے بارے میں تھی۔ ہمارے ہاں جو عہدہ نمبردار کہلاتا ہے وہ ماضی میں برعظیم کے مختلف علاقوں میں متفرق ناموں سے موسوم رہا ہے مثلاً چودھری اور مکھیا (شمالی ہند)، پٹیل (وسط ہند)، دیس مکھ (دکن) اور دیسائی (گجرات کاٹھیاواڑ)۔ مؤخرالذکر بعد میں ایک گوت کا نام بھی ہو گیا۔ انگریزی زبان کے زیر اثر ''دیسائی'' نے ''ڈیسائی'' کی صورت اختیار کر لی چنانچہ ٹونک کے سرکاری

ہسپتال کے سرجن جو مذہباً عیسائی تھے ولیم ڈیسائی کہلاتے تھے۔ یہی حال بھارت کے وزیراعظم مرارجی ڈیسائی کا تھا۔ پاک و ہند کے علمی حلقوں میں ڈاکٹر ضیاالدین بھی عموماً ''ڈیسائی'' کے نام سے متعارف تھے۔ میں اپنے عریضوں میں ان کا پتا انگریزی میں لکھتا تھا لہٰذا کبھی تصحیح کی نوبت نہیں آئی۔ البتہ جب ڈاکٹر نوشاہی صاحب نے ان کے نام اپنے خطوط کے القاب میں ''ڈیسائی'' لکھا تو ایک جوابی مکتوب (نوشتہ یکم نومبر ۱۹۹۶ء) کے اختتام پر موصوف نے بدیں الفاظ صراحت کی: ''مخلص ضیاالدین دیسائی (نہ ڈیسائی)'' (ص ۱۵۶، ارمغان ہندوستان، از عارف نوشاہی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء) اس تنبیہ کے مطابق میں نے اپنے مضمون کی موجودہ اشاعت میں اصلاح کردی ہے۔

بن ٹھن کے کہاں چلے؟

مُشفِق خواجہ (۱۹۳۵ء - ۲۰۰۵ء)

یادش بخیر مُشفِق خواجہ ہماری علمی و ادبی دنیا میں ایک بلند مقام پر فائز ہیں۔ اُن کی شخصیت بڑی پہلودار تھی۔ محقق، ناقد، شاعر، ادیب، مزاح نگار، غرض کسی خانے میں بند نہیں تھے۔ ''ہر ہفت'' کی اصطلاح ان پر صادق آتی ہے۔ انہوں نے بڑا وقیع اور معیاری کام اپنی یادگار چھوڑا ہے اور اس سے کئی گنا زیادہ تحریری کام غیر مطبوعہ یا نامکمل حالت میں چھوڑ گئے ہیں۔ یہی نہیں وہ نہایت مہذب، نفیس طبع، بردبار، مرنجاں مرنج اور بڑے منضبط ذہن کے مالک تھے۔ کسی کی دل آزاری گوارا نہ کرتے تھے۔ اگر کوئی اُن کے بارے میں نامناسب بات کہتا یا الزام تراشی کرتا تو طرح دے جاتے۔ کبھی مجبوراً کچھ کہنا بھی پڑتا تو ردِ جواب میں حسنِ خطاب سے کام لیتے اور اصول و آداب کا خیال رکھتے تھے۔ ان کی خوش باشی اور شگفتگی بھی درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی تھی جس نے ان کی شخصیت کو چار چاند لگا دیے تھے۔

میرے اور خواجہ صاحب کے خاندانوں میں پرانے تعلقات تھے۔ ان کے والد خواجہ عبدالوحید کا لاہور میں میرے دادا جان سے میل جول تھا۔ ان کے تایا خواجہ عبدالمجید (صاحبِ جامع اللغات) کے بیٹے خواجہ محمود اور داماد میاں محمد حسن سے میرے والد (اختر شیرانی) کی گاڑھی چھنتی تھی۔ خواجہ محمود اور اختر صاحب نے ''جامع اللغات'' کے کام میں ہاتھ بٹایا تھا۔ میاں محمد حسن اور محمد عمر فاروق نے اختر صاحب کے ساتھ مل کر ۳۵-۱۹۳۴ء میں لاہور سے ایک رسالہ ''اختر'' نکالا تھا۔ اس کے سرورق پر نگارندۂ خصوصی کی حیثیت سے اختر صاحب کا نام تھا۔ اس کے چند

شمارے ہی شائع ہو سکے تھے۔

مشفق خواجہ صاحب اور میں ہم عمر تھے۔ دونوں کی پیدائش ۱۹۳۵ء کی تھی۔ میٹرک دونوں نے ۱۹۵۲ء میں کیا اور ایم اے ۱۹۵۸ء میں۔ اتفاق سے دونوں کی شادیاں بھی ۱۹۶۴ء میں ہوئیں۔ فرق یہ تھا کہ وہ لڑکپن میں لاہور سے کراچی چلے گئے اور میں سندھ سے پنجاب آ گیا تھا، گویا:

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق
اُو بہ صحرا رفت و ما در کوچہ ہا رُسوا شدیم[1]

خواجہ صاحب کی مقبولیت کا راز صاحبانِ علم کی خدمت، طالبانِ علم کی معاونت اور تشنگانِ ادب کی رہنمائی میں پنہاں ہے۔ اس ضمن میں وہ درمے، قدمے، سخنے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے تھے۔ اس اعتبار سے ان کی حیثیت ایک مینارۂ نور کی سی تھی جو بھٹکے ہوئے جہازوں اور کشتیوں کے لیے نشانِ منزل ہوتا ہے۔ وہ ضروری حوالوں کی نشاندہی کرنے، تلازمے فراہم کرنے، متعلقہ کتب و رسائل کے عکس تیار کھوانے اور ضرورت مندوں کو روانہ کرنے بلکہ اصل کتابیں اور دستاویزات ارسال کرنے پر ہمہ وقت مستعد رہتے تھے۔ مشفق محض ان کا نام ہی نہ تھا عملاً بھی وہ سراپا شفقت تھے۔ صوفیا کے مختلف مدارج میں ایک مرتبہ قطب کا ہوتا ہے۔ اگر علمی دنیا میں اس قسم کے مراتب کا رواج ہوتا تو یقیناً خواجہ صاحب کراچی کے قطب کہلانے کے مستحق تھے۔ شاید اسی لیے ''قطب از جا نمی جنبد'' کے مصداق وہ اشد ضرورت کے بغیر کراچی سے نہیں نکلتے تھے بلکہ شہر میں ہونے والی ادبی اور شعری تقریبات سے بھی محترز رہتے تھے۔ ویسے بڑے باخبر آدمی تھے۔ پاکستان، ہندوستان اور دوسرے ممالک کے علمی مراکز میں اردو زبان و ادب سے متعلق جو کام ہو رہا ہوتا تھا، ان کے علم میں رہتا تھا۔ اس غرض سے خط کتابت کثرت سے کرتے اور فون پر رابطے بحال رکھتے تھے۔ انھی خوبیوں کے باعث ان کی وفات کا صدمہ ہر اس شخص کا ذاتی صدمہ بن گیا جو زندگی میں کسی موقع پر ان سے تعلق میں آیا۔ ان کی فیض رسانی اور ہر دلعزیزی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ اب تک مختلف مؤلفین کی کم و بیش ایک سو کتابوں کا انتساب ان کے نام کیا جا چکا ہے۔

علمی سرپرستی کے میدان میں خواجہ صاحب کا سب سے کارگر ہتھیار نو واردانِ بساطِ علم کی حوصلہ افزائی تھا۔ باز سے شکار کھیلنے والوں کا قاعدہ ہے کہ جب بھی ان کا پالتو باز کوئی پرندہ شکار کرتا ہے، وہ پرندے کو ذبح کرتے ہی اس کا دل اور کلیجی نکال کر بطور انعام باز کو کھلا دیتے ہیں۔ اس عمل سے باز کا دھیان شکار پر لگا رہتا ہے۔ خواجہ صاحب مبتدیوں کے کام کی تعریف سے یہی مقصد حاصل کرتے تھے۔ انہوں نے بلا مبالغہ بیسیوں لوگوں کو قلم فرسائی کی دھت لگا دی۔ ان میں چند ایسے بھی تھے جو خواجہ صاحب کی ہمت افزائی کی غرض سے کی جانے والی توصیف کو سندِ کمال سمجھتے ہوئے پٹڑی سے اتر گئے یا خامی میں پختہ ہو گئے، تاہم اس میں خواجہ صاحب کا کوئی قصور نہ تھا بلکہ خود ان لوگوں کی تنگ ظرفی ان کے بھٹکنے کا سبب بنی۔ اسی تناظر میں ڈاکٹر وحید قریشی صاحب خواجہ صاحب کو چھیڑنے کے لیے کہتے تھے کہ آپ ناقصوں کے پیرِ کامل ہیں۔

پیر حسام الدین راشدی کی وفات پر خواجہ صاحب نے ایک خط میں لکھا تھا:

''یہ سانحہ میرے لیے ذاتی نوعیت کا ہے۔ مرحوم سے ۲۵ برس کی نیازمندی کا رشتہ تھا۔ اب کراچی میرے لیے سنسان ہو گئی ہے۔''

اے مشفق و مہربان! میرے آپ سے مخلصانہ تعلقات تو ۴۰-۴۲ برس پر محیط تھے۔ سچ پوچھیے تو آپ کے جانے سے میرے لیے بھی آپ کا شہر ویران ہو گیا ہے:

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تُو نے آئینہ تمثال دار تھا

خواجہ صاحب کا نام میں نے پہلی بار ۱۹۵۶ء میں سنا جب میں بی اے کا امتحان دینے کے بعد کوئٹہ میں چچا جمیل الرحمٰن شیرانی کے ہاں مقیم تھا جو وہاں محکمہ جنگلات میں ایک ذمہ دار عہدے پر فائز تھے۔ ایک روز پچھلے پہر دفتر سے آنے پر انہوں نے بتایا کہ مولوی عبدالحق کراچی سے آئے ہوئے ہیں اور ان کے ساتھ خواجہ عبدالوحید کے صاحبزادے بھی ہیں۔ یہ لوگ کوئٹہ میں ٹھہرنے کے بجائے زیارت چلے گئے جہاں ان کے قیام کا بندوبست محکمہ جنگلات کے ریسٹ ہاؤس میں کر دیا گیا تھا۔ ملاقات کی سبیل نہ نکل سکی کیونکہ مولوی صاحب چند روز زیارت میں گزارنے کے بعد واپسی پر کوئٹہ سے سیدھے کراچی روانہ ہو گئے۔

کوئی سات برس بعد میں نے ''مکاتیبِ حافظ محمود شیرانی'' کی جمع آوری کے سلسلے میں خواجہ صاحب کو خط لکھا اور مولوی صاحب کے نام حافظ صاحب کے خطوط فراہم کرنے کی درخواست کی۔ اس کا جواب انہوں نے ۲۳ مارچ ۱۹۶۳ء کو گورنمنٹ کالج، مظفر گڑھ کے پتے پر بھیجا۔ مطلوبہ خطوط تو نہ مل سکے کیونکہ وہ دہلی میں انجمن کا دفتر نذرِ آتش ہونے پر ضائع ہو چکے تھے، البتہ انہوں نے مکاتیبِ بابائے اردو بنام حافظ محمود شیرانی کی فرمائش کی اور ساتھ ہی لکھا:

''آپ کبھی کراچی تشریف لائیں تو مجھ سے ضرور ملیے گا۔ آپ سے مل کر مجھے بے انتہا خوشی ہوگی۔''

اس کے بعد ان سے اِکا دُکا خطوط کا تبادلہ ہوتا رہا۔ ۱۹۶۶ء کے اوائل میں مقالاتِ حافظ محمود شیرانی کی پہلی جلد شائع ہوئی تو میں نے اس کا ایک نسخہ خواجہ صاحب کو بھیجا۔ رسیدی خط میں ۲۶ مئی ۱۹۶۶ء کو لکھتے ہیں:

''ابھی ابھی مقالات حافظ محمود شیرانی کا وہ ابتدائی حصہ، جس میں آپ نے حافظ صاحب مرحوم کے حالات لکھے ہیں، ختم کر کے بیٹھا ہوں۔ یہ سو صفحے ایک ہی نشست میں ختم کیے۔ آپ نے جس محبت اور خلوص سے یہ حالات لکھے ہیں اس کی داد دیتا ہوں۔ آپ میں ایک اچھے سوانح نگار کی تمام صلاحیتیں ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر آپ حافظ صاحب کی مفصّل سوانح عمری مرتب کر دیں۔ اس طرح اردو میں ایک معیاری سوانح عمری کا اضافہ ہو جائے گا۔''

اسی مکتوب میں انہوں نے ایک مضمون کی فرمائش بدیں الفاظ کی:

''اگست میں 'قومی زبان' کا 'عبدالحق نمبر' شائع ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کے لیے حافظ صاحب اور مولوی صاحب کے تعلقات پر ایک مضمون لکھ دیں...... اس مضمون میں وہ تمام خطوط بھی شامل کر دیجیے جو مولوی صاحب نے حافظ صاحب کے نام لکھے۔''

چنانچہ میں نے ''بزمِ عبدالحق'' کے ذیل میں ''حافظ محمود شیرانی'' کے عنوان سے مضمون لکھا[۲]۔ اتفاق سے اگست کے وسط میں کسی تقریب سے مجھے کراچی جانا تھا۔ میں نے مضمون خواجہ صاحب کو روانہ کرتے ہوئے اپنی کراچی آمد سے بھی مطلع کیا۔ انہیں مضمون پسند آ گیا۔ رسید میں لکھتے ہیں:

''یہ مضمون مجھے اس حد تک پسند آیا کہ 'قومی زبان' کے لیے کتابت کرانے کے بعد مسودہ

'امروز' لاہور کو بھیج دیا۔ ۱۶ اگست کو یہ مضمون 'امروز' میں بھی چھپے گا۔ آپ کراچی آیئے اور ضرور آیئے۔ میں چشم براہ رہوں گا۔" (۷ اگست ۱۹۶۶ء)

کراچی کے انگریزی ہفت روزہ "السٹریٹڈ ویکلی" میں نئے شادی شدہ جوڑوں کی تصاویر شائع ہوتی تھیں۔ اس میں خواجہ صاحب کی شادی کا فوٹو بھی چھپا تھا جو میری نظر سے گزرا تھا۔ بہرحال کراچی جا کر اگلے ہی روز میں خواجہ صاحب سے ملنے کی خاطر انجمن کے دفتر میں برپا ہونے والی بابائے اردو کی تقریب یوم وفات میں پہنچ گیا۔ اچھی رونق تھی۔ میرا کوئی واقف تو تھا نہیں، لہٰذا خاموشی سے ایک عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس تصویر کی مدد سے خواجہ صاحب کو پہچان لیا جو سٹیج پر مصروف کار تھے۔ مضامین پڑھے جا رہے تھے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم کے صاحبزادے زہیر صدیقیؒ صاحب کا مضمون تو کمال کا تھا۔ زبان، بیان، لہجہ غرض ہر چیز قابل داد تھی۔ اس کا آغاز اس فقرے سے ہوتا تھا: "بابائے اردو کی اور میری دوستی، راجہ بھوج اور گنگوا تیلی کی دوستی تھی......"[۵]

تقریب کے اختتام پر میں نے احتیاطاً ایک صاحب سے خواجہ صاحب کے بارے میں دریافت کیا جس سے میرے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ اس وقت وہ مہمانوں کو رخصت کر رہے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا اور اپنا تعارف کرایا۔ سنتے ہی لپٹ گئے۔ میں ان کا محبت بھرا انداز دیکھ کر ہمیشہ کے لیے اسیر ہو گیا۔ پہلا سوال انہوں نے یہ کیا: "آپ نے مجھے کیسے پہچانا؟" میں نے ان کی شادی والی تصویر کا ذکر کیا۔ کہنے لگے: "اس کا مطلب ہے کہ آپ لوگوں کی تصاویر بڑے غور سے دیکھتے ہیں؟" میں نے کہا: "یہ بات نہیں۔ دراصل وہ تصویر آپ کی تھی اس لیے دلچسپی سے دیکھی تھی۔" سچی بات ہے کہ خواجہ صاحب اپنے فوٹو سے کہیں زیادہ پاکیزہ رُو تھے۔ اس پر مستزاد ان کا بلند اخلاق اور دل نشیں اندازِ گفتگو جس کے ساتھ شگفتہ مزاجی سونے پر سہاگہ کا کام کرتی تھی۔ غرض اس پہلی ملاقات کے میرے دل و دماغ پر ایسے گہرے اثرات مرتسم ہوئے کہ نہ صرف وقت کی آندھیاں اور حالات کے تھپیڑے انہیں مدھم نہ کر پائے بلکہ بعد کی ملاقاتوں اور خط کتابت نے اس اوّلین تاثر کو پختہ تر کر دیا۔ آج بھی ان کی یاد آ جاتی ہے تو دل میں چراغاں سا ہو جاتا ہے:

ما دل خویش ز ابروی خم آویختہ ایم

ہمچو قندیل ز طاقِ حرم آویختہ ایم[۲]

۱۹۶۹ء کے موسم گرما کی چھٹیوں میں میرا کراچی جانے کا پروگرام تھا۔ میں نے خواجہ صاحب کو مطلع کیا تو انہوں نے ۲۶ جون ۱۹۶۹ء کے مکتوب میں لکھا:

''یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ گرما کی تعطیلات میں کراچی آنے کا ارادہ رکھتے ہیں مگر جناب پچھلی مرتبہ کی طرح نہیں کہ ادھر آئے اور ادھر گئے۔ اب کے آیئے گا تو میرے لیے وقت کا کوٹا مقرر کر لیجیے گا۔''

اسی خط میں انہوں نے مجھے ''اردو'' اور ''قومی زبان'' کے لیے لکھنے کی دعوت دی۔ بوجوہ میرا کراچی جانا نہ ہو سکا اور اپنی کوتاہ قلمی کے باعث میں مضمون کی فرمائش بھی پوری نہ کر پایا۔

سندھ میں لسانی فسادات کے نتیجے میں میرے بہت سے اعزہ لاڑکانہ سے کراچی منتقل ہو گئے، چنانچہ کسی نہ کسی تقریب سے سال میں ایک آدھ پھیرا رہنے لگا۔ ایسے ہی ایک موقع پر میں نے محبی حکیم سیّد محمود احمد برکاتی صاحب سے خواجہ صاحب کے ہاں جانے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ فوراً آمادہ ہو گئے اور مجھے ساتھ لے کر خواجہ صاحب کے مکان پر پہنچے۔ حسبِ معمول بڑی خندہ پیشانی سے ملے۔ اتوار کا دن تھا۔ خاصی طویل نشست رہی۔ دنیا جہان کی باتیں ہوئیں۔ خواجہ صاحب کو فوٹو گرافی کا بھی شوق تھا۔ موقع دیکھ کر اپنا کیمرہ نکال لائے اور ہم دونوں کو تختۂ مشق بنایا۔

اب میں نے گھر دیکھ لیا تھا۔ جب بھی کراچی جانا ہوتا میں وقت نکال کر ان کے پاس پہنچ جاتا۔ یہ ان کی شخصیت کا کمال تھا کہ ہر بار تشنگی بڑھ جاتی۔ علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی معاملات پر گفتگو ہوتی، پاک و ہند میں مختلف موضوعات پر ہونے والے کام سے تعارف ہوتا، علم دوست حضرات کا تذکرہ چھڑتا۔ فطری انکسار کے باعث وہ اپنے ذاتی معاملات کبھی زیرِ بحث نہیں لاتے تھے۔ خوش قسمتی سے ایسی بیشتر ملاقاتوں میں کوئی اور صاحب موجود نہ ہوتے تھے، نتیجہ یہ کہ پورے انہماک سے باتیں ہوتیں اور کسی دخل اندازی کا امکان نہ رہتا۔

مجھے اس امر کا احساس رہتا تھا کہ خواجہ صاحب کا بہت سا وقت خط کتابت کی نذر ہو جاتا

ہے، لہٰذا میں انہیں بلا وجہ خط نہیں لکھتا تھا اور اگر کوئی ضروری جواب طلب بات نہ ہوتی تو ان کے خط کے جواب میں جان بوجھ کر تاخیر کرتا۔ البتہ ان کی طرف سے تاخیر صرف علالت کی صورت میں ہوتی تھی۔ ان اسباب کی بنا پر اتنی طویل مدت پر محیط مکتوب نویسی کے باوجود میرے پاس خواجہ صاحب کے خطوط کی تعداد کوئی پچاس پچپن سے زیادہ نہ ہوگی۔

۲۷ دسمبر ۱۹۷۹ء کو ان کے والدِ گرامی خواجہ عبدالوحید صاحب وفات پا گئے۔ میں نے تعزیت کا خط لکھا تو فوراً شکریے کا خط آیا۔ ۱۹۸۰ء میں دادا جان کی صد سالہ تقریب ولادت منانے کا منصوبہ بنا اور محترم ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی صدارت میں مجلسِ یادگارِ حافظ محمود شیرانی کا قیام عمل میں آیا تو میں نے خواجہ صاحب کی خدمت میں مجلس ہٰذا کا رکن بننے کی درخواست کی۔ اس کے جواب میں ۵ جون ۱۹۸۰ء کو لکھتے ہیں:

''مجلسِ یادگارِ شیرانی میں آپ میرا نام دینا چاہتے ہیں۔ میری عزت افزائی ہے۔ کراچی کے اہلِ علم میں سے پیر حسام الدین راشدی کا نام نامی تو آپ کے پیشِ نظر ہوگا۔ ان کے علاوہ جمیل الدین عالی، ڈاکٹر جمیل جالبی اور شان الحق حقی صاحبان کے اسمائے گرامی پر آپ غور فرما سکتے ہیں۔ ضرورت ہو تو ان حضرات سے گفتگو میں کر سکتا ہوں۔''

لاہور میں یہ تقریبات ۵ تا ۷ اکتوبر بڑی کامیابی سے منعقد ہوئیں۔ اگرچہ خواجہ صاحب بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر ان میں شریک نہ ہو سکے البتہ اس موقع پر انہوں نے سہ ماہی ''اردو'' اور ماہنامہ ''قومی زبان'' کے خصوصی شمارے شائع کرنے کا اہتمام کیا۔

خواجہ صاحب ''خامہ بگوش'' کے قلمی نام سے جو کالم لکھا کرتے تھے وہ بے حد مقبول تھا۔ میں بھی اسے شوق سے پڑھتا تھا۔ جب انہوں نے ڈاکٹر مسعود حسین خان کی خود نوشت ''ورودِ مسعود'' پر اپنے کالم میں تبصرہ کیا تو میں نے ایک خط میں اس پر اظہارِ پسندیدگی کرتے ہوئے لکھا: ''ابنِ انشا کی وفات کے بعد طنز و مزاح کا اتنا اچھا نمونہ میری نظر سے نہیں گزرا۔'' ۲۰ اگست ۱۹۹۰ء کے مکتوب میں فرماتے ہیں:

''ورودِ مسعود' پر تبصرہ آپ نے پسند فرمایا۔ ممنون ہوں۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ ڈاکٹر مسعود حسین نے بھی اسے پسند کیا ہے۔''

دراصل یہ ردِ عمل کچھ مسعود حسین خان صاحب سے مخصوص نہ تھا۔ یہ تو خواجہ صاحب کا اعجاز

تھا کہ جس شخص کی کتاب کو وہ اپنے قلم کا نشانہ بناتے وہ بجائے برا ماننے کے الٹا نہال ہو جاتا تھا اور اپنا زخمِ جگر دیکھنے کے بجائے تبصرہ نگار کے دست و بازو کی خیر مانگتا تھا۔ بعض ادبی شخصیات تو خواجہ صاحب کا مستقل ہدف تھیں۔ ان میں ایک نمایاں نام ساقی فاروقی صاحب کا بھی ہے۔ جب خواجہ صاحب کی سناؤنی آئی تو میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی غرض سے مجبی احمد ندیم قاسمی صاحب کی خدمت میں پہنچا۔ اثنائے گفتگو میں کہنے لگے: ''کل انگلستان سے ساقی فاروقی صاحب کا فون آیا تھا۔ بس خواجہ صاحب کا نام لیا اور پھر ایک لفظ نہ کہہ سکے، دھاڑیں مار کر رونے لگے۔''

جب میرے مقالے ''حافظ محمود شیرانی اور ان کی علمی و ادبی خدمات'' کی پہلی جلد شائع ہوئی تو میں نے ایک نسخہ خواجہ صاحب کی خدمت میں روانہ کیا۔ اس کی رسید دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آپ کی کتاب...... موصول ہوئی۔ اس گراں قدر تحفے کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ صبح کی ڈاک سے یہ کتاب ملی تھی۔ آج کا دن اس کی ورق گردانی میں گزرا۔ باالاستیعاب مطالعہ تو اگلے چند روز میں کروں گا۔ میرا فوری تاثر یہ ہے کہ ایک بڑے محقق پر یہ کتاب بذاتِ خود ادبی تحقیق کا عمدہ نمونہ ہے۔ آپ سے ایسے ہی کام کی توقع تھی۔'' (نوشتہ ۴ اگست ۱۹۹۳ء)

میں ''مقالاتِ حافظ محمود شیرانی'' کی وقتاً فوقتاً اشاعت پذیر ہونے والی جلدیں بھی ان کو پیش کیا کرتا تھا۔ اس سلسلے کی نویں جلد بھیجی تو اس پر بدیں الفاظ تبصرہ کیا:

''مقالاتِ حافظ محمود شیرانی' کی نویں جلد موصول ہوئی۔ اس کرم کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ اہم کام مکمل ہوا اور یہ جلد بھی سابقہ جلدوں کی طرح اردو میں ترتیب و تدوین کی بہترین مثال ہے۔ آپ سے پہلے کسی نے کسی محقق کے مقالات کو اس طرح مرتب نہیں کیا۔ آپ کے حواشی ایسے جامع اور مفید ہیں کہ متعلقہ موضوعات پر اب تک کی تحقیق کا پورا منظر نامہ سامنے آ جاتا ہے۔ خدا آپ کو تا دیر سلامت رکھے اور آپ اس طرح کے کاموں سے خانوادۂ شیرانی کا نام روشن کرتے رہیں۔'' (حررہ ۲۱ دسمبر ۱۹۹۹ء)

مجھ سے قلبی تعلق کی بنا پر خواجہ صاحب مجھے مشورے بھی دیتے رہتے تھے۔ چنانچہ ۱۰ فروری ۱۹۹۹ء کے گرامی نامے میں فرماتے ہیں:

''میری ناقص رائے میں دسویں جلد میں صرف حافظ صاحب کے خطوط شامل ہونے

چاہئیں...... گیارہویں جلد میں وہ سب تحریریں یکجا کر دیجیے جو باقی جلدوں میں شامل نہیں کی جاسکیں۔نویں جلد کا اشاریہ[7] دسویں جلد میں ضرور شامل کیجیے۔''

مشفق خواجہ صاحب کو مختلف شہروں کی تاریخ پر لکھی جانے والی کتابوں سے خصوصی دلچسپی تھی۔ ۱۹۹۹ء کے اواخر میں ضلع شیخوپورہ کی تاریخ کے موضوع پر دو کتابیں شائع ہوئیں۔ ایک ہمارے کالج کے ساتھی پروفیسر ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین صاحب کی اور دوسری خالد پرویز ملک ایڈووکیٹ کی۔ میں نے اپنے خط میں خواجہ صاحب کو یہ اطلاع دی تو انہوں نے جواب میں لکھا:

''ضلع شیخوپورہ سے متعلق آپ نے جن دونوں کتابوں کا ذکر کیا ہے، یہ میرے پاس نہیں ہیں۔آپ اتنا کرم کیجیے کہ پبلشر سے کہیے وہ مجھے وی پی پی سے بھجوادے۔ کتاب کے لیے میں کسی دوست کو زحمت نہیں دیتا کہ کتاب خرید کر پڑھنے کا مزا ہی اور ہے۔'' (۸ مارچ ۲۰۰۰ء)

میں نے خواجہ صاحب کی ہدایت نظر انداز کرتے ہوئے دونوں کتابیں ان کی خدمت میں روانہ کر دیں اور وزن میں گنجائش ہونے کے باعث اپنے کالج کے رسالے ''مرغزار'' کا تازہ شمارہ بھی رکھ دیا جس میں اتفاق سے میرے دو مضمون شامل تھے۔ ایک خاکہ ''گل نبی'' اور دوسرا اپنے دوست پروفیسر شمس الدین کی ریٹائرمنٹ پر پڑھی گئی تحریر۔ خواجہ صاحب ۲۱ مارچ ۲۰۰۰ء کو وصولی کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تاریخ شیخوپورہ کے دیکھنے سے یہ فائدہ ہوا کہ یہ معلوم ہوگیا کہ اس شہر میں ہرن مینار کے علاوہ بھی قابل دید آثار ہیں[8]۔ آپ نے سرخ روشنائی سے اغلاط کی تصحیح کر دی[9] اس سے یہ نسخہ بھی قابلِ دید ہوگیا۔''

خواجہ صاحب نے آئندہ لاہور آنے پر شیخوپورہ دیکھنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا تھا۔ افسوس کہ اس کی نوبت نہ آسکی اور یہ حسرت میرے دل میں رہ گئی۔

اسی مکتوب میں حسبِ عادت انہوں نے میرے دونوں متذکرہ بالا مضامین پر بھی اظہار خیال کیا:

''مرغزار میں آپ کے دونوں خاکے پڑھ ڈالے۔ 'گل نبی' پڑھ کر شخصیت نگاری پر آپ (کی) مضبوط گرفت کا اندازہ ہوا۔ آپ نے ایک دلچسپ اور قابلِ قدر شخصیت کو زندہ کر دکھایا ہے۔ 'نام دیو مالی'[10] اور 'کندن'[11] کے بعد یہ کردار بھی زندہ رہے گا۔ اس مضمون کو آپ 'فنون'[12] یا کسی

دوسرے رسالے میں چھپوا دیجیے گا تا کہ یہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی نظر سے گزر سکے۔ دوسرے مضمون میں بھی آپ نے ایک دلچسپ کردار پیش کیا لیکن اس کا وہ حصہ جو آپ کے اپنے ماضی سے متعلق ہے، مجھے بہت پسند آیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یادنگاری سے آپ کو خاص مناسبت ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر آپ اپنی یادوں کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیں[۱۱]۔ اس مضمون سے آپ کی شگفتہ مزاجی کا بھی اندازہ ہوا۔ معلوم نہیں آپ نے طنز و مزاح کی طرف توجہ کیوں نہیں کی ورنہ آپ اچھے اچھوں کو پیچھے چھوڑ جاتے......"

انھی دنوں وہ لاہور کے بعض دوستوں کے ساتھ سردار پور جھنڈیر لائبریری (تحصیل میلسی ضلع وہاڑی) کا ایک ہفتے تک معائنہ کرنے کے بعد واپس گئے۔ یہ مجموعۂ کتب دیکھ کر ان کو بڑی خوشی ہوئی جس کا اندازہ ان الفاظ سے ہوتا ہے:

"پاکستان کے جاگیرداروں کو کتے، ریچھ اور داشتائیں پالنے کا شوق ہے۔ جھنڈیر کے سرداروں نے کروڑوں روپے صرف کر کے یہ کتب خانہ قائم کیا ہے۔"

گرمی کے موسم میں اس سفرِ شوق کے باعث ان کی طبیعت ناساز ہوگئی اور کراچی پہنچ کر کچھ دن آرام کرنا پڑا۔ میرے مضامین پر خواجہ صاحب کے اظہارِ پسندیدگی کے پیشِ نظر میں نے "مرغزار" کے بعض گزشتہ شمارے اور اپنے والد مرحوم پر "بھاء جی" کے عنوان سے تحریر کردہ ایک پرانا مضمون بصورتِ عکس ان کی خدمت میں روانہ کیا۔ یہ میں نے "مرغزار" کے سابق مدیر احمد عقیل روبی کے تقاضے پر لکھا تھا۔ یہ مختصر مضمون خواجہ صاحب کو بہت اچھا لگا۔ اس ضمن میں ۳ مئی ۲۰۰۰ء کے خط میں فرماتے ہیں:

"مرغزار' میں آپ کی اور آپ کے بارے میں تحریریں میری دلچسپی کی ہیں۔ انشاء اللہ ان سے بہت جلد استفادہ کروں گا۔ 'بھاء جی' کا تراشہ آپ نے الگ سے بھیجا ہے۔ یہ میں نے پڑھ لیا ہے۔ اختر شیرانی کی شخصیت کے بارے میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے اس نے دل پر بے حد اثر کیا...... میں یہ مضمون 'قومی زبان' میں اشاعت کے لیے بھیج رہا ہوں۔ امید ہے آپ کو اعتراض نہ ہوگا۔ یہاں ایک صاحب اردو کے بہترین خاکوں پر مشتمل ایک کتاب مرتب کر رہے ہیں۔ وہ مجھ سے مشورہ کرتے رہتے ہیں۔ میں یہ مضمون انہیں دے رہا ہوں کہ اپنے انتخاب میں شامل کر لیں۔" بعد ازاں باقی تحریروں پر ۱۲ جون ۲۰۰۰ء کے مکتوب میں اظہارِ رائے کیا گیا ہے:

''آپ کے سارے مضامین میں نے پڑھ ڈالے۔ جی خوش ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ شخصیت نگاری کا جو اسلوب آپ کے ہاں ملتا ہے وہ کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتا۔ آپ اپنی یادوں کو اس طرح تازہ کرتے ہیں کہ متعلقہ شخصیت کے خدوخال روشن ہوتے جاتے ہیں اور مضمون کے خاتمے پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس شخصیت کو تو ہم بھی بہت قریب سے جانتے ہیں۔ مشاہیر کے بارے میں تو سب ہی لکھتے ہیں لیکن آپ نے جن غیر مشہور لوگوں پر لکھا ہے ان کو زندوں کی صف میں لا بٹھایا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ لوگ تو یہیں کہیں ہمارے آس پاس تھے۔ آپ شخصیات پر لکھنے کا شغل جاری رکھیے۔ آگے چل کر جب یہ خاکے کتابی صورت میں شائع ہوں گے تو آپ کا شمار ہمارے بہترین خاکہ نگاروں میں ہوگا۔''

خواجہ صاحب نے اپنی پسندیدگی کا عملی مظاہرہ یوں کیا کہ ان میں سے دو مضامین یعنی ''بھاء جی'' اور ''حکیم نیر واسطی''، ''قومی زبان'' کے شمارۂ اکتوبر ۲۰۰۰ء میں اکٹھے چھاپ دیے۔

ستمبر ۲۰۰۰ء کے پہلے ہفتے میں میرا کراچی جانا ہوا۔ ۹ ستمبر کو والد کی برسی کے سلسلے میں حیدر آباد میں ایک تقریب تھی۔ اس میں شرکت کے بعد دس تاریخ کو کراچی واپسی ہوئی۔ اگلی صبح خواجہ صاحب کو فون کیا۔ کہنے لگے: ''بس چلے آیئے اور دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھایئے۔'' میں نے کہا: ''اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟'' بولے: ''اس بہانے آپ کو دیر تک روک سکوں گا۔'' عرض کیا: ''ایک عزیز میرے ساتھ شیخوپورہ سے آئے ہیں۔ پھر کراچی میں ہمارا حال مردہ بدست زندہ والا ہوتا ہے۔ لہٰذا ہمارے یہاں کے میزبان گاڑی میں لے کر آئیں گے۔ یوں یک نشد سہ شد والا مضمون ہو جائے گا۔'' فرمایا: ''کوئی مضائقہ نہیں۔'' غرض ہم جا دھمکے۔ خواجہ صاحب کے ہم زلف ذوالفقار مصطفیٰ صاحب بھی موجود تھے۔ خوب باتیں ہوئیں۔ ایک الماری دکھائی جس میں ان کی تالیفات اور مرتبات بھری تھیں۔ میں نے بڑی دل سوزی سے کہا: ''خواجہ صاحب! خدا کے لیے نئے کاموں سے باز آیئے اور ان چیزوں کو چھپوانے کی فکر کیجیے۔'' بولے: ''جی ہاں، میں بھی یہی سوچتا ہوں لیکن ان کاموں کو انجام دیے اتنا عرصہ ہو گیا ہے کہ اب ان پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جس کی گنجائش نظر نہیں آتی۔'' یہ سن کر مجھے دھچکا سا لگا۔ خواجہ صاحب نے موضوع بدلتے ہوئے کہا: آپ دو کام ہمارے بھی کر دیجیے۔'' میں نے تفصیل پوچھی تو فرمانے لگے: ''ایک تو 'معربات رشیدی' مرتبہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی تدوینِ نو اور ترجمے کا کام ہے اور

دوسرا مرزا سلیمان قدر کے روزنامچے 'فرمانِ سلیمانی' کا اردو ترجمہ کرنا ہے۔" یہ روزنامچہ خود خواجہ صاحب نے مرتب کیا تھا۔ میں ان کو انکار تو کر ہی نہیں سکتا تھا۔ صرف یہ گزارش کی کہ ایک کام شروع کیا ہوا ہے۔ دو تین ماہ میں اس سے فراغت ہوگی تو آپ کی فرمائش پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔ بہر حال بڑی سیر حاصل نشست رہی۔ ہاں، اس موقع پر خواجہ صاحب نے ''ارمغانِ شیرانی'' کے لیے گیان چند جین کا مضمون ''محمود شیرانی سے میرے استفادات'' بھی دکھایا جو ایک روز قبل ہی امریکہ سے موصول ہوا تھا۔ میں نے اس پر سرسری نظر ڈالی اور انہیں واپس کر دیا۔ مضمون میں، اس کے عنوان کے برخلاف مؤلف نے اپنے ''ممدوح'' کے چٹکیاں لی ہیں۔ یہ تحریر حواشی کی محتاج تھی تاہم اسے محض ایک آدھ حاشیہ دے کر ارمغان میں شامل کر لیا گیا[۱۱]۔ تانت باجا راگ پایا کے مصداق مضمون ہٰذا میں اس ذہنیت کے آثار صاف دکھائی دیتے ہیں جو بعد میں ''ایک بھاشا دو لکھاوٹ دو ادب'' میں کھل کر سامنے آئی۔

ایک بجا تو فرمانے لگے: ''چلیے کھانا کھاتے ہیں۔'' جب یہ پتا چلا کہ کھانے کے لیے خواجہ صاحب کے پسندیدہ ہوٹل جانا ہوگا اور بیگم صاحبہ اپنی بہن کی تیمارداری کی خاطر ہسپتال میں ہیں تو مجھے سخت شرمندگی ہوئی۔ میں نے اس کا اظہار کیا تو کہنے لگے: ''بھائی، اگر بیگم صاحبہ گھر ہوں تو بھی میں اپنے دوستوں اور مہمانوں کو اسی ہوٹل میں کھانا کھلاتا ہوں۔'' غرض جاتے ہی بنی۔ ہوٹل کا ماحول بڑا پرسکون تھا۔ ہم نے اپنی پسند کا اور خواجہ صاحب نے پرہیزی کھانا کھایا۔ بعد ازاں ہم اجازت لے کر رخصت ہوئے۔

۲۸ مارچ ۲۰۰۱ء کے خط میں انہوں نے مجھے ''معربات رشیدی'' کے کام کی یاد دہانی کرائی۔ اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں:

''میں نے کراچی میں دورانِ ملاقات گزارش کی تھی کہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے مرتبہ 'معرباتِ رشیدی' کی تدوینِ نو فرما دیجیے تاکہ اسے شائع کیا جا سکے...... میرے پاس مطبوعہ اجزا ہیں۔ مقدمے کے لیے ڈاکٹر صاحب نے جو یادداشتیں جمع کی تھیں اور مقدمے کا ایک حصہ بھی میرے پاس ہے...... آپ کے سوا کوئی دوسرا نہیں جو اس کام کو کر سکے۔ اس لیے اگر آپ آمادہ ہوں تو مطلع فرمائیے۔ میں تمام کاغذات ارسال کر دوں گا۔''

خواجہ صاحب نے کاغذات تو اپریل میں بھیج دیے لیکن میں کہیں ستمبر میں جا کر کام شروع کر

سکا۔ بہر حال لگ لپٹ کر اس کی تدوین اور ترجمے کی تکمیل کی اور جنوری ۲۰۰۲ء کے آغاز میں اس کا ابتدائی مسودہ خواجہ صاحب کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ ساتھ ہی مقدمے کا نقشِ اوّل بھی ان کے ملاحظے کے لیے بھیجا۔ خواجہ صاحب نے تجویز پیش کی کہ ڈاکٹر صدیقی مرحوم کا تعارف بھی شامل کرنا مناسب ہوگا۔ غرض یہ کہ معربات کا کام ہر لحاظ سے مکمل کر کے اپریل کے دوسرے ہفتے میں ان کو ارسال کر دیا۔ ۱۵ اپریل ۲۰۰۲ء کو رسید دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پرسوں دوپہر کی ڈاک سے مسودہ موصول ہوا اور آج (پیر، ۱۵ اپریل) پون بجے تک میں اسی کے دیکھنے میں مصروف رہا۔ آپ کا شکریہ کیا ادا کروں، خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ جس نے یہ نہایت مفید اور عمدہ کام انجام دینے کی آپ کو توفیق دی اور اسی خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کو صحتِ کاملہ عطا کرے اور آپ آئندہ بھی ایسے مفید کام انجام دیتے رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کام آپ کے سوا کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا تھا۔ آپ کہتے ہیں کام میں تاخیر ہوئی۔ میں کہتا ہوں اتنے مختصر وقت میں ایسا اعلیٰ معیار کا کام مکمل کرنا معجزہ نہیں تو اور کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کام میں اگر دو سال بھی صرف ہوتے تو کم تھے اور اس کی اشاعت پر اہلِ علم ہی نہیں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی روح بھی خوش ہوگی......''

ابھی میں معربات کے کام سے فارغ نہ ہوا تھا کہ انہوں نے ایک اور کام میرے ذمے لگا دیا۔ ۱۲ جنوری ۲۰۰۲ء کے مکتوب میں رقم طراز ہیں:

''پرتو روہیلہ (مختار علی خان) سے آپ واقف ہوں گے۔ یہ شاعر ہیں اور انہوں نے غالب کے (فارسی) خطوط کے اردو تراجم شائع کیے ہیں...... ترجمے کے سلسلے میں انہیں کسی ایسے صاحبِ علم کی رہنمائی درکار ہے جو ان کی بعض مشکلات کو دور کرنے میں مدد کر سکیں۔ میں نے انہیں لکھا ہے کہ وہ آپ سے رابطہ کریں۔ امید ہے آپ اس ادبی و علمی کام میں ان سے تعاون فرمائیں گے۔''

اس سے قبل مجھے پرتو صاحب کا ۲ جنوری کا نوشتہ مل چکا تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا:

''......مخدومی مشفق خواجہ صاحب نے، کہ میرے لیے محض قبلہ ہی نہیں قبلہ نما بھی ہیں، آپ کا اسم گرامی معہ پتے کے اس ہدایت کے ساتھ لکھا ہے کہ اپنی مشکل کشائی کے لیے ان سے رجوع کرو۔ بقول موصوف کے اس علمیت و تبحّر کا دوسرا شخص دور و نزدیک نظر نہیں آتا......''

پرتو صاحب خود شیخوپورہ آکر بالمشافہ ''آہنگ پنجم''[۱۵] کے ترجمے کی مشکلات حل کرنا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ اس بارے میں آپ کے تمام مسائل ایک تو کیا کئی نشستوں میں بھی حل نہ ہو پائیں گے اور آپ شیخوپورہ کے چکر لگا کر عاجز آجائیں گے۔ مناسب یہ ہے کہ آپ اپنے ترجمے کے پندرہ پندرہ بیس بیس صفحات وقفے وقفے سے مجھے بھجواتے رہیے اور ساتھ ہی ان نکات کی فہرست بھی جو آپ کو پریشان کر رہے ہیں۔ یہ تجویز انہیں پسند نہ آئی اور انہوں نے چپ سادھ لی۔ میں نچنت ہو کر بیٹھ رہا۔

۲۴ مارچ ۲۰۰۲ء کو احمد آباد میں ڈاکٹر ضیاالدین دیسائی کا انتقال ہو گیا۔ خواجہ صاحب کی بھی ان سے خط کتابت تھی۔ میں نے ایک خط میں خواجہ صاحب سے اظہارِ تعزیت کیا اور اپنا موزوں کردہ قطعہ تاریخِ وفات ان کو لکھ بھیجا۔ جواب میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر ضیاالدین دیسائی کے انتقال کی خبر مل گئی تھی...... آپ نے قطعہ تاریخ بہت عمدہ نکالا ہے۔ اسے ضرور شائع ہونا چاہیے۔ میں اسے 'قومی زبان' میں اشاعت کے لیے دے رہا ہوں۔''

(نوشتہ ۲ اگست ۲۰۰۲ء)

بعد ازاں مرحوم کی شخصیت اور علمی کارناموں کے تعارف پر ایک مضمون لکھ کر خواجہ صاحب کی خدمت میں ارسال کیا۔ اس کا جواب دیتے ہوئے ۱۱ ستمبر ۲۰۰۲ء کو لکھتے ہیں:

''آپ کا مضمون ملا۔ پڑھ کر جی خوش ہو گیا۔ مرحوم کی شخصیت کی کیسی جامع اور جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے آگئی۔ آپ کا کمال یہ ہے کہ مرحوم کی شخصیت کو ملاقاتوں کے ذریعے نہیں خطوں کے ذریعہ اُجاگر کیا ہے۔ ایسا شخصی خاکہ کوئی دوسرا میری نظر سے نہیں گزرا۔ مرحوم کے علمی کاموں کا بھرپور تعارف بھی ہو گیا۔ میں آپ کی اس رائے سے متفق ہوں کہ اب ہمارے درمیان ان جیسا کوئی اور نہیں۔''

خواجہ صاحب نے مجھے یہ مضمون کہیں اور چھپوانے سے منع کر دیا تھا۔ وہ اسے ادارۂ یادگارِ غالب کے مجلّے ''غالب'' میں شائع کرنا چاہتے تھے۔ افسوس کہ اس کی نوبت نہ آسکی[۱۶]۔

میری خواجہ صاحب سے بعض الفاظ یا ان کی املا کے بارے میں چھیڑ چھاڑ رہتی تھی۔ وہ رشید حسن خان کی طرح اس معاملے میں بڑے محتاط تھے اور میں لاپروا۔ وہ اپنی محبت کی بنا پر ٹوکتے، مثلاً:

''آپ نے لفظ 'تمغا' ہر جگہ ہائے ہوّز سے لکھا ہے۔ کیا آپ 'تمغہ' کو درست سمجھتے ہیں؟

ایک لفظ 'ادائیگی' بھی آپ کے قلم سے نکلا ہے۔ یہ غلط العام ہے لیکن غلط العام قبیح۔ جب ہم خوش نمائیگی، بے وفائیگی، کم ادائیگی نہیں کہتے تو ادائیگی کیوں؟''

میں کٹ حجتی سے کام لیتا کہ حضرت غلط العام فصیح ہوتا ہے قبیح نہیں۔ زبانیں ریاضی کے اصولوں کی پابند نہیں ہوتیں کہ دو اور دو ہمیشہ چار ہی ہوں۔ اگر ہم محاورے اور املا کے معاملے میں بنیا پن دکھائیں تو زبان کا تو حلیہ ہی بگڑ جائے گا۔ اگر صحتِ زبان کا اتنا ہی خیال رکھنا ہے تو پھر ترکی زبان میں اصل لفظ ''تمغا'' ہے۔ اسے رواج دیجیے۔ دراصل ہمارے اسلاف نے تمغا کو تمغہ لکھ کر اس لفظ کو مشرف بہ اسلام کیا تھا۔ عربی زبان میں ہائے ہوّز بکثرت استعمال ہوتی ہے اور الف کا وجود ہی نہیں ہے۔ فقط ایک ستوانسا الف (الف لینہ)، ہمزہ کی شکل میں ملتا ہے۔ ادھر غیر سامی بالخصوص آریائی زبانوں میں الف فراوانی سے پایا جاتا ہے۔ اس حقیقت کے زیرِ اثر برعظیم میں عہدِ سلاطین ہی سے ہمارے بزرگ مقامی الفاظ کے آخری الف کو ہائے مختفی سے لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ اس دور کی فارسی کتابوں میں چوھہ (چوہا)، گدھہ (گدھا)، گھورہ (گھوڑا)، تھورہ (تھوڑا)، سونہ (سونا) اور روپہ (روپا = چاندی) لکھا ہوا ملتا ہے۔ ہم نے آپ جیسے مصلحین کی پیروی میں ان سب کی تصحیح کرلی۔ پُرکھوں کی نشانی ایک تمغہ بچا ہے آپ کو اس کا وجود بھی گوارا نہیں۔

''ادائیگی'' کے ضمن میں بھی میں خوئے بدرا بہانہ بسیار کا سہارا لیتا کہ جناب ''گی'' لاحقہ والے باقی الفاظ کے بارے میں آپ کا کہا سر آنکھوں پر لیکن ''ادائیگی'' کا معاملہ مختلف ہے۔ معنی کے اعتبار سے اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک محبوبانہ ادا والا اور دوسرا ادائے فرض و قرض والا۔ پہلے میں ہم آپ سے بالکل متفق ہیں اور بے ادائی، خوش ادائی، کج ادائی ہی بولتے اور لکھتے ہیں۔ اختلاف دوسرے پہلو پر ہے۔ فرض یا قرض کا ادا کرنا بڑا مشکل کام ہے اور اس کے لیے ''ادائی'' کا سا بُوچا لفظ بالکل ناکافی اور ناموزوں ہے۔ اس کی ''ادائیگی'' ہی سے قرض و فرض کا بوجھ اتر کر سکھ کا سانس لینے کا احساس ہوتا ہے۔

فارسی زبان سے سروکار رہنے کے باعث میں بعض اوقات بے خیالی میں اردو لکھتے ہوئے جدید فارسی املا کی آمیزش کر دیتا تھا۔ ''معربات رشیدی'' کی پروف خوانی کے دوران خواجہ صاحب نے میری توجہ اس بے قاعدگی کی طرف بدیں الفاظ مبذول کی:

''آپ چونکہ فارسی سے زیادہ شغف رکھتے ہیں اس لیے اردو عبارت کو بھی آپ نے فارسی

املا کے مطابق کر دیا ہے۔ اس سے بے چارے اردو والے پریشان ہوں گے۔ نون غنہ، ہائے مدوّر، یائے مجہول اور ہمزہ آپ اکثر استعمال نہیں فرماتے۔ اس صورتحال کو اہلِ اردو کے لیے قابل قبول بنانے کے لیے میں یہ حل پیش کرتا ہوں کہ معربات کا فارسی متن تو بالکل وہی ہو جو آپ نے لکھا ہے یعنی جدید ایرانی املا کے مطابق لیکن اردو متن، ترجمہ اور اردو حواشی میں املا انجمن ترقی اردو کے رہنما اصولوں کے مطابق ہو۔ اردو حصے میں فارسی عبارتیں بھی فارسیٔ ہند کے املا کے مطابق ہوں...... دراصل ہم اردو والے فارسی سے اس حد تک ناواقف ہو چکے ہیں کہ تے کی جگہ ۃ دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں...... اسی طرح بالائے بام کو بالای بام لکھ دیا جائے تو وہ اسے بالائی (ملائی) سمجھتے ہیں۔'' (نوشتہ ۱۲ نومبر ۲۰۰۲ء)

دراصل یہ محض میری لاپروائی تھی ورنہ میں تو فارسی زبان کے لیے بھی جدید ایرانی املا کے مقابلے میں ہمارے پرانے املا کو زیادہ موزوں سمجھتا ہوں۔ بہرحال خواجہ صاحب کے ارشاد کے مطابق ضروری ترامیم کر دی گئیں۔

خواجہ صاحب کی حتی الوسع کوشش ہوتی تھی کہ ان کے زیرِاہتمام شائع ہونے والی مطبوعات میں کوئی غلطی نہ رہ جائے۔ اسی سبب سے معربات کے پروف وہ مجھے پڑھنے کو بھیجتے تھے۔ جب تیسرے اور آخری پروف آئے تو اس کے ساتھ اپنے خط میں انہوں نے ۳ فروری ۲۰۰۳ء کو لکھا:

''میں آپ کو بے حد زحمت دے رہا ہوں مگر اس کے سوا چارہ نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ایسی علمی کتاب میں کوئی غلطی نہ رہنے پائے۔ میں یہ سارے کام خود کر لیتا مگر میری صحت ڈانواڈول چل رہی ہے۔ ویسے بھی یہ کام آپ مجھ سے بہتر طور پر انجام دے سکتے ہیں۔''

جامعہ کراچی کے ادارہ برائے مطالعاتِ وسطی و مغربی ایشیا کے صدرنشین ڈاکٹر ریاض الاسلام صاحب نے اپنے ادارے کی شائع کردہ تین کتابیں یعنی ''نصرت نامہ ترخان'' (فارسی)، ''سعادت نامہ'' (فارسی) اور ''مقالات حسام الدین راشدی'' (اردو) ''فنون'' میں تبصرے کی خاطر احمد ندیم قاسمی صاحب کو بھیجی تھیں۔ قاسمی صاحب علیل تھے۔ تبصرے میں دیر ہوئی تو ڈاکٹر صاحب موصوف نے مجھے یاددہانی کرانے کو کہا۔ میرے دریافت کرنے پر قاسمی صاحب نے فرمایا: ''مظہر بھائی! فارسی کی کتابوں پر تبصرہ کرنے والا نہیں ملتا۔'' میں نے محض ڈاکٹر صاحب کے پاسِ خاطر سے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ یوں یہ تبصرے ''فنون'' (شمارہ ۱۱۸، ستمبر-دسمبر ۲۰۰۲ء)

میں چھپے تو خواجہ صاحب کی نظر سے بھی گزرے۔ انہوں نے ۱۳ مارچ ۲۰۰۳ء کے مکتوب میں معربات کے آخری پروفوں کی تصحیح مکمل ہونے کی اطلاع دینے کے بعد لکھا تھا:

''اصل بات تو رہی جاتی ہے۔ 'فنون' کے تازہ شمارے میں آپ کے تبصرے دیکھے۔ یوں تو تینوں تبصرے بہت عمدہ ہیں مگر 'نصرت نامہ ترخان' کا تبصرہ تو بے مثال ہے۔ اردو میں ایسے تبصرے آپ کے جدِ امجد ہی نے لکھے ہیں۔ یہ تبصرہ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ آپ کتنی توجہ سے مطالعہ کرتے ہیں۔''

ایک طویل وقفے کے بعد ۲۰۰۳ء کے اوائل میں پرتو روہیلہ صاحب نے پھر رابطہ کیا[18]۔ اب وہ میرے تجویز کردہ لائحہ عمل سے متفق ہو گئے تھے۔ میں نے خواجہ صاحب کو یہ اطلاع دیتے ہوئے تفنناً یہ شعر لکھا:

چشم خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا
ہم تو سمجھے تھے کہ اے میر یہ آزار گیا

اس عرصے میں میرے دل میں یہ خلش رہی کہ کہیں خواجہ صاحب کو یہ گمان نہ ہو کہ میں نے ان کی سفارش کے باوجود پرتو صاحب کی معاونت میں تساہل سے کام لیا تھا۔ لہٰذا پہلی قسط موصول ہونے پر کمپوز شدہ صفحات میں فارسی متن کی درستی، ترجمے میں غلط فہمیوں کی تصحیح اور علیحدہ اوراق پر پرتو صاحب سے اختلاف کی توجیہہ نیز اپنے مؤقف کے حق میں دلائل تحریر کر کے ان تمام کاغذات کے عکس برائے اطلاع خواجہ صاحب کی خدمت میں روانہ کر دیے۔ ان کی رسید دیتے ہوئے ۲۷ مارچ ۲۰۰۳ء کے مکتوب میں فرماتے ہیں:

''پرتو روہیلہ صاحب کے ترجمے پر آپ کے اشارات پڑھ کر میں دنگ رہ گیا۔ پرتو صاحب خوش قسمت ہیں کہ آپ اس توجہ سے ان کی رہنمائی فرما رہے ہیں۔ آپ نے جہاں جہاں گرفت کی ہے اس سے آپ کے علم کی گہرائی کا اور ترجمے کے جو متبادل پیش کیے ہیں ان سے مفہوم تک آپ کی رسائی کا اندازہ ہوا۔ آپ کے ایسے ہی کام دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ آپ سے قربتِ دلی کے ساتھ قربتِ مکانی بھی ہوتی تو میں آپ سے بہت کچھ حاصل کرتا۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا کہ علمی کاموں میں پیش آنے والی مشکلات چشم زدن میں حل ہو جاتیں۔ یقین کیجیے کہ اس شہر میں

جہاں میں ہوں ایک بھی ایسا شخص نہیں ہے جس سے علمی کاموں میں رہنمائی تو کجا مدد بھی مل سکے۔ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی نادر کتاب ہاتھ لگتی ہے تو اسے دیکھ کر خوش ہونے والا بھی کوئی نظر نہیں آتا۔"

ایک بار میں نے خواجہ صاحب سے اثنائے گفتگو میں "اردو زبان کے ارتقائی مراحل" کے نام سے ایک کتاب لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا اور بتایا تھا کہ میں نے اس موضوع پر خاصا مواد جمع کر رکھا ہے۔ یہ تجویز ان کے دل کو لگی اور بعد میں وہ وقتاً فوقتاً اس ضمن میں یاد دہانی کراتے رہے۔ ۵ اگست ۲۰۰۳ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"اردو زبان کے ارتقائی مراحل' اگر آپ پسند فرمائیں تو ادارۂ یادگار غالب کی طرف سے شائع کی جاسکتی ہے۔"

کچھ عرصے بعد کمال مہربانی سے اس ضمن میں دوبارہ لکھا:

"میری پیشکش اب بھی موجود ہے کہ آپ جب بھی کوئی کتاب چھپوانا چاہتے ہوں ادارہ مذکور کی طرف سے خوشی سے شائع کی جائے گی۔" (محررہ ۹ اکتوبر ۲۰۰۳ء)

۲۰۰۳ء کے ربع آخر میں جب میں نے بعض دوستوں کے مجبور کرنے پر شعبہ فارسی، جی سی یونیورسٹی کے ایک جامع فارسی اردو لغت منصوبے میں تعاون کی ہامی بھری تو خواجہ صاحب کو یہ بات پسند نہ آئی۔ ان کا کہنا تھا: "پھر آپ کے اپنے علمی کاموں کا کیا بنے گا؟"

۲۰۰۴ء کے موسم بہار میں میرے دوست پروفیسر محمد اقبال مجددی صاحب کا کراچی جانا ہوا تو انہوں نے خواجہ صاحب کے ہاں بھی حاضری دی۔ اس ملاقات میں بقول ان کے خواجہ صاحب نے پہلا سوال یہ کیا: "کیا آپ شیرانی صاحب سے مل کر آئے ہیں؟" انہوں نے کہا: "جی ہاں۔" دوسرا سوال تھا: "انہوں نے اردو کے ارتقائی مراحل پر لکھنے کا آغاز کیا یا نہیں؟" مجددی صاحب کا کہنا ہے کہ میرے نفی میں جواب دینے پر خواجہ صاحب نے بے اختیار اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا جیسے انہیں یہ سن کر صدمہ ہوا ہو۔ یہ کام میں اب تک نہیں کر پایا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب کی تشویق سے محروم ہو جانے کے بعد میرے لیے اس منصوبے کی تکمیل اور بھی دشوار ہو گئی ہے۔

خواجہ صاحب طالبان علم و ادب کی براہ راست حوصلہ افزائی ہی نہیں کرتے تھے بلکہ

بالواسطہ طور پر بھی یہ فریضہ انجام دیتے تھے۔ اگر ان کے کاموں پر کسی اخبار یا رسالے میں کوئی تبصرہ شائع ہوتا تو اس کا تراشہ بھجواتے، کوئی شخص خواجہ صاحب کے نام اپنے خط میں کسی شخص کے لیے اچھے خیالات کا اظہار کرتا تو اس خط کا عکس متعلقہ شخص کو ارسال کرتے، حتیٰ کہ اگر کسی محفل میں کسی آدمی کے بارے میں نیک جذبات سننے میں آتے تو وہ بھی اس غیر حاضر فرد کو پہنچا دیتے تھے۔ اس طرح گویا وہ اہل قلم برادری کے دلوں کو آپس میں جوڑنے کی سبیل مہیا کرتے تھے اور یہ ان کی عالی ظرفی اور خیر سگالی کا روشن ثبوت ہے۔

میرے نام اپنا ۲۶ جون ۱۹۶۹ء کا مکتوب مکمل کرنے کے بعد یہ اضافہ کرتے ہیں:

''پس نوشت: پیر حسام الدین راشدی صاحب سے اکثر آپ کا تذکرہ رہتا ہے۔ وہ آپ کے بہت مداح ہیں۔ اس طرح گویا آپ سے 'نصف ملاقات' ہوتی رہتی ہے۔''

ستمبر ۲۰۰۲ء کا آخری عشرہ انہوں نے لاہور میں گزارا۔ واپس کراچی پہنچ کر خط لکھتے ہوئے یہ فقرہ بھی ان کے قلم سے نکلتا ہے:

''لاہور میں بہت سے کرم فرماؤں اور دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ کئی جگہ آپ کا ذکر خیر بھی آیا۔ لوگ آپ کا ذکر ادب اور احترام سے کرتے ہیں۔'' (نوشتہ ۱۷ اکتوبر ۲۰۰۲ء)

''معربات رشیدی'' کی اشاعت کے بعد ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:

''آپ کی کتاب اخباروں میں تبصرے کے لیے بھیجی ہے اور اہل علم کی نذر بھی کی ہے۔ ...... پہلا تبصرہ 'جنگ' میں چھپا ہے۔ یہ تبصرہ نہیں تعارف ہے۔ 'جنگ' لاکھوں کی تعداد میں لوگوں کی نظر سے گزرتا ہے، اس لیے اس کا اچھا اثر ہوا ہے......'' (محررہ ۵ اگست ۲۰۰۳ء)

پھر فاضل شہیر ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے کتاب ملنے پر جو خط خواجہ صاحب کے نام لکھا، اس کا عکس انہوں نے فوراً مجھے ارسال کیا۔ اس عکس پر انہوں نے اپنے قلم سے ان الفاظ کا اضافہ کیا:

''آپ کو خط لکھ کر لفافہ بند کر چکا تھا کہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا خط ملا۔ یہ بھی ملاحظے کے لیے پیش ہے۔ مشفق خواجہ۔''

بلوچ صاحب کا مکتوب یہ ہے:

''۲۰۰۴-۸-۲

مشفق خواجہ صاحب محترم! السلام علیکم

میں ممنون ہوں کہ آپ نے رسالہ 'معربات رشیدی' کا تحفہ عنایت فرمایا۔ مبارک ہو کہ ادارۂ یادگار غالب سے اشاعت کے لیے آپ نے اس علمی کتاب کو منتخب فرمایا اور مزید مبارک کہ آپ نے جناب ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کو اس کے اردو ترجمے اور مزید تحقیقات کے لیے تکلیف دی۔ ان کے حواشی اور تعلیقات نے آپ کی اس اشاعت کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ تحقیق کی رُو سے یہ ایک مثالی ترجمہ ہے اور مشعل راہ، ماضی کے متون کے تراجم کے لیے۔

نیاز مند نبی بخش''

افسوس کہ طالبعلموں کے دلوں کو تاب و توان بخشنے والا یہ دل پذیر انداز ان کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا۔

اِک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

خواجہ صاحب بڑے درد مند دل کے مالک تھے۔ واقفان حال جانتے ہیں کہ وہ مصیبت زدہ اور ضرورت مند لوگوں کی حتی المقدور امداد پوشیدہ طور پر کیا کرتے تھے۔ وفات پا جانے والے ادیبوں اور شاعروں کے ورثا کے لیے سرکاری، نیم سرکاری اور نجی ذرائع سے وظائف کی فراہمی کے لیے کوشاں رہتے اور اکثر ان کی مساعی مشکور ہوا کرتی تھیں۔ لیکن یہ ان کا اور ان کے پالنہار کا معاملہ ہے اور ان باتوں کو بحث کا موضوع بنانا نامناسب ہے۔ البتہ علم سے مزاولت رکھنے والوں کی تکالیف پر وہ جس طرح تڑپتے تھے اس کا اندازہ ان کے خطوط میں در آنے والی عبارتوں سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اہل علم کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتے تھے۔

استاد گرامی ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے خواجہ کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ ولی را ولی می شناسد۔ وہ کراچی کے قطب تھے تو یہ لاہور کے۔ جب تقویم عیسوی کے دو ہزار سال پورے ہوئے تو ڈاکٹر صاحب کو ایک سانحہ پیش آیا۔ اس کے بارے میں خواجہ صاحب اپنے ۱۲ جنوری کے خط میں کس دلسوزی سے لکھتے ہیں:

''لاہور سے اطلاع ملی ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی ٹانگ کی ہڈی دو جگہ سے ٹوٹ گئی ہے۔ دل، تنفس اور ذیابیطس کے مریض وہ پہلے ہی ہیں۔ یہ تازہ مصیبت قیامت سے کم نہیں ہے۔ بیگم قریشی صاحب سے فون پر بات ہوئی تھی۔ وہ بتا رہی تھیں کہ ڈاکٹر صاحب بہت تکلیف میں ہیں۔ خدا انہیں صحت کاملہ عطا کرے۔''

ڈاکٹر صاحب کی خواجہ صاحب سے محبت کا بھی یہی عالم تھا۔ جب خواجہ صاحب نے داغ مفارقت دیا تو میں نے فون پر ڈاکٹر صاحب سے اظہار تعزیت کرنا چاہا۔ اتفاق سے پروفیسر اقبال مجدّدی صاحب میرے پاس موجود تھے۔ میرا ارادہ جان کر انہوں نے فون نہ کرنے کا مشورہ دیا اور بتایا کہ میں کل پُرسہ دینے ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا تھا۔ خواجہ صاحب کا نام لیتے ہی ان کی حالت ایسی غیر ہوئی کہ میں اپنے کیے پر پچھتایا۔ ان کی یہ بات سن کر میں اپنے ارادے سے دست کش ہو گیا۔ خواجہ صاحب کو بچھڑے سوا سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود ابھی جون ۲۰۰۷ء کے اوائل میں جب میں نے ڈاکٹر صاحب موصوف سے خواجہ صاحب مرحوم کے بارے میں اپنے تاثرات لکھنے کی درخواست کی تو وہ چپ سے ہو گئے اور کتنی دیر گم سم بیٹھے رہے۔ ہاں زبانِ حال سے کہہ رہے تھے: ''دراصل میں اپنے میں خواجہ صاحب پر کچھ لکھنے کی ہمت نہیں پاتا۔ کئی بار سوچا بھی، تاہم جذبات میں ایسا ہیجان پیدا ہوتا ہے کہ کچھ بن نہیں پڑتا۔''

رشید حسن خان کی اہلیہ کی وفات ۲۰۰۲ء میں ہوئی تھی۔ یہ بات خواجہ صاحب کے علم میں نہ تھی۔ ایک مدت بعد ضمناً ایک خط میں تذکرہ ہوا۔ ان دنوں خان صاحب کی طبیعت ناساز چل رہی تھی۔ خواجہ صاحب نے مزاج پرسی کی غرض سے انہیں فون کیا۔ اس کا احوال اپنے ۷ اکتوبر ۲۰۰۴ء کے مراسلے میں یوں تحریر کرتے ہیں:

''اس وقت (رات دس بجے) میں نے رشید حسن خان صاحب کو فون کیا۔ خود انہوں نے اٹھایا۔ آواز بہت نحیف تھی۔ میرا نام سن کر خوش ہوئے۔ انہوں نے بتایا کہ صحت ساتھ نہیں دے رہی، کبھی ٹھیک ہو جاتے ہیں اور کبھی بیمار پڑ جاتے ہیں۔ میں نے بیگم صاحبہ کی خیریت معلوم کی تو انہوں نے بتایا کہ ان کا تو دو سال پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ پھر یہ فرمایا: 'ان کی جب زیادہ ضرورت تھی تو وہ چلی گئیں۔' میں نے انہیں بتایا مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ مجھے تو مظہر محمود شیرانی کے خط سے معلوم ہوا۔ کہنے لگے: 'میں نے کسی سے اس سانحے کا ذکر ہی نہیں کیا۔''

یہ عبارت پڑھ کر میرا تو دل ہل جاتا ہے۔خواجہ صاحب جس مقام سے گفتگو کر رہے ہیں یہ وہ مقام ہے جہاں ایک انسان کا دکھ دوسرے کا دکھ بن جاتا ہے۔ بندگی بے چارگی کی جو کیفیت خان صاحب کی ہے وہی خواجہ صاحب پر طاری دکھائی دیتی ہے۔اس جذبے کی صحیح عکاسی پنجابی ماہیے کی اس کلی میں کی گئی ہے:

تیری میری اِک جِندڑی تینوں تاپ چڑھے میں ہونگاں

خیر ڈاکٹر وحید قریشی اور رشید حسن خان تو ہماری علمی دنیا کے بڑے نام ہیں۔خواجہ صاحب تو علم و ادب سے سروکار رکھنے والے ہر شخص کی علالت پر، خواہ وہ ان سے باقاعدہ متعارف نہ ہو، متفکر ہو جاتے تھے۔ ۱۹۸۱ء میں ایک بار میں نے انہیں اپنے بہنوئی خورشید احمد خاں یوسفی کے بیماریٔ دل میں مبتلا ہونے کی اطلاع دی۔ جواب میں لکھتے ہیں:

''خورشید احمد خان صاحب کی بیماری کی اطلاع باعث تشویش ہے۔خدا سے دعا ہے کہ وہ جلد از جلد صحت یاب ہو جائیں۔کل محترم نفیس رقم صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ان سے خورشید صاحب کا ذکر آیا تو وہ دیر تک ان کے کمالات کا ذکر کرتے رہے۔میری طرف سے موصوف کی مزاج پرسی کیجیے گا۔''

ماہرین نفسیات کے نزدیک ایک کامیاب شخصیت کے اوصاف میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اسے کسی صدمہ اٹھائے ہوئے شخص کے دل کو تسلی دینے کا ڈھب آتا ہو۔خواجہ صاحب کو یہ کمال بھی حاصل تھا۔میرے چھوٹے بھائی، بڑی بہن اور والدہ کی وفات پر انہوں نے جو تعزیتی خطوط لکھے ان کی مثال ایسے تھی جیسے گرمی کی شدت سے تپتی ہوئی زمین پر بارش کے قطرے۔ ذرا یہ سادہ اور پرکار عبارت ملاحظہ کیجیے:

''آپ کی والدہ محترمہ کے انتقال کی خبر سن کر بے حد افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کے درجات بلند کرے اور آپ کو اس غم کے جھیلنے کی توفیق دے۔عمر کی کوئی بھی منزل ہو، ماں کا سایہ ایک بہت بڑی نعمت ہوتا ہے۔اس نعمت سے محروم ہو جانا ناقابل تلافی نقصان ہے۔آپ خوش قسمت ہیں کہ ایک طویل عرصے تک یہ سایہ آپ کے سر پر رہا۔آئندہ انشاءاللہ ان کی دعائیں آپ کے ساتھ رہیں گی۔'' (نوشتہ ۲۵ دسمبر ۲۰۰۴ء)

خواجہ صاحب کو ۱۹۸۰ء سے قبل ہی ذیابیطس کا موذی مرض لاحق ہو گیا تھا۔ شروع شروع میں تو غذا میں احتیاط اور پرہیز سے گزارا ہوتا رہا، بعد میں دواؤں کا سہارا لینا پڑا۔ اس بیماری سے انسانی جسم میں بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ خواجہ صاحب کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ستمبر ۱۹۹۷ء کے پہلے ہفتے میں ان کی ران پر ایک تکلیف دہ پھوڑا نکل آیا۔ ۱۱ ستمبر کو اس کا آپریشن ہوا۔ پھر ہسپتال سے اپنے بھائی کے گھر کلفٹن منتقل ہو گئے اور ۴ اکتوبر کو گھر واپس آئے۔ ذیابیطس کے باعث زخم مندمل ہونے میں دیر لگی۔ ۲۰۰۰ء کے بعد سے تو جیسے بیماریوں نے ان کا گھر دیکھ لیا تھا۔ ۲۸ مارچ ۲۰۰۱ء کو لکھتے ہیں:

''بے حد شرمندہ ہوں کہ ایک عرصے سے آپ کو خط نہیں لکھا۔ دراصل پچھلے کئی مہینوں سے میری صحت ڈانواڈول تھی۔ طبی معائنوں ہی میں وقت گزر گیا۔ اب خدا کا شکر ہے کہ میں بالکل ٹھیک ہوں اور حسب معمول اپنے کاموں میں مصروف۔''

۲۰۰۲ء کے موسم بہار میں ان کی طبیعت پھر ناساز ہو گئی۔ خون میں یوریا بڑھ گیا تھا جس سے ایک غنودگی سی طاری رہتی تھی۔ پھر بھی وہ حتی الامکان اپنے معمولات جاری رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ جب بیماری نے زور باندھا تو گیارہ روز ہسپتال میں رہنا پڑا۔ بعدازاں ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق مکمل آرام کی غرض سے وہ اپنے بھائی بہنوں کے پاس ساحل سمندر والے مکان میں چلے گئے جہاں ۲۴ دن قیام کر کے واپس آئے۔ ان کا خط نہ آنے کے باعث یہ عرصہ مجھ پر بڑا شاق گزرا۔ ان کے اپنے مکان پر کوئی فون نہیں اٹھاتا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے ان کی عارضی قیام گاہ کا نمبر ملا۔ چنانچہ ۲۱ جولائی کو رابطہ کرنے پر ان کی رسیلی آواز کان میں پڑی اور اگلے ہی دن انہوں نے زبان قلم سے یاد کیا۔ لکھا تھا:

''کل آپ سے فون پر بات کر کے بے حد خوشی ہوئی۔ آپ جیسے مخلصین کی دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ وہ شکایت رفع ہو گئی۔''

اس اثنا میں انہیں بلند فشارِ خون اور قلب کے عارضے بھی لاحق ہو گئے جو ذیابیطس کے لوازمات سے ہیں۔ وہ بڑی ثابت قدمی سے ان عوارض کا مقابلہ کر رہے تھے۔ لیکن انسان پیالہ و ساغر تو نہیں ہوتا۔ میرے ایک عریضے کے جواب میں ۹ ستمبر ۲۰۰۳ء کو رقم طراز ہیں:

''آپ کے ۱۴ اگست کے گرامی نامے کا جواب مجھ پر واجب ہے مگر میں کیا کروں کہ پھر

بیماری سدِّ راہ ثابت ہوئی۔ ایک روز صبح اٹھا تو دیکھا کہ بائیں ٹانگ ٹخنے سے گھٹنے تک سوجی ہوئی ہے۔ پورا ایک مہینہ اس کے علاج میں صرف ہوا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب صورتحال بہتر ہے۔ اب تو ایسا لگتا ہے کہ بیماریوں ہی کی رفاقت میں گزرے گی۔''

ان کا اندیشہ صحیح نکلا۔ بمشکل دو ماہ گزرے تھے کہ وہ سخت علیل ہوگئے۔

ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ معالجین نے مکمل آرام کی سختی سے تاکید کی۔ اس غرض سے انہیں پھر سی ویو اپارٹمنٹس لے جایا گیا۔ وہاں چار ماہ کا عرصہ گزارا۔ اس ضمن میں ۲۳ مارچ ۲۰۰۴ء کے مکتوب میں تحریر کرتے ہیں:

''خداوند تعالیٰ کا بے حد شکر ہے کہ میں بڑی حد تک صحت یاب ہو کر اپنے گھر واپس آ گیا ہوں۔ آپ جیسے مخلصوں اور بہی خواہوں کی دعائیں میرے کام آئیں۔ بیماری کے دوران آپ نے فون کر کے جس طرح میری دلجوئی کی اس کا شکریہ چاہوں بھی تو ادا نہیں کر سکتا۔ میں خوش قسمت ہوں کہ آپ میرا اتنا خیال رکھتے ہیں۔''

ان کی زندگی لکھنے پڑھنے سے عبارت تھی۔ فارغ تو وہ بیٹھ ہی نہیں سکتے تھے:

''میرا قیام سمندر کے کنارے ایک مکان میں تھا۔ نہایت خوبصورت منظر تھا۔ میں نے دو مہینے بستر اور دو مہینے کام کی میز پر گزارے اس طرح جو چار مہینے وہاں گزرے ضائع نہیں گئے۔''

ماہ نومبر کے اوائل میں خواجہ صاحب نے مجھے ایک اور کام تفویض کیا۔ وہ بیدل پر ڈاکٹر نبی ہادی صاحب کی کتاب کا دوسرا ایڈیشن ادارۂ یادگارِ غالب کے زیرِ اہتمام چھاپنا چاہتے تھے۔ کتاب میں بیدل کے جو اشعار بطور مثال درج ہوئے ہیں، فاضل مؤلف نے ان کا اردو ترجمہ بھی دیا ہے۔ البتہ آخر میں ۲۳ صفحات پر مشتمل بیدل کے کلام کا جو انتخاب شامل ہے وہ ترجمے کے بغیر ہے۔ خواجہ صاحب کی خواہش تھی کہ میں ان منتخب اشعار کا ترجمہ کر دوں۔ میں نے اظہارِ رضامندی کے ساتھ کچھ مہلت مانگی جس پر انہوں نے پوری کتاب کے عکس بنوا کر ارسال کر دیے۔ ساتھ ہی لکھا:

''بیدل کے ترجمے میں تاخیر کوئی بات نہیں۔ آپ اس کام کو اپنی سہولت کے مطابق انجام دیجیے۔'' میں نے کچھ عرصے بعد کام کا آغاز کر دیا لیکن پھر

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند[19]

انہی دنوں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ایک روز پیکیجز لمٹیڈ کے ناظم اشاعت ڈاکٹر خالد حمید شیخ (سابق وائس چانسلر، پنجاب یونیورسٹی) کا فون آیا۔ ان کی خواہش تھی کہ میں ان کے ادارے کے لیے کلام بیدل کا انتخاب تیار کروں اور ساتھ ہی ان اشعار کا اردو ترجمہ بھی کر دوں۔ کوئی سابقہ تعارف نہ ہونے کے باعث مجھے اس پیشکش پر تعجب ہوا۔ چنانچہ دریافت کیا کہ اس کام کے لیے میرا نام کس نے تجویز کیا؟

بولے: ''مشتاق احمد یوسفی صاحب نے۔'' اس پر میری حیرت بڑھی۔ ہر چند کہ یوسفی صاحب کا میری طرح ریاست ٹونک سے تعلق ہے اور میں ان کی تحریروں کا شیدائی ہوں تاہم میرا ان سے نہ کبھی تعارف ہوا نہ کوئی ملاقات ہوئی۔ خواجہ صاحب کی تازہ فرمائش کے پیش نظر میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے شیخ صاحب سے کہا: ''معلوم ہوتا ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ مشتاق یوسفی صاحب مجھے سرے سے جانتے ہی نہیں، وہ میرا نام کیونکر پیش کر سکتے ہیں۔ البتہ مشفق خواجہ صاحب نے ایسا کیا ہوگا۔'' تاہم وہ اپنی بات پر مُصر رہے۔ آخر اتمام حُجت کے طور پر انہوں نے کہا: ''یوسفی صاحب 'لمز' (LUMS) کے جلسۂ تقسیم اسناد کی صدارت کے لیے آئے تھے اور اس موقع پر یہ تجویز دے گئے تھے بلکہ کراچی واپس پہنچ کر انہوں نے شکریے کا جو خط لکھا ہے اس میں بھی اس بارے میں یاد دہانی کرائی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اس خط کی عکسی نقل آپ کو بھیج سکتا ہوں۔'' چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ بابر علی صاحب کے نام ۵ جنوری کا یہ خط پڑھ کر میں محظوظ ہوا کیونکہ یہ بھی یوسفی صاحب کے مخصوص رنگ میں تھا۔ اس کا ایک مختصر اقتباس میں یہاں درج کرتا ہوں:

''انتخاب بیدل کی تجویز آپ کو پسند آئی، مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ انتخاب و ترجمہ کے لیے...... سے زیادہ قابل و معتبر کوئی فارسی دان نظر نہیں آتا۔ میرے خیال میں انتخاب اشعار کا ہونا چاہیے، نہ کہ غزلیات کا۔ ایک یا زیادہ سے زیادہ دو اچھے اشعار کی خاطر پوری غزل از مطلع تا مقطع شامل کرنا طوالت اور کوفت کا باعث ہوگا۔ ثبوت میں میر تقی میر کے انتخاب کا حوالہ دوں گا جسے فضلی سنز، کراچی نے شائع و ضائع کیا ہے۔ یہ انتخاب پانچ جید عالموں نے کیا تھا۔ اتنا خراب انتخاب پانچ جید عالم ہی مل کر کر سکتے تھے، تنہا آدمی کے بس کا کام نہیں۔ اس میں پانچ عالموں کے دس ہاتھ

نظر آتے ہیں۔ شعر نظر نہیں آتا۔ میر البتہ نظر آتا ہے مگر مردہ بدستِ نیم مردہ۔''
بااین ہمہ میرا اندازہ بھی غلط نہ تھا کہ

کوئی مشفِق ہے چھپا پردۂ مشتاقی میں

اس قیاس کی تصدیق خواجہ صاحب کے آئندہ خط کے ان فقروں سے ہوئی:
''پیکیجز لمٹیڈ سے آپ واقف ہوں گے۔ اس ادارے نے متعدد کتابیں خوبصورت انداز میں شائع کی ہیں جیسے 'کلیات گرامی'، 'شرح غزلیاتِ غالب' (فارسی)۔ اب یہ بیدل کا انتخاب مع ترجمہ شائع کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں مشورہ دیا گیا ہے کہ آپ سے درخواست کریں...... ایک اچھا کام خوبصورت انداز سے ہو جائے گا۔ امید ہے آپ کو اس پر اعتراض نہیں ہوگا۔''
۲۰۰۴ء کی آخری سہ ماہی میں وہ بظاہر قرینِ صحت رہے۔ اس ضمن میں ۷ اکتوبر کو یوں اطلاع دیتے ہیں:
''میں بھی خدا کے فضل اور آپ کی دعاؤں کے طفیل صحت کے اعتبار سے اچھی حالت میں ہوں۔ اب اس عمر میں یہ بھی غنیمت ہے کہ اپنے کاموں کو انجام دینے کا وقت مل جائے۔ لہٰذا اپنے آپ کو تکلیف دیے بغیر جہاں تک ہو سکے مصروف رہتا ہوں۔''
میرے نام خواجہ صاحب کا آخری خط (نوشتہ ۲۵ دسمبر ۲۰۰۴ء) وہ ہے جو انہوں نے میری والدہ کی وفات پر تعزیت کی غرض سے لکھا تھا اور جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ اس کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے:
''میں خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت کے لیے دعا کرتا ہوں۔''
دعائیں تو میں نے بھی ان کی صحت و سلامتی کے لیے بہت کیں، بارگاہِ خداوندی میں عرض پرداز ہوا کہ باری تعالیٰ! تیرے اس بندے کا نام عبدالحئی ہے، تُو اپنی اس صفت کی ہی لاج رکھ لے لیکن:

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

خواجہ صاحب کو کراچی سے باہر کا سفر درپیش ہوتا تو ہفتوں پہلے سے اس کی تیاری شروع کر

دیتے تھے مگر سفرِ آخرت کی تیاری میں بڑی عجلت سے کام لیا۔ سوچا ہوگا کہ

ع دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

۱۹ فروری ۲۰۰۵ء کی رات ساڑھے نو بجے اچانک طبیعت بگڑی۔ آغا خاں ہسپتال پہنچے جہاں دو دن امید و بیم کی کیفیت میں رہ کر ۲۱ فروری کی رات ساڑھے نو بجے اس حیّ و قیوم کی خدمت میں حاضر ہوگئے جس سے بہتر کوئی میزبان نہیں ہوسکتا۔ اگلے روز نمازِ عصر کے بعد انہیں سوسائٹی کے قبرستان میں ان کے والدین کے پہلو میں لحد کے سپرد کر دیا گیا۔ انّا للہ و انّا الیہ راجعون۔

تھا بسکہ غنیمت دمِ مشفق خواجہ
بے سر ہوا علم اور بے پا تحقیق
ع = ۷۰ + ق = ۱۰۰

کیسے نہ کریں ماتمِ مشفق خواجہ
ہاتف جو پکارا ''غمِ مشفق خواجہ''
۲۱۷۵ - ۱۷۰ = ۲۰۰۵ء

ان کی وفات کی اطلاع مجھے تاخیر سے ملی۔ اگر بروقت مل جاتی اور کراچی پہنچ بھی جاتا تو اس بلبلِ ہزار داستان کو ساکت و صامت دیکھنے کا جگرا کہاں سے لاتا؟ نہ جانے کا یہ فائدہ تو ہوا کہ اب تک یہی سمجھے بیٹھا ہوں کہ خواجہ صاحب نے کسی بات پر ناراض ہو کر خط لکھنا بند کر دیا ہے۔ اب کی بار کراچی جانے پر، جیسے بھی بن پڑا، انہیں منالوں گا اور اس طویل خاموشی کا جی بھر کے ازالہ کروں گا۔ اس جذباتی کیفیت پر کسی وقت قوائے عقلی غلبہ پاتے ہیں تو میں چشمِ تصور سے دیکھتا ہوں کہ وہ آخری سفر کی تیاری کیے، نہائے دھوئے، سفید براق لباس پہنے لیٹے ہیں اور چہرے کی صباحت، موت کی زردی اور کفن کی سفیدی کا امتزاج موتیے کی کلی کا استعارہ پیش کر رہا ہے۔ اس مرحلے پر میرے کانوں میں ملکۂ موسیقی روشن آراء بیگم کے گائے ہوئے خیال کدارا کے بلمپت کے بول گونج اٹھتے ہیں:

ع بن ٹھن کے کہاں چلے

حواشی

۱- ''ہم اور مجنوں کتاب عشق کا سبق ایک ساتھ پڑھا کرتے تھے (پھر) وہ تو صحرا کو نکل گیا اور گلی کوچوں میں رسوائی ہمارا مقدر بنی۔''

۲- چچا جان ایف سی کالج کی طالب علمی کے زمانے میں لاہور میں ہمارے ہاں ہی قیام پذیر رہے تھے اور خواجہ عبدالوحید سے بخوبی واقف تھے۔

۳- یہ مضمون ۱۹۶۶ء کے ''قومی زبان'' (باباۓ اردو نمبر) میں چھپ گیا تھا۔

۴- زہیر صدیقی صاحب پاکستان کی انگریزی صحافت میں بڑی نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ ان کا انتقال ۸ جون ۱۹۷۹ء کو راولپنڈی میں سڑک کے ایک حادثے میں ہوا۔

۵- یہ مضمون اس سال کے ''قومی زبان'' (باباۓ اردو نمبر) میں شائع نہ ہوا تو میں نے خواجہ صاحب سے استفسار کیا۔ انہوں نے جواب میں لکھا کہ یہ تحریر مضمون نگار نے صاف کر کے دینی تھی۔ ملنے پر کسی آئندہ شمارے میں شامل ہوگی۔ افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔

۶- ''ہم نے اپنا دل خمدار ابرو سے اس طرح معلق کیا ہوا ہے جیسے حرم کی محراب سے کوئی قندیل آویزاں ہوتی ہے۔''

۷- مقالات کی آٹھ جلدوں میں اشاریہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ نویں جلد میں ناشرین کی عجلت کے باعث ایسا نہ ہو سکا۔ خواجہ صاحب کا اشارہ اسی طرف ہے۔ یہ اشاریہ دسویں جلد میں شامل ہے۔

۸- خواجہ صاحب کا خصوصی اشارہ شیخوپورہ کے قلعے اور جنڈیالہ شیر خاں کی باؤلی کی طرف

تھا۔ یہ باؤلی، جو شہنشاہ اکبر کے زمانے میں شیر خاں نے بنوائی تھی، خستہ حالت میں ہے۔ اس کے اندر خطِ نستعلیق میں فارسی کے سات اشعار پر مبنی قطعہ تاریخ کا ایک عمدہ کتبہ لگا ہوا تھا۔ مشفق خواجہ صاحب کے قریبی عزیز کرنل ڈاکٹر خواجہ عبدالرشید (منتظم اعلیٰ میو ہسپتال) نے کتبے کی حفاظت کی خاطر اپنے دوست ڈپٹی کمشنر، شیخوپورہ کے تعاون سے، اسے اُکھڑوا کر لاہور میوزیم میں رکھوا دیا تھا۔ یہ گزشتہ صدی کے آٹھویں عشرے کی بات ہوگی۔ تاریخِ تعمیر کا مادّہ ''بہ از چاہِ نخشب'' ہے جس سے سنہ ۹۷۶ھ برآمد ہوتا ہے۔ قطعہ ہٰذا میں باؤلی کے لیے ''وا (ے)'' کا لفظ آیا ہے۔ یہ گجراتی زبان میں ''واو'' اور پنجابی میں ''واں'' کہلاتا ہے۔ یہاں ایک چھوٹے سے واقعے کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ انہی دنوں کا قصہ ہے۔ ایک روز ہمارے کالج کے پرنسپل صاحب نے مجھے یاد کیا۔ ڈپٹی کمشنر شیخوپورہ کا قاصد آیا تھا۔ استفسار یہ تھا کہ ''دیو گردوں'' کے کیا معنی ہیں؟ میں نے کہا کہ یہ کوئی مسلمہ ترکیب نہیں ہے۔ ممکن ہے کسی شاعر نے بطور کنایہ مرّیخ کے لیے استعمال کی ہو۔ بہر حال اصل متن دیکھے بغیر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ قاصد دوبارہ محولہ بالا قطعہ لے کر آیا۔ متعلقہ مصرعہ یہ تھا:

ے ز دلوش بود دلو گردوں خجل

دراصل بعض تزئینی نشانات کے باعث لفظ ''دلو'' کے نیچے دو نقطوں کا شائبہ ہوتا تھا، ورنہ بات صاف تھی۔ تاریخ گو کا کہنا تھا کہ اس باؤلی کے دلو (ڈول) کے آگے آسمان کا دلو (یعنی برج دلو) شرمسار ہوتا ہے۔ اس باؤلی اور کتبے پر خواجہ عبدالرشید صاحب کا ایک عمدہ انگریزی مضمون ''پاکستان ٹائمز'' میں چھپا تھا تاہم اس میں ''دیو گردوں'' درج تھا۔ خدا جانے بعد میں انہوں نے اس کی تصحیح کی یا نہیں؟

۹۔ ڈاکٹر سلطان محمود حسین نے اپنی تالیف کے کچھ ابواب طباعت سے قبل مجھے بھی دکھائے تھے۔ میں نے اپنی بساط کے مطابق ان پر قلم لگایا تھا۔ چند اہم ابواب مجھے دیکھنے کا موقع نہ ملا۔ جب کتاب چھپ کر آئی تو اس میں متعدد اغلاط نظر پڑیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ستم ظریفی یہ کی کہ دیباچے میں میری ''معاونت'' کا شکریہ بھی ادا کر دیا۔

بہر حال خواجہ صاحب کو اس کا نسخہ بھیجتے وقت میں نے نمایاں اغلاط کی درستی کر دی تھی۔

۱۰- مقبرۂ رابعہ دورانی کے مالی پر تحریر کردہ مولوی عبدالحق کا معروف خاکہ۔

۱۱- رشید احمد صدیقی کا لکھا ہوا خاکہ جو ''ہم نفسانِ رفتہ'' میں شامل ہے۔

۱۲- خواجہ صاحب نے یہ مشورہ براہ راست قاسمی صاحب کو بھی دے ڈالا جس کے نتیجے میں ''فنون'' میں میرے اس قسم کے ہلکے پھلکے مضامین کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔

۱۳- اس کے بعد ہونے والی ملاقات میں جب خواجہ صاحب نے یہی فرمائش کی تو میں نے عرض کیا: ''حضرت! یادنگاری اور خودنوشت بڑے لوگوں کی ہوا کرتی ہے۔ ہم کیا اور ہماری یادیں کیا؟ بالفرض اگر میں آپ کے بہکاوے میں آ کر یہ کر گزروں تو اسے چھاپے گا کون؟ اور پھر چھپ بھی جائے تو پڑھنے والے کہاں سے آئیں گے۔ بخشو بی بلّی چوہا لنڈورا ہی بھلا۔'' تاہم ان کا اصرار برابر جاری رہا۔

۱۴- دیکھیے ''ارمغان شیرانی'' لاہور، فروری ۲۰۰۲ء، ص ۱۵ تا ۴۶

۱۵- غالب کی کتاب ''پنج آہنگ'' کا پانچواں باب۔ پرتو صاحب کے پیش نظر اس کتاب کا وہ نسخہ تھا جو پروفیسر سیّد وزیرالحسن عابدی کی تدوین و تصحیح کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی کی مجلس یادگار غالب کے زیر اہتمام ۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر شائع ہوا تھا۔

۱۶- بالآخر یہ مضمون قائداعظم لائبریری کے ادبی مجلّے ''مخزن'' (شمارہ مسلسل ۱۲) میں اشاعت پذیر ہوا۔

۱۷- پنجابی زبان میں، ہم تگما (تغما) ہی بولتے ہیں۔

۱۸- اس اثنا میں انہوں نے جو تگ و دو کی تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں:

''اس ترجمے میں بہت سے ایسے مقامات تھے جو نظر ثانی کے متقاضی تھے اور بہت سے موارد ات ایسے تھے جو میری سمجھ سے کلیتاً بالاتر تھے۔ اس ضمن میں، میں بار بار خواجہ صاحب سے رجوع کرتا اور وہ مجھے کبھی اسلام آباد اور کبھی لاہور کے علما اور فضلا کے نام پتے بتا دیا کرتے اور فروغِ ادب کے اس عالی مشن کی تکمیل کے لیے متعلقہ حضرات کو

خط بھی لکھ دیا کرتے اور میں ایک نیک نیت مجبور طالبعلم کی طرح جس کا امتحان نزدیک ہو اور امتحان میں وہی کچھ آنے والا ہو جو میں سمجھ نہیں پایا، اپنا بستہ لیے ان حضرات کے دروازے پر پہنچ جاتا۔ چنانچہ اس طلب میں، میں کس کس سے نہیں ملا، کہاں کہاں نہیں گیا، کیسے کیسے کوچوں اور گلیوں کو دریافت نہیں کیا اور کن کن اہل علم و بصیرت سے متعارف نہیں ہوا لیکن نتیجہ پھر بھی خاطر خواہ نہ تھا۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری، تیس سالہ تدریسی تجربہ، ایران میں دس سالہ قیام اور دسیوں ایسے مرعوب کن کوائف، غالب کی اس تحریر کردہ عبارت کے ان مفاہیم و مطالب تک نہ پہنچا سکے جس سے مجھے اطمینان ہوتا۔''

(ملاحظہ ہو مضمون ''مشفق خواجہ، خطوط، یادداشتیں اور تاثرات'' مطبوعہ ''قومی زبان'' اکتوبر ۲۰۰۶ء)

۱۹- ''وہ شراب کا پیالہ ٹوٹ گیا اور وہ ساقی اٹھ گیا۔''

نظیرِ خویش نہ بگذاشتند و بگذشتند[1]

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں (۱۹۱۲ء-۲۰۰۵ء)

یوں تو ہر ستارہ آسماں کا غرور اور ہر آدمی جہاں کا غرور ہوتا ہے لیکن ۲۰ شعبان المعظم ۱۴۲۶ھ کو ایک ایسا شخص ہمارے درمیان سے اٹھ گیا جس کا مثیل کبھی نہ مل سکے گا۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی ذات گرامی معقول و منقول کی جامع تھی۔ تخصص پرستی کے اس دور میں تحقیق و تدقیق اور سلوک و معرفت کا ایسا اجتماع نادر الوجود کہا جا سکتا ہے۔

ایک بار معروف فلسفی بوعلی سینا اس دور کے صوفی بزرگ شیخ ابوسعید ابوالخیر سے ملاقات کو آیا۔ واپسی پر بوعلی کے شاگردوں نے اس سے پوچھا: ''آپ نے شیخ کو کیسا پایا؟'' جواب ملا: ''جو میں جانتا ہوں شیخ ابوسعید دیکھتے ہیں۔'' ادھر شیخ ابوسعید سے ان کے مریدوں نے بھی یہی سوال کیا۔ فرمایا: ''جو میں دیکھتا ہوں بوعلی جانتا ہے۔'' ڈاکٹر صاحب کی عظمت کی کلید یہ ہے کہ ان کے ہاں عقل و عشق کے یہ دونوں دھارے پہلو بہ پہلو بہتے تھے اور اپنی حدود سے تجاوز نہیں کرتے تھے۔ البتہ وہ عقلی معلومات کی تصدیق روحانی ذرائع سے اور روحانی تجربات کی توثیق علم و دانش کی وساطت سے بھی کر لیا کرتے تھے۔ اس بات کی وضاحت ایک مثال سے کرنا مناسب ہوگا۔

حضرت آدمؑ کے مزار کے بارے میں مؤرخین میں اختلاف رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو بذریعہ کشف پتا چلا کہ ان کا مزار مسجد خیف کے صحن میں ہے۔ یاد رہے کہ اس جگہ کسی قسم کا کوئی نشان موجود نہیں تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے مرید خاص ڈاکٹر مفتی مظہر بقا صاحب کو، جو ام القریٰ یونیورسٹی، مکہ معظمہ میں اصول فقہ پر کام کر رہے تھے، لکھا: ''آپ میرے کشف پر نہ جائیں اور اس

بارے میں باقاعدہ تحقیق کریں۔'' دونوں کے درمیان اس موضوع پر ایک عرصے تک خط کتابت ہوتی رہی۔ مثلاً ڈاکٹر صاحب ۲ فروری ۱۹۹۲ء کے مکتوب میں مفتی صاحب کو لکھتے ہیں:

''حضرت آدم علیہ السلام کے مزار اقدس کے متعلق اس لیے دریافت کیا تھا کہ ۱۰ ذی الحجہ کو منیٰ میں ارکان حج ادا کرنے کے بعد (اس کے بعد کی رات میں) یعنی گیارھویں شب میں اس سیاہ کار نے کئی بار مسجد خیف میں عجیب مناظر دیکھے تھے۔ مسجد خیف میں جہاں سے صحن شروع ہوتا ہے (یعنی مسقّف حصے کے بعد) داہنی طرف حضرت آدم علیہ السلام کا مزار ہے اور تمام انبیا علیہم السلام وہاں جمع ہیں۔ ایسا اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بھی حج کے لیے تشریف لائے ہیں۔ پھر گیارھویں اور بارھویں کی درمیانی شب میں بھی انبیا علیہم السلام کو خانۂ کعبہ میں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ کے اس انعام کا کس طرح شکر ادا ہو سکتا ہے۔ ذرّۂ بے مقدار پر ایسا انعام اور وہ بھی بار بار۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں شرم رکھ لے اور رسوا نہ کرے۔ آمین ثم آمین۔''

(''مکتوبات ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں''، جلد اوّل، ص ۳۱۰، مرتب خالد محمود، حیدرآباد، ۲۰۰۰ء)

اس ضمن میں مفتی صاحب ایک خط میں رقم طراز ہیں:

''میں نے اس سے قبل غالباً ابن قتیبہ کی 'المعارف' اور ابن کثیر کی 'قصص الانبیا' کے حوالے سے تحریر کیا تھا کہ اس میں اختلاف ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی قبر کہاں ہے اور غالباً ابن تیمیہ کا حوالہ بھی دیا تھا۔ آپ کا یہ گرامی نامہ صادر ہونے پر میں نے مزید تحقیق کی تو فاکہی کی اخبار مکہ کی بعض روایات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی قبر مسجد خیف میں ہے۔ چنانچہ متعلقہ روایات اور ان کا ترجمہ ارسال خدمت ہے۔''

(''یادگار خطوط۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے نام''، مرتب خالد محمود، ص ۵۹۳، حیدرآباد، ۱۹۹۸ء)

۱۱ نومبر ۱۹۹۳ء کے خط بنام مفتی صاحب سے ڈاکٹر صاحب کے اس روحانی تجربے پر مزید روشنی پڑتی ہے:

''آپ حیدرآباد تشریف لائے لیکن تنہائی کا موقع نہ مل سکا۔ میں چاہتا تھا کہ (آپ) علمی تحقیق سے میرے واقعات پر نظر ڈالیں۔ ۱۹۶۴ء اور اس کے بعد کئی مرتبہ مسجد خیف میں ذوالحجہ کی بارھویں (کذا۔ گیارھویں؟) شب میں مسجد کے صحن میں جو قبّہ ہے وہاں ہم لوگ بیٹھے تھے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا مزار نظر آیا یعنی وہاں کا صحن جہاں سے شروع ہوتا ہے اس کے داہنے حصے

میں نظر آیا۔ پھر آدم علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام، اسمٰعیل علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، زکریا علیہ السلام، یحیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام، اصحاب کہف علیہم السلام۔ اور سلیمان علیہ السلام نہایت زرق برق لباس میں تھے۔ ان کے داہنے کندھے سے بائیں پہلو تک ایک سنہرا بیلٹ کی طرح حلقہ آویزاں تھا۔ ان کا لباس زرد رنگ کا تھا۔ جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ بڑے حسین اور جیم شحیم تھے۔ وہ کسی انتظام میں تھے۔ چکر لگا کر حضرت آدم علیہ السلام کے مزار کے قریب کھڑے ہو جاتے تھے۔ حضور انورؐ ایک نہایت حسین تخت پر جلوہ افروز تھے۔ کچھ سیاہ فام انبیا علیہم السلام بھی نظر آئے جو ایک نورانی دریا میں غرق تھے۔ صرف سر نظر آرہے تھے۔ ایک سال کچھ دیر میں پہنچا تھا تو اتنے انبیا علیہم السلام نہیں تھے۔ میں نے حضرت آدم علیہ السلام سے دریافت کیا کہ حضور! اس مرتبہ انبیا علیہم السلام کم ہیں تو کچھ اس طرح فرمایا: 'بیٹے تم دیر سے آئے ہو۔' ۱۲ ذی الحجہ کو عصر کے بعد مکہ معظمہ میں بھی اسی طرح کا منظر نظر آتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انبیا علیہم السلام بھی ہر سال حج میں تشریف لاتے ہیں۔'' (''مکتوبات''، جلد اوّل، ص ص ۲۰-۳۱۹)

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کا تعلق پٹھانوں کے قبیلے یوسف زئی سے تھا۔ ۲۳ ستمبر ۱۹۱۲ء کو جبل پور (سی پی) میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد گلاب خاں کی وفات کے وقت وہ بارہ سال کے تھے۔ ان کی تمام تر تعلیم علی گڑھ یونیورسٹی میں ہوئی جہاں سے میٹرک (۱۹۲۹ء)، انٹرمیڈیٹ (۱۹۳۱ء)، بی اے (۱۹۳۳ء)، ایم اے فارسی (۱۹۳۵ء) اور ایم اے اردو نیز ایل ایل بی (۱۹۳۶ء) کیا۔ فارسی شاعر سید حسن غزنوی پر مقالہ لکھ کر ۱۹۴۷ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ ڈی لٹ کی ڈگری بعد میں ناگپور یونیورسٹی نے تفویض کی۔

۱۹۳۷ء میں ایڈورڈز کالج، امراؤتی سے ملازمت کا آغاز ہوا۔ پھر مارس کالج، ناگپور اور بعدازاں ناگپور یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں پاکستان منتقل ہو گئے۔ یہاں اسلامیہ کالج (کراچی)، اردو کالج (کراچی) اور کراچی یونیورسٹی میں خدمات انجام دیں۔ ۱۹۵۶ء میں سندھ یونیورسٹی (حیدر آباد) میں صدر شعبۂ اردو کی ذمہ داری سنبھالی۔ یہاں انہیں جم کر کام کرنے کا موقع ملا۔ تدریس کے ساتھ ساتھ تحریر کا کام بھرپور انداز میں جاری رکھا۔ متفرق مضامین و مقالات سے قطع نظر ان کی چھوٹی بڑی کتابوں کی تعداد ایک سو کے لگ بھگ ہے جن میں سے دو تہائی سے زیادہ شائع ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے پسندیدہ موضوعات ادبی تحقیق

کے علاوہ مذہب، تصوف اور اقبالیات تھے۔ ان کے علاوہ لغت نویسی اور قواعد سے بھی دلچسپی تھی۔ انہوں نے اپنا علم قلم ہی سے نہیں شاگردوں کی وساطت سے بھی پھیلایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہماری یونیورسٹیوں میں عموماً ڈاکٹریٹ کرنے والوں کی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی۔ ایک ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں تھے جن کی فراخ دلی بے مثال تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جتنی تعداد میں طالبان علم نے ان کے زیرنگرانی پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اس کی مثال کوئی اور استاد اردو پیش نہیں کرسکتا۔ ان خوش نصیبوں میں ڈاکٹر خان رشید، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، ڈاکٹر سخی احمد ہاشمی، ڈاکٹر نجم الاسلام، ڈاکٹر احمد رفاعی، ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی، ڈاکٹر عبدالحق حسرت کاسگنجوی، ڈاکٹر سردار احمد خاں، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، ڈاکٹر منیر الدین عرشی کرتپوری، ڈاکٹر اقبال احمد خاں، ڈاکٹر منہاج الدین، ڈاکٹر عبدالمقیت شاکر علیمی، ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی، ڈاکٹر فضل حق خورشید، ڈاکٹر الیاس عشقی اور ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری جیسے معروف نام شامل ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سی نمایاں شخصیات مثلاً ابن انشا، ڈاکٹر محمد اسلم فرخی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ڈاکٹر ابوالخیر کشفی وغیرہ بھی تعلیم کے مختلف مراحل میں ان کے شاگود رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی تدریسی اور تالیفی خدمات کا اعتراف بھی ہوا اور انہیں متعدد اعزازات بھی ملے جن میں درج ذیل خصوصیت سے قابل ذکر ہیں:

ان کی کتاب ''اقبال اور قرآن'' پر صدارتی طلائی تمغا	۱۹۸۵ء
انجمن ترقی اردو کی جانب سے نشان سپاس	۱۹۸۸ء
پچاس سالہ خدمات پر سندھ یونیورسٹی کی طرف سے طلائی تمغا	۱۹۹۰ء
ہمدرد فاؤنڈیشن کی جانب سے نشان سپاس	۱۹۹۲ء
حکومت پاکستان کی طرف سے ستارۂ امتیاز	۱۹۹۲ء
بلدیہ حیدر آباد کی جانب سے تاج پوشی اور نشان بلدیہ	۱۹۹۸ء

ڈاکٹر صاحب سندھ یونیورسٹی سے بطور صدر شعبہ ۱۹۷۲ء میں سبکدوش ہوئے تھے، تاہم ہر سال، بغیر کسی درخواست کے، ان کو ایک ایک برس کی توسیع دی جاتی رہی تا آنکہ انہیں تاحیات یونیورسٹی کا استاد ممتاز قرار دے دیا گیا۔

یہ تو تھا دانش برہانی کا معاملہ لیکن دانش نورانی کے اعتبار سے بھی، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، وہ

بہت بلند مقام پر فائز تھے۔ بچپن ہی سے دین اور بزرگانِ دین کی محبت ان کے رگ وپے میں سرایت کیے ہوئے تھی۔ ابھی چند برس کے تھے کہ مذہب سے ان کے لگاؤ کے پیش نظر ان کے چچا نے انہیں ''مُلّا جی'' کا لقب دے دیا تھا۔ عسرت اور یتیمی کے مسائل و مصائب کے مقابلے میں تسلیم و رضا کے پیکر غلام مصطفیٰ کو توکل و طمانیت کی وہ دولت ارزانی ہوئی جس کا ایک اعلیٰ و ارفع نمونہ صدیوں پہلے نظام الدین اولیا کی صورت میں دنیا دیکھ چکی تھی۔ خوش نصیبی کا یہ عالم تھا کہ لڑکپن ہی سے خواب میں اولیائے عظام، انبیائے کرام بلکہ حضور سرورِ کائناتؐ کی زیارت کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا جو تاحینِ حیات قائم رہا۔ آگے چل کر یہ زیارات مراقبہ و مکاشفہ کے عالم میں ہونے لگیں۔ ان کے کشف کا ملکہ درجۂ کمال کو پہنچا ہوا تھا لیکن جب تک کوئی خاص ضرورت پیش نہ آئے وہ اپنے روحانی تجربات کے اظہار سے اجتناب کرتے تھے۔ حج کے اسفار میں مسجد خیف اور خانۂ کعبہ میں انبیا علیہم السلام کی زیارت کا قصہ انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام کے مزار کی تحقیق کے خیال سے مفتی مظہر بقا صاحب کو لکھ دیا تھا۔ اس سے قبل اپنی مختصر کتاب ''تاریخ اسلاف'' (۱۳۸۳ھ) میں بھی ضمناً بعض باتیں درج ہوئی تھیں۔ جب ڈاکٹر صاحب کی عمر ۸۵ برس سے متجاوز ہوئی، ضعف مستولی ہوا، گھٹنوں نے جواب دے دیا، نماز کرسی پر بیٹھ کر پڑھنے اور میز پر سجدہ کرنے لگے۔ ان کے عقیدت مندوں نے تقاضا کیا کہ وہ اپنے مکاشفات و مشاہدات حیطۂ تحریر میں لے آئیں۔ ڈاکٹر صاحب اس کام کو اشتہار کے مترادف گردانتے تھے اور راضی نہیں ہوتے تھے۔ جب اصرار حد سے بڑھا تو اس پر آمادہ ہوئے کہ یہ تحریر میری زندگی میں عام نہیں کی جائے گی۔ یوں ''فضل کبیر'' کے عنوان سے ۹۶ صفحات کا ایک مختصر رسالہ وجود میں آیا۔ ان کے قریبی حلقے کے لوگوں نے اسے بڑی نفاست سے چھپوایا اور محفوظ کر دیا۔ مجھے خاصی دیر بعد اس کی بھنک پڑی تو میں نے کراچی میں محمد راشد شیخ صاحب کو لکھا کہ آپ حیدرآباد جاتے رہتے ہیں، ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب کا ایک نسخہ کسی طرح حاصل کر کے بھجوایئے۔ ان کا جواب آیا: ''میرے لیے اس کا حصول ممکن نہیں، البتہ اگر آپ براہ راست ڈاکٹر صاحب کو لکھیں تو کامیابی کا امکان ہے۔''

ڈاکٹر صاحب میرے دادا جان کی علمی خدمات کے بڑے معترف تھے اور اپنے شاگردوں سے ان کا ذکرِ خیر کرتے رہتے تھے بلکہ ۱۹۴۱ء میں جب وہ اپنی علمی جستجو کے سلسلے میں چند دن (۲۴ تا ۲۷ اپریل) کے لیے لاہور آئے تھے تو ان سے ملاقات بھی کی تھی۔ اس کا ذکر اپنی ایک

کتاب میں بدیں الفاظ کرتے ہیں:

''پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی سے بھی ان کے دولت کدے پر نیاز حاصل کیا۔ ان کے پاس ملک ارسلان اور بہرام شاہ غزنوی جیسے غیر معروف بادشاہوں کے سکّے بھی بکثرت تھے اور حضرت عمر فاروق کے زمانے سے لے کر بہت دیر بعد تک کے سکّے محفوظ تھے۔ پروفیسر شیرانی صاحب کے صاحبزادے اختر شیرانی کی بچی بھی دیکھی جو اپنے دادا کی خدمت میں رہ کر فارسی ادب سے خوب واقف تھی۔'' (''تاریخ اسلاف''، ص ص ۲۵-۲۶، کراچی، ۱۳۸۳ھ)

علاوہ ازیں دو تین بار میں نے کسی تقریب سے ان کی خدمت میں عریضے بھی لکھے تھے جن کے جواب میں انہوں نے فوراً مرحمت فرمائے تھے۔ مثلاً ۱۹۷۵ء کے لگ بھگ جب میں نے اشاعت کی غرض سے ''مکاتیب حافظ محمود شیرانی'' کی جمع آوری کا آغاز کیا تو اس غرض سے ڈاکٹر صاحب کو بھی خط لکھا تھا۔ انہوں نے مرحوم کا ۵ ستمبر ۱۹۴۵ء کا نوشتہ اور ٹونک سے ارسال کردہ ایک مکتوب مجھے عنایت کیا تھا جو ڈاکٹر صاحب کے بعض استفسارات کے جواب میں تحریر ہوا تھا۔ پھر میں ۲۰۰۱ء میں ان کی زیارت سے بھی شاد کام ہو چکا تھا جس کا ذکر آگے آئے گا۔ چنانچہ میں نے مطلوبہ کتاب کے حصول کی خاطر ڈاکٹر صاحبؒ کی خدمت میں التماس کیا۔ انہوں نے کمال مہربانی سے ''دفضل کبیر'' کا ایک نسخہ مع مختصر گرامی نامے کے عطا فرمایا۔ اس پر ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۲ء کی تاریخ درج ہے اور عبارت یہ ہے:

''میرے محترم ڈاکٹر صاحب دام مجدکم

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ مل گیا تھا لیکن اب میری صحت ٹھیک نہیں رہتی۔ کتاب کی تلاش میں بھی سستی ہوئی۔ معذرت خواہ ہوں۔ بہن صاحبہ کو مؤدبانہ سلام مسنون۔

فقط والسلام

احقر غلام مصطفیٰ خان''

بہن صاحبہ سے مراد میری ہمشیرہ پروین اختر مرحومہ ہیں جو مجھ سے چھ سال بڑی تھیں اور جن کا ذکر ڈاکٹر صاحب نے لاہور میں دادا جان سے ملاقات کے ضمن میں کیا تھا۔

''فضل کبیر'' کو میں نے بڑے اشتیاق سے پڑھا۔ اس میں انہوں نے اپنی روحانی واردات کی مختلف جھلکیاں دکھائی ہیں۔ ان میں سے کچھ باتیں اختصار کے ساتھ یہاں درج کی جاتی ہیں۔

☆ سرکارِ دوعالمؐ کی ڈاکٹر صاحب پر خاص نظرِ کرم تھی۔ گیارہ بارہ برس کی عمر میں وہ پہلی بار خواب میں حضورؐ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ پھر بارہا حضور انورؐ کی شفقتیں نصیب ہوئیں۔ لڑکپن ہی میں ایک خواب کے دوران حضور اکرمؐ نے ان کے سلام کا جواب دے کر انہیں اپنی گود میں بٹھالیا۔

☆ ''ایک دن پیر الٰہی بخش کالونی، کراچی کے مکان نمبر ۳۲۸ میں فجر کے بعد مراقبہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ دفعتاً حضورؐ تشریف لے آئے۔ تمام کمرہ خوشبو سے مہک گیا۔ میں بے قابو ہو گیا۔ سربسجود ہو گیا اور دیر تک پڑا رہا۔ پھر اہلیہ آگئیں۔ وہ بھی اس خوشبو سے اور حیرت سے سکتے میں آگئیں۔'' (صفحہ ۱۱)

☆ ۱۹۶۴ء میں حج کے بعد جب مدینہ طیبہ میں حاضری ہوئی تو ۲۷ ذی الحجہ (۹ مئی) کو ''حضور انورؐ نے اپنا دستِ کرم میرے سر پر رکھا اور فرمایا: تم میری اولاد میں ہو (کچھ اسی طرح کے الفاظ تھے)۔'' (ایضاً)

☆ ۱۹۶۶ء کے حج میں بھی اسی طرح شفقت فرمائی: ''مجھ حقیر کے سر پر اپنا دستِ مبارک رکھا۔ ایک دن اپنی چادر مبارک بھی میرے سر پر رکھی۔ کس زبان سے شکر ادا ہو سکتا ہے۔'' (ص ۳۱)

☆ اسی طرح ۱۹۷۰ء میں شب پنج شنبہ، ۲۰ شعبان، ۱۳۹۰ھ (۲۱-۲۲ اکتوبر کی درمیانی شب میں) ''حضور انورؐ نے خاص الخاص شفقت سے مجھے کئی گھنٹے ساتھ رکھا اور مجھ سیاہ کار کی تربیت فرمائی۔ الحمدللہ'' (صفحہ ۱۲)

☆ ایک بار مدینہ منورہ میں ایک عجیب منظر دیکھا۔ یہ ڈاکٹر صاحب کے الفاظ ہی میں سنیے: ''حضور انورؐ کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا کہ یکایک عرش کا ایک ٹکڑا آسمان سے اترتا ہوا نظر آیا۔ اس کے انوار و تجلیات کا ذکر زبان و قلم کی قوت سے باہر ہے۔ اس کا فرش اس قدر مرصع و مطلا تھا کہ اس کے لیے کوئی تشبیہ و استعارہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔

پھر دیکھا کہ سیاہ لباس پہنے ہوئے بکثرت ملائکہ رکوع میں مستقل کھڑے ہوئے ہیں۔
اس عاجز پر بڑا رعب وجلال طاری ہوا اور ساتھ ہی یہ اندازہ بھی ہوا کہ رب العالمین
کس طرح رحمتہ للعالمینؐ کا شیدائی ہے۔ سبحان اللہ'' (ص ۲۹)

ڈاکٹر صاحب کو اسفارِ حج کے دوران جب بھی کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر عرض کر دیتے تھے اور وہ مشکل بطریق احسن حل ہو جاتی تھی۔ مراقبوں اور مکاشفوں میں حضور انورؐ کے علاوہ خلفائے راشدینؓ، صحابہ کرامؓ، امہات المومنینؓ وغیرہم کی زیارت بھی ہوتی رہتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب ستمبر ۱۹۴۹ء میں خیر پور ٹامیوالی کے ایک بزرگ سیّد زوار حسین شاہ صاحب سے سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ میں بیعت ہوئے تھے۔ اس اعتبار سے وہ حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمتہ کے ''چہیتے'' تھے۔ چنانچہ برعظیم کے اکثر بزرگوں سے عالم کشف میں ان کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اس مقصد سے انھوں نے سفر بھی بہت کیے۔ ۱۷ مئی ۱۹۴۲ء کو پہلی بار اجمیر شریف پہنچے تو: ''وہاں مجھ سیاہ کار پر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا اس قدر کرم ہوا کہ وہ اپنے مزار شریف سے باہر آکر میرے سامنے بیٹھ گئے۔ میری عجیب حالت ہوئی۔ ان کی دعائیں حاصل ہوئیں الحمدللہ۔'' (ص ۳۹) ڈاکٹر صاحب قبلہ کے کئی مکاشفات نہایت بلیغ اور چشم کشا ہیں۔ ان میں سے چند یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

☆ ''ایک مرتبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مجھ سیاہ کار پر شفقت ہوئی۔ فرمایا کہ مجھے مسلمان قوم سے شرم آتی ہے کہ میری قوم نے ان کو بہت دھوکے دیے ہیں۔''

(ص ۶۵)

حقیقت یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد ملت اسلامیہ کے ساتھ مغربی اقوام کے صدیوں پر محیط برتاؤ کا نچوڑ کہا جا سکتا ہے بلکہ موجودہ دور میں تو ان کا یہ وطیرہ اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہے۔

☆ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مزار نجف اشرف میں ہونے کے بارے میں کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں ہے۔ ان کا ایک مزار شمالی افغانستان میں بھی بتایا جاتا ہے جس کے باعث وہ شہر ہی مزار شریف کہلاتا ہے۔ دراصل کوفہ کی جامع مسجد میں شہادت کے بعد آپؓ کو خفیہ طور پر کسی نامعلوم مقام پر دفن کیا گیا تھا تاکہ خارجی ان کے مزار کی بے

حرمتی نہ کریں۔ ڈاکٹر صاحب ۱۹۷۱ء میں زیارات کی غرض سے بغداد گئے تھے۔ وہاں سے کربلائے معلیٰ اور "پھر نجف اشرف گئے۔ وہاں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مزار پر پہنچے۔ وہاں کعبہ کی طرح ہر طرف سے لوگ نماز اور سجدہ ادا کرتے تھے۔ حضرت علیؓ نے مجھ حقیر پر نظر کرم فرمائی۔ اس طرح سمجھ میں آیا کہ میں تمہاری وجہ سے یہاں آ گیا ہوں۔ یہاں نہیں ہوں۔" (ص ۴۳)

☆ "ایک مرتبہ حضرت شہباز قلندرؒ کی خدمت میں پروفیسر (علی نواز جتوئی) صاحب کے ساتھ ریل سے سیون (سیہون) پہنچا۔ وہاں سے تانگے میں بیٹھ کر ہم لوگ مزار شریف کی طرف جانے لگے تو حضرت شہباز قلندرؒ خود ہی تشریف لے آئے۔ فرمایا: 'تم کہاں جا رہے ہو؟ میں تو بدعات کی وجہ سے وہاں نہیں رہتا۔' میں نے عرض کیا کہ کم از کم آپ کے آستانے ہی کی زیارت ہو جائے گی۔" (ص ۸۵)

☆ حضرت سیّد احمد شہیدؒ کے مدفن کے بارے میں بھی مؤرخین متفق نہیں ہیں۔ ان کے سر کا مزار تو گڑھی حبیب اللہ میں دریائے کنہار کے کنارے پر ہے اور جسم کا مزار بالاکوٹ بازار کے پہلو میں موجود ہے۔ شاہ اسمٰعیلؒ کا مشہد اس جگہ سے دو تین فرلانگ آگے شمال مشرق میں نالا ست بنی کے دوسرے کنارے پر ایک بلند جگہ واقع ہے۔ دونوں مقامات پر متعدد شہدا کے مزارات ہیں۔

ڈاکٹر صاحب ۱۹۵۷ء کے موسم گرما میں بعض ساتھیوں کی معیت میں پھرتے پھراتے بالاکوٹ پہنچے۔ لکھتے ہیں:

"بالاکوٹ میں موٹر سٹینڈ کے قریب ہی حضرت سیّد احمد شہید علیہ الرحمتہ کا مزار ہے۔ وہاں عجیب کیفیت ہوئی۔ مزار کے قریب پھسل کر گر پڑا اور بے تاب ہو گیا۔ پھر سکون ہوا تو حضرت علیہ الرحمتہ نے فرمایا: 'میں اسی جگہ شہید ہوا تھا اور میرا گھوڑا بھی یہیں کھڑا ہوا تھا.......... اور شاہ اسمٰعیل (رحمتہ اللہ علیہ) لڑتے ہوئے آگے بڑھ گئے اور آگے جا کر شہید ہوئے۔' یہ بھی فرمایا کہ تمہارے بعض اعزّہ بھی میرے ساتھ تھے۔" (ص ۴۹)

جب میں نے یہ پڑھا تو مجھے سیّد شہیدؒ کا اپنی شہادت کے ساتھ اپنے گھوڑے کا ذکر کرنا عجیب معلوم ہوا اور بہت دیر تک اس بارے میں غور و فکر کے باوجود میں ان دونوں باتوں میں کوئی

مناسبت تلاش نہ کر سکا تا آنکہ حضرت رسالت مآبؐ کے عہد مبارک کا ایک واقعہ پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ عمرو بن عبسہ نے سرور کائناتؐ سے کچھ سوالات کیے جن کے جواب آپؐ نے بڑی بلاغت کے ساتھ دیے۔ ان میں سے بعض سوال جواب یہ تھے:

کیسا اسلام افضل ہے؟ اس شخص کا اسلام جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔

کیسا ایمان افضل ہے؟ جس کے ساتھ پسندیدہ اخلاق پایا جائے۔

کیسی نماز افضل ہے؟ جس میں دیر تک عاجزی کے ساتھ قیام کیا جائے۔

کیسی ہجرت افضل ہے؟ ایسی کہ تم ان چیزوں سے کنارہ کش ہو جاؤ جو تمہارے پروردگار کو ناپسند ہیں۔

کیسا جہاد افضل ہے؟ اس شخص کا جس کا گھوڑا بھی میدان میں مارا جائے اور وہ خود بھی شہادت پائے۔

اس آخری جواب کو پڑھ کر مجھے شرح صدر ہو گیا اور وہ اشکال جاتا رہا۔

☆ ڈاکٹر صاحب مزید لکھتے ہیں: ''پھر میں شاہ اسمٰعیل دہلوی علیہ الرحمتہ کے مزار پر حاضر ہوا۔ بڑا جلال نظر آیا۔ فرمانے لگے: 'ہماری نظر میں جیسے مسلمان ہونے چاہئیں ویسے اب نظر نہیں آتے۔' اور یہ بھی فرمایا: آج کل کے مسلمان شہید ہونے کے لیے دعا نہیں مانگتے کہ کہیں وہ دعا قبول نہ ہو جائے۔'' (ایضاً)

☆ ڈاکٹر صاحب کے مشاغل علمی کے پیش نظر بعض بزرگ ان سے کسی علمی خدمت کی فرمائش بھی کر دیتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۵۳ء میں دہلی جانے پر حضرت میرزا مظہر جان جاناںؒ کے مزار پر حاضری دی تو انہوں نے فرمایا: ''شاہ ابو سعید علیہ الرحمتہ کا ایک فارسی رسالہ 'ہدایت الطالبین' ہے، وہ اردو ترجمے کے ساتھ شائع کر دو۔'' (ص ۴) چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے اس حکم کی تعمیل کر دی۔

اسی طرح ۱۹۵۶ء میں سندھ یونیورسٹی کی ملازمت کے آغاز کے بعد ڈاکٹر صاحب کو مخدوم نوح (ہالائی) رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت ہوئی تو: ''مجھے اپنا قرآن دکھلایا۔ فرمایا: 'میں نے قرآن پاک کا ترجمہ فارسی میں کیا تھا۔ ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ تم اس کے لیے کوشش کرو۔' میں نے مخدوم

طالب المولیٰ صاحب کو خط لکھا۔ انہوں نے فوراً مجھے وہ ترجمہ عنایت فرمایا۔ میں نے صرف ایک پارہ (ترجمہ کا) شائع کیا...... بعد میں مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی نے اسے مکمل شائع کیا۔''

(ص ص ۷۴-۷۵)

اب ''فضل کبیر'' کے باب متفرقات سے ایک دلچسپ واقعہ لکھ کر یہ سلسلہ ختم کرتا ہوں۔ اپریل ۱۹۶۸ء میں معروف دانشور علامہ آئی آئی قاضی نے بیاسی برس کی عمر میں دریائے سندھ میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی تھی۔ جن دنوں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کا تقرر سندھ یونیورسٹی میں ہوا علامہ وہاں وائس چانسلر تھے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''علامہ آئی آئی قاضی صاحب نے جب سفر آخرت اختیار فرمایا تو سندھ کے ایک بزرگ نے مجھ سے فرمایا کہ ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھنا چاہیے۔ میں نے عرض کیا کہ حضور انورؐ کو تو تحقیق کے ساتھ معلوم ہو جاتا تھا (خواہ فرشتوں کے ذریعے) لیکن ہم لوگوں کو تحقیق کے ساتھ معلوم نہیں کہ یہ سانحہ کس سبب سے ہوا ہے۔ بہرحال میں نے نماز جنازہ پڑھائی۔ یہ واقعہ ۱۳ اپریل کا ہے۔ میں گھر آ کر سو گیا تو ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جسے عقل تسلیم نہیں کرے گی۔ وہ یہ کہ رات کو قریب تین بجے علامہ صاحب تشریف لائے...... مجھے جگایا اور فرمایا کہ تم نے ابھی تک تہجد کی نماز نہیں پڑھی۔ میں نے وضو کیا اور نماز شروع کی تو علامہ صاحب میرے مصلّے کے قریب بیٹھے رہے۔ پھر فرمایا: 'مجھ سے غلطی ہوئی لیکن اللہ تعالیٰ بڑا رحیم و کریم ہے۔' میرا دل بہت متاثر ہوا۔ میں ان کے لیے دعا کرتا ہوں۔'' (ص ۸۹)

ڈاکٹر صاحب اس کتاب میں ایک جگہ بڑے منکسرانہ انداز میں فرماتے ہیں: ''یہ اور اس قسم کے بکثرت واقعات اس عاجز سیاہ کار پر وارد ہوئے اور وہ صرف اللہ پاک کے احسانات و انعامات کے اظہار کے لیے بیان کیے گئے ہیں کیونکہ ارشاد ہے واَمّا بِنعمتِ ربّكَ فَحدِّث ورنہ یہ سیاہ کاران کیفیات اور ایسے انعامات کے ہرگز لائق نہیں اور قارئین سے بھی التماس ہے کہ ان باتوں پر دھیان نہ دیں کہ یہ کشفی چیزیں ہیں جو معتبر نہیں بھی ہو سکتی ہیں اور بزرگان دین علیہم الرضوان والرحمہ کی ارواح مقدسہ سے بھی بہت عاجزانہ معذرت ہے۔ اگر کوئی بات غلط منسوب ہوگئی ہو تو معاف فرمائیں۔'' (ص ص ۴۹-۵۰)

اور کتاب کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے:

''بس دعا ہے کہ اللہ پاک اپنے حبیبؐ، کل انبیا علیہم السلام، کل بزرگان دین علیہم الرضوان والرحمہ کے صدقے اور طفیل میں آخرت میں بھی لاج رکھ لے اور میرے عیوب کی پردہ پوشی فرماتے ہوئے جس طرح اس دنیا میں نوازا ہے آخرت میں بھی نوازے۔'' (ص ۹۰)

ڈاکٹر صاحب حسن اخلاق کے اعتبار سے بڑے بلند مرتبے پر فائز تھے۔ دل نوازی کا سلیقہ ان کے لہو میں تھا۔ جو بھی ملتا گرویدہ ہو جاتا۔ صبر و برداشت کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ لوگ وقت بے وقت آتے رہتے تھے پر مجال ہے ان کے ماتھے پر بل پڑ جائے۔ تنہائی اور گوشہ نشینی پسند تھی مگر اس کا حصول ممکن نہ تھا۔ سینکڑوں شاگرد، ہزاروں مرید پھر لاکھوں ایسے جو نہ شاگرد تھے نہ مرید پر ان کا دم بھرتے تھے۔ علمی اور عرفانی حلقوں میں ان کا نام احترام سے لیا جاتا تھا۔ کبرسنی اور متعدد عوارض کے باوجود ان کا علمی و روحانی فیض برابر جاری تھا۔ عمرِ عزیز کے آخری برسوں میں ان کے بہی خواہوں نے ملاقات کے اوقات اور ایام مقرر کر دیے تھے تاہم اس پر سختی سے پابندی کا دور دور تک امکان نہ تھا۔

وضعداری ڈاکٹر صاحب پر ختم تھی۔ میری بہن پروین اختر سرکاری سکول میں معلّمہ تھیں۔ برسوں عمرکوٹ (تھرپارکر) میں رہیں۔ انہوں نے سندھ یونیورسٹی سے پرائیویٹ حیثیت میں ایم اے فارسی کا امتحان دینا چاہا۔ عمرکوٹ میں نصابی کتابیں کہاں ملتیں۔ بہن کو ڈاکٹر صاحب کی حیدرآباد میں موجودگی کا علم تھا اور ان کی لاہور میں ہمارے ہاں آمد بھی یاد تھی۔ لہٰذا مئی ۱۹۷۵ء کے آغاز پر ڈاکٹر صاحب کو ایک خط لکھ بھیجا جس کا جواب انہوں نے ۹ مئی کو دیا۔ لکھا تھا:

''عزیزہ محترمہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ ملا۔ یقین جانیے کہ میں نے جب سے یہ سنا تھا کہ آپ لاڑکانہ میں ہیں اس وقت سے نصف ملاقات کا متمنی تھا۔ میں ۲۴-۲۷ اپریل ۱۹۴۱ء کو لاہور حاضر ہوا تھا اور قبلہ حافظ محمود شیرانی صاحب کی خدمت میں بیٹھا تھا...... آپ اس وقت دس گیارہ سال کی تھیں۔ آپ کے دادا صاحب کے بعض مکتوبات بھی میرے پاس ہیں۔ یوں بھی ٹونک سے میرا تعلق ننھیالی ہے...... کیا عرض کروں کہ آپ سب سے مجھے کتنی عقیدت ہے۔ مجھے آپ کے تمام حالات معلوم ہوتے رہے۔ انشاء اللہ

ہر ممکن خدمت کے لیے حاضر ہوں......"

(مکتوبات، جلد دوم، ص ۱۰۶)

ڈاکٹر صاحب نے اپنا قول پوری طرح نبھایا اور پروین بہن کی پوری پوری اعانت کی۔ جب وہ ایم اے کا تحریری اور بعد میں زبانی امتحان دینے حیدر آباد آئیں تو انہیں بہ اصرار اپنے یہاں ٹھہرایا۔ بہن نے ایم اے کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا تو ڈاکٹر صاحب نے مبارکباد کا خط لکھا۔ ۱۹۷۷ء میں میرے بہنوئی علی گوہر خاں شیرانی کا عمر کوٹ میں انتقال ہوا تو تعزیت نامہ ارسال کیا۔ ایسے سولہ خطوط "مکتوبات ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں" میں شامل ہیں۔ شوہر کی وفات کے کچھ عرصہ بعد بہن عمر کوٹ سے شیخوپورہ منتقل ہو گئیں جہاں میں ۱۹۶۳ء سے مقیم تھا۔ یہاں ان سے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں گفتگو ہوتی رہتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کا سب سے نمایاں وصف ان کا عجز و انکسار تھا۔ علمی اور روحانی اعتبار سے اتنے بلند مرتبے پر فائز ہونے کے باوجود خشیت اللہ سے اتنے خائف لوگ بہت کم ہوں گے۔ اپنے ملاقاتیوں اور مکتوب الیہان سے اپنی عاقبت بخیر ہونے کی درخواست کرتے رہتے تھے۔ اگر کوئی بیعت ہونے کی خواہش ظاہر کرتا تو معذرت کرتے اور فرماتے کہ میں اس لائق نہیں ہوں۔ اگر دوسری طرف سے زیادہ اصرار ہوتا تو کہتے: "اچھا اگر آپ کی خوشی اسی میں ہے تو میں حاضر ہوں۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ آپ کی برکت سے حشر کے دن میری مغفرت فرما دے۔"

وہ روایتی پیری مریدی کے قائل نہ تھے۔ مریدوں کے نذرانوں سے سخت پرہیز کرتے بلکہ خود ان کی امداد و اعانت پر آمادہ رہتے۔ لوگوں سے اپنی تعریف و توصیف سننا بھی انہیں گوارا نہ تھا۔ کوئی شخص ان کے مناقب پر مبنی نظم وغیرہ سنانا چاہتا تو سختی سے منع کر دیتے تھے۔ ان کے انکسار کی حیرت انگیز مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ میں ان سے صرف نظر کر کے اس ضمن میں صرف دو بزرگوں کی آراء پر اکتفا کروں گا۔

حضرت امیر خسروؒ کے بارے میں حضرت نظام الدین اولیا علیہ الرحمہ کا یہ قول معلوم و مشہور ہے: "الٰہی! بسوزِ دلِ ایں ترک بچہ مرا بخش۔" اسی طرح ڈاکٹر صاحب کے مرشد سیّد زوار حسین شاہ صاحب دعا کرتے تھے: "خدایا! ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے عجز کے طفیل میری بھی بخشش فرما دینا۔"

دوسری بات عالم کشف سے تعلق رکھتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ملتان میں حضرت بہاء الحق ذکریا علیہ الرحمہ کے مزار پر حاضر ہوئے۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھا بلکہ نگاہ غلط انداز ڈالتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے عدم توجہ کا سبب دریافت کیا تو فرمایا: ''مجھے ڈر ہے کہ تمہارے انکسار کو میری نظر نہ لگ جائے۔''

ڈاکٹر صاحب کی نظر صحیح معنی میں کیمیا اثر تھی۔ ان کے تصرف کا ایک واقعہ محترم ڈاکٹر محمد اسلم فرخی صاحب کے حوالے سے یہاں درج کرتا ہوں۔ ۱۹۸۸ء میں جب ڈاکٹر صاحب کو انجمن ترقی اردو کی طرف سے نشان سپاس پیش کیا جانا تھا، ان دنوں انجمن کے صدر جناب نورالحسن جعفری تھے۔ وہ حکومت پاکستان کے معتمد مالیات کے عہدے سے سبکدوش ہوئے تھے اور ''صاحب'' آدمی تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے اعزاز میں تقریب کی اجازت تو دے دی تاہم خود اس میں شرکت سے معذرت کر دی۔ بہر حال انجمن کے دوسرے کارپردازان کے اصرار سے جلسے کی صدارت پر آمادہ ہوئے۔ مختلف تقاریر کے بعد ڈاکٹر صاحب نے حاضرین جلسہ سے خطاب فرمایا۔ آخر میں جعفری صاحب صدارتی کلمات کہنے کے لیے مائک پر آئے تو بجائے کچھ کہنے کے زاروقطار رونے لگے۔ پھر ہاتھ جوڑ کر بولے: ''حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب! مجھے معاف فرما دیجیے۔ میں آپ کے مقامات ظاہری اور مراتب باطنی سے بالکل بے خبر تھا۔'' ڈاکٹر صاحب نے اٹھ کر انہیں سینے سے لگایا اور تسلی دی تب کہیں جا کر ان کو قرار آیا۔

میں جب ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا تصور کرتا ہوں تو بے اختیار میر تقی میر کی یہ رباعی یاد آ جاتی ہے۔

ملیے اس شخص سے جو آدم ہووے
ناز اس کو کمال پر بہت کم ہووے
ہو گرم سخن تو گرد آوے یک خلق
خاموش رہے تو ایک عالم ہووے

مجھے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کا بے حد اشتیاق تھا لیکن یہ تمنا بر نہ آتی تھی۔ کراچی میں اختر شیرانی میموریل سوسائٹی کے زیر اہتمام، اختر مرحوم کے یوم وفات، ۹ ستمبر کو ایک جلسہ منعقد کیا جاتا

تھا۔ وہ لوگ ہر بار مجھے مدعو کرتے لیکن میرا جانا نہ ہوتا تھا۔ ۲۰۰۰ء کی تقریب کی اطلاع مجھے کئی ہفتے پہلے مل گئی اور میں نے اس میں شرکت کا فیصلہ کیا۔ میرے ساتھ دو عزیز یعنی ندیم محمود شیرانی (پروین بہن کا فرزند) اور عبدالقیوم بھی تیار ہو گئے۔ ہمارے روانہ ہونے سے پہلے اطلاع ملی کہ حیدرآباد کی بعض ادبی انجمنوں کے اصرار پر اس سال کی تقریب شاہ عبداللطیف بھٹائی ہال حیدرآباد میں ہوگی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ خدا ساز موقع ڈاکٹر صاحب کے نیاز حاصل کرنے کے لیے فراہم ہوا ہے۔ بہرحال ہم پہلے کراچی گئے اور وہاں سے ۹ ستمبر کی شام میرے داماد عزیزی رضااللہ کے ساتھ حیدرآباد پہنچ گئے۔ کراچی سے ایک بس اور متعدد گاڑیوں میں بہت سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ مقالات کی نشست کے بعد عشائیہ اور پھر مشاعرہ تھا۔ سامعین کی حاضری بھرپور تھی۔ رات ڈھلے مشاعرہ ختم ہوا۔ کراچی کے شرکا واپس چلے گئے مگر ہم چاروں ایک مہربان چودھری محمد اقبال صاحب کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ صبح اتوار تھا۔ میں نے رات ہی کو چودھری صاحب سے کہہ دیا تھا کہ کل ہمیں تین جگہ جانا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی زیارت کے لیے، ٹنڈو یوسف کے قبرستان میں مولانا عمران خاں کے مزار پر فاتحہ خوانی کی غرض سے اور لطیف آباد نمبر ۹ میں چچا احمد سعید خاں شیرانی سے ملاقات کی خاطر۔ انہوں نے کہا: ''دو جگہ جانا تو کوئی مسئلہ نہیں لیکن ڈاکٹر صاحب سے آپ کو ملوانا میرے بس کا روگ نہیں۔'' میں نے کہا: ''آپ ہمیں ان کی قیام گاہ پر لے جانا۔ پھر میں جانوں میرا کام۔''

صبح ناشتے سے فارغ ہو کر گاڑی میں بیٹھے تو اقبال صاحب نے کہا: ''میرے ایک عزیز مجیب الرحمٰن ڈاکٹر صاحب کے حلقے کے آدمی ہیں۔ ان کے پاس چلتے ہیں۔'' چنانچہ مجیب الرحمٰن صاحب کی دکان پر پہنچے۔ وہ کچھ مصروف تھے۔ انہوں نے بتایا: ''ڈاکٹر صاحب علیل ہیں اور آج اتوار کا دن ہے۔ اتوار کو چھٹی کی وجہ سے کراچی اور دوسرے مقامات سے کثیر تعداد میں ملاقات کے خواہشمند آجاتے تھے۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب کے خادموں نے اتوار کو ملاقات پر پابندی لگا دی ہے۔ بہرحال کوشش کرتے ہیں۔ یہ قریب ہی مکان ہے۔ آپ چلیں۔ میں پہنچتا ہوں۔'' صورتحال مایوس کن تھی۔ بہرحال گئے۔ میں نے کاغذ کے ایک پرزے پر اپنا نام لکھا اور دروازے کی گھنٹی بجائی۔ ایک صاحب آئے۔ میں نے ان کو چٹ دیتے ہوئے کہا: ''ہم لوگ شیخوپورہ سے آئے ہیں۔ ہمیں نہ تو بیعت ہونا ہے نہ کوئی حل طلب مسئلہ ہے۔ محض زیارت مقصود ہے۔ اگر

اجازت مل گئی تو سبحان اللہ ورنہ بلا اکراہ واپس چلے جائیں گے۔'' وہ شخص اندر گیا تو ذرا دیر میں ایک کشادہ پیشانی اور روشن چہرے والے صاحب نمودار ہوئے۔ میں نے قیافہ لگایا کہ یہ قبلہ ڈاکٹر صاحب کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر سراج احمد خاں ہیں۔ ابھی وہ کچھ کہنے نہ پائے تھے کہ میں نے تشویش کے عالم میں ان سے بھی وہی الفاظ کہے جو پہلے والے صاحب سے کہہ چکا تھا۔ سراج بھائی نے مسکراتے ہوئے کہا: ''تشریف لایئے، بھلا آپ کو کون روک سکتا ہے۔'' ہم لوگ داخل ہوئے۔ ڈیوڑھی کے ساتھ والے کمرے کے دروازے پر جوتوں کے چند جوڑے پڑے تھے۔ ہم لوگوں نے بھی جوتے اتارنے چاہے تو سراج بھائی نے کہا: ''آپ کو جوتے اتارنے کی ضرورت نہیں۔''

مختصر سے کمرے کے ایک سرے پر ڈاکٹر صاحب کرسی پر تشریف فرما تھے۔ آگے ایک اونچی میز تھی جس سے مقصد غالباً سجدے میں سہولت مہیا کرنا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے دائیں جانب ایک قطار میں کرسیاں تھیں جن پر تین چار سفید ریش بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ بائیں جانب اتنی ہی کرسیاں خالی تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام عرض کیا اور مصافحہ کے لیے دونوں ہاتھ بڑھائے۔ ڈاکٹر صاحب نے لجاجت آمیز لہجے میں فرمایا: ''معاف کیجیے، میں اٹھ نہیں سکتا۔'' میرا تو اس جملے ہی سے کام تمام ہو گیا مگر انھوں نے مصافحہ کرنے کے بعد دونوں ہاتھوں سے میرا سر تھام لیا اور ماتھا چوما۔ پھر میں نے اپنے ساتھیوں کا تعارف کرایا تو ڈاکٹر صاحب نے ان کے ماتھوں پر بھی بوسہ دیا۔ ہم بیٹھے تو ڈاکٹر صاحب نے پوچھا: ''بہن صاحبہ کیسی ہیں؟'' عرض کیا کہ مختلف عوارض میں مبتلا ہیں۔ فرمایا: ''ان سے کہنا کہ آپ نے مجھ پر بڑا ظلم کیا کہ خط لکھنا بند کر دیا۔ ان خطوں سے مجھے آپ سب کی خیریت معلوم ہو جاتی تھی۔'' پھر دادا جان، والد مرحوم، لاہور، ٹونک وغیرہ کی باتیں کرتے رہے۔ ایک بات میں نے خاص طور پر محسوس کی کہ ڈاکٹر صاحب گفتگو کرتے ہوئے بھی نظریں جھکائے رکھتے تھے۔

ہمارے سامنے بیٹھے ہوئے بزرگ تعجب سے دیکھ رہے تھے کہ یہ کیسے بے تمیز لوگ ہیں جو ایسی عظیم ہستی کے پاس جوتوں سمیت دندناتے ہوئے آئے اور ڈاکٹر صاحب ان پر اتنی شفقت فرما رہے ہیں۔ شاید ڈاکٹر صاحب نے ان کی حیرت کو بھانپ لیا چنانچہ ان سے مخاطب ہو کر دادا جان کے علم وفضل اور ان کے کتابوں اور سکّوں کے مجموعوں کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ اس اثنا

میں میرے قریب بیٹھے ساتھی نے سرگوشی کی: ''کیا خیال ہے آپ کا، ڈاکٹر صاحب کی بیعت نہ کر لیں؟ موقع اچھا ہے۔'' میں نے جواب دیا: ''ہم اس لائق کہاں۔ ہمارے لیے ان کی زیارت ہی بڑی بات ہے۔''

ممکن ہے اگر ہم بیعت کی درخواست کرتے تو ڈاکٹر صاحب اپنی شفقت کی بنا پر منظور فرما لیتے لیکن ذرا دیر پہلے جب ملاقات ہی غیر یقینی تھی تو میں دو بار کہہ چکا تھا کہ ہم بیعت کرنے نہیں آئے۔ اب یہ درخواست کرنے میں شرم دامن گیر تھی۔ دوسرے یہ امر بھی مانع تھا کہ ہم لوگ حیدر آباد سے کالے کوسوں دور تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو اس عالم ضعیفی میں بذریعہ مراسلت اسباق کی زحمت دینا نامناسب معلوم ہوتا تھا۔

کوئی آدھ گھنٹے کی پرلطف صحبت کے بعد، میں نے ڈاکٹر صاحب کی زحمت کے خیال سے، اجازت چاہتے ہوئے دعاؤں میں یاد رکھنے کی درخواست کی تو فرمانے لگے: ''آپ کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ میں روزانہ پچھلی رات کو آپ کے دادا جان کا نام لے کر ان کے لیے دعا کرتا ہوں۔'' میں نے عرض کیا: ''ان کی اولاد کے لیے بھی دعا کیا کیجیے۔'' فرمایا: ''میں سب کے لیے دعا کرتا ہوں۔'' واپسی پر بھی ڈاکٹر صاحب نے پہلے کی طرح ہمارے سر اور ماتھے چوم کر ہمیں رخصت کیا۔ باہر نکلے تو عزیزی رضا اللہ نے مجھ سے دریافت کیا: ''کیا آپ کی ڈاکٹر صاحب سے نظریں چار ہوئی تھیں؟'' میں نے کہا: ''نہیں۔ میں نے جتنی بار ان کے چہرے پر نگاہ ڈالی، ان کی نظر جھکی ہوئی پائی۔'' بولا: ''ایک بار میری ان سے نظریں ملیں تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے بجلی سی کوند گئی ہو۔''

شیخوپورہ واپس آکر میں نے پروین بہن سے اس بات کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگیں: ''ہاں ہاں، ایسا ہی ہے۔ جب میں حیدر آباد میں ان کے ہاں مقیم ہوتی تھی تو نو واردین کو ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضری سے پہلے خبردار کر دیا جاتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب سے گفتگو کے دوران ان سے نظریں ملانے کی کوشش نہ کریں۔'' مجھے بے اختیار غالب کا یہ حمدیہ شعر یاد آ گیا:

دیدہ وراں را کند دید تو بینش فزوں
از نگہ تیز رو گشتہ نظر توتیا[2]

ڈاکٹر صاحب کی زیارت سے دل پر ایک خاص کیفیت طاری ہوئی جس کا اثر ایک عرصے

تک باقی رہا۔ ان کی خدمت میں بار بار حاضر ہونے کو جی چاہتا تھا لیکن طویل فاصلہ حائل تھا۔ سوچا تھا کہ کسی تقریب سے کراچی جانا ہوگا تو حیدر آباد جانے کی سبیل نکلے گی۔ وائے محرومیٔ قسمت کہ یہ نوبت نہ آسکی۔

ز کاہلی تو نظیری خزان این چمنی
گہی بباغ شدی کز نشاط وارستند

اور پھر ان کے وصال کی خبر خرمن جاں پر بجلی بن کر گری۔ ہمارے ممدوح نے ۲۵ ستمبر ۲۰۰۵ء کو ۹۳ برس کی عمر میں اس عالم خاکی کو نفس مطمئنہ کے ساتھ الوداع کہا۔ اس آفتاب سلوک و معرفت اور ماہتاب علم و دانش کو جام شورو بائی پاس پر واقع ان کے قائم کردہ المصطفیٰ ٹرسٹ کے احاطے میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ ان کے جنازے میں خلق خدا کی جو کثرت تھی اس کی مثال کم کم ملتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی وفات پر میں نے دو تاریخیں کہی تھیں۔ ایک ہجری دوسری عیسوی۔ ان دونوں کے اندراج پر مرحوم کے ذکر دل پذیر کا اختتام کرتا ہوں:

(۱)

زمانے سے اٹھی جاتی ہے برکت
کہ اب فصل غلام مصطفیٰ ہے
کوئی سالِ وفات ان کا جو پوچھے
تو بس ''وصل غلام مصطفیٰ'' ہے

۱۴۲۶ھ

(۲)

اپنے حضرت غلام مصطفیٰ خان
مایۂ ناز خطۂ مہران

ذات تھی جن کی ایک منبعِ فیض
ان کی رحلت سے بزم ہے ویران
اب کہاں پائیں گے بدل ان کا
اب کسے کہہ سکیں گے مونسِ جان
اہلِ دل، اہلِ علم، اہلِ ادب
خالقِ کائنات کی برہان
گفتگو میں گلوں کی تھی خوشبو
جستجو میں الگ تھی ان کی شان
ہے بجا گر انہیں کہا جائے
عہدِ حاضر میں معرفت کا نشان
فکرِ تاریخ کی تو برجستہ
ہاتفِ غیب نے کیا اعلان
کون تھا بزمِ ذکر و فکر کی ''جان''
۵۴
ماسوائے ''غلام مصطفیٰ خان''
۱۹۵۱+۵۴=۲۰۰۵ء

حواشی

۱۔ ''(وہ) اپنی نظیر (دنیا میں) چھوڑے بغیر دنیا کو چھوڑ گئے۔''

۲۔ ''(اے ذات مطلق) تیری دید، اہل بصیرت کی بینائی میں اضافہ کرتی ہے (بلکہ) ان کی نگاہ کی برق رفتاری سے (ان کی) بصارت (بذات خود) توتیا (سرمہ) کا مقام حاصل کر لیتی ہے۔''

۳۔ ''نظیری! تیرا وجود اپنی کاہلی کے باعث اس چمن کے لیے خزاں کی حیثیت رکھتا ہے۔ (کاش) تجھے کبھی باغ میں جانے کی توفیق ہوتی تو دیکھتا کہ عیش و نشاط سے سرشار لوگ ہر قید سے نجات پا چکے ہیں۔''

کون گلی گیو ’’خان‘‘

رشید حسن خاں (۱۹۲۵ء-۲۰۰۶ء)

اردو تحقیق کے لیے ۲۰۰۵ء کو ’’عام الحزن‘‘ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ بس سال سوا سال کے عرصے میں کیسے کیسے دانش یار اور قلم کار اس عالم آب و گل سے منہ موڑ کر راہی عالم بقا ہو گئے۔ ابھی ایک کی جدائی کا زخم ہرا ہوتا تھا کہ دوسرا داغ لگ جاتا تھا۔ ۲۸ نومبر ۲۰۰۴ء کو پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب نے پہل کی، ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء کو مشفق خواجہ زمین اوڑھ کر سو گئے، ۱۵ اگست ۲۰۰۵ء کو ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے رختِ سفر باندھا، ۲۵ ستمبر کو حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کشتۂ خنجر تسلیم ہوئے، ۱۱ اکتوبر کو شان الحق حقی صاحب نے کنج لحد جا بسایا اور ۲۶ فروری ۲۰۰۶ء کو رشید حسن خاں گلستان دہر سے جنت الفردوس کو سدھارے:

اب انھیں ڈھونڈ چراغِ ’’دل سوزاں‘‘ لے کر

اس قافلۂ جادۂ فنا کے آخری مسافر محبی رشید حسن خاں میرے خاص کرم فرما تھے۔ مشفق خواجہ صاحب کی طرح ان میں بھی یہ بڑی خوبی تھی کہ اپنے مخلصین کے معمولی علمی کاموں کی تعریف و توصیف کر کے ان کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ ان کے جانے سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سر سے کسی چھتنار درخت کا سایہ ڈھل گیا ہو۔

رشید حسن خاں حد درجہ خود دار تھے اور اپنی ذات یا ذاتی معاملات کے بارے میں گفتگو مطلق نہیں کرتے تھے۔ انتہا یہ ہے کہ ۲۰۰۲ء میں جب ان کی اہلیہ کی وفات ہوئی تو انھوں نے اس کی بھی

کسی کو اطلاع نہ دی۔ کوئی دو برس بعد شمس الرحمٰن فاروقی صاحب لاہور آئے تو ان سے اس سانحہ کا پتا چلا۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے ایک طالبہ کے مقالے کی ضرورت سے خاں صاحب کو اپنے بارے میں مختصر معلومات فراہم کرنے پر آمادہ کیا۔ گویا پتھر میں جونک لگائی۔ سوال جواب کی صورت میں خاں صاحب کے یہ ارشادات ''کچھ اپنے بارے میں'' کے عنوان سے اورینٹل کالج (شعبہ اردو) کے مجلّے ''بازیافت'' (شمارہ اوّل، ۲۰۰۲ء) میں شائع ہوئے تھے۔

رشید حسن خاں، جو اردو تحقیق و تدوین میں خانخاناں کے درجے پر فائز ہیں، خود ساز آدمی تھے۔ اپنے معنوی استاد حافظ محمود شیرانی کی طرح ان کے پاس بھی اعلیٰ تعلیمی اسناد نہیں تھیں۔ انہوں نے جو مقام حاصل کیا وہ ان کی محنت اور لگن کا نتیجہ تھا۔ ان کی پوری زندگی حق جوئی اور حق گوئی میں صرف ہوئی۔ خاں صاحب کی گرفت سے تصنیف و تالیف کا کام کرنے والے گھبراتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے کڑے اور بے لاگ احتساب نے سہل انگاروں اور محنت سے جی چرانے والے مصنفین کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔ وہ نہ کسی سے مرعوب ہوتے تھے نہ کسی کی خوشامد پر آمادہ ہو سکتے تھے۔ خود ان کا کہنا ہے:

> ''سب سے بڑی دولت میری یہ ہے کہ میرا ضمیر مطمئن ہے اور یہی میرے لیے کافی ہے۔ اسی لیے یہ جو نام نہاد وابستگان ادب ہیں، ان سے کبھی سمجھوتہ نہیں کر سکا اور یہ بھی اسی کا فیض ہے کہ جس بات کو، کام کو غلط سمجھا واضح طور پر اس پر گرفت کی۔ ہندوستان پاکستان میں بیشتر لوگ مجھ سے خوش نہیں رہے مگر میں نے کسی کی خوشی ناراضی کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ میں قطعی طور پر خوش ہوں اور مطمئن۔'' (کچھ اپنے بارے میں)

حقیقت یہ ہے کہ خاں صاحب کے قدر دانوں کی تعداد ان سے شاکی لوگوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ ان کی زندگی کے آخری دو عشروں میں تو اردو دنیا میں اُن کا طوطی بول رہا تھا۔ ان کی خدمات کا اعتراف نثر کے علاوہ نظم میں بھی کیا جاتا تھا۔ یہاں ہندوستان کے معروف شاعر مخمور سعیدی (ٹونکی) کے خاں صاحب کو پیش کردہ خراج تحسین پر مبنی چار شعر درج کرتا ہوں جو ماہنامہ ''کتابی دنیا'' (دہلی) کے اگست ۱۹۹۰ء کے شمارے میں چھپے تھے:

مجمع علم و فضل ذات تری
تجھ سے مشتق ہیں سب صفات تری
درس فن تجھ سے گفتگو کرنا
ادب آموز بات بات تری
ہیں طلوعِ شعور دن تیرے
آگہی کا فروغ رات تری
سب سے ممتاز ہمسروں میں تو
مختلف سب سے کائنات تری

خاں صاحب نے ایک جگہ لکھا تھا: "تحقیق شرک برداشت نہیں کرتی۔" یہ ان کا محض قول ہی نہیں تھا بلکہ وہ اس پر عملاً کاربند بھی تھے۔ اپنی علمی مصروفیات کو زیادہ سے زیادہ وقت دینے کی خاطر انہوں نے ایک زاہد مرتاض کی طرح دنیا بھر کی دلچسپیوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی:

"میں تقریبات میں عموماً شرکت نہیں کرتا۔ رشتہ داری میں بہت کم، کبھی کبھار جاتا ہوں اور وہ بھی مجبوراً۔ چاہتا ہوں کہ مجھ سے ملنے کے لیے بھی لوگ نہ آئیں۔ وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔ اسی لیے میں نے آج تک ٹیلی فون نہیں لگوایا کہ وقت ضائع ہوگا۔ لوگ عموماً فضول باتیں کرتے ہیں، غیر ضروری اور دیر تک۔ ذہن کی ساری سوچی سمجھی باتیں نکل جاتی ہیں۔ اب میرے بڑے صاحبزادے فون لگوانا چاہتے ہیں۔ میں نے اس شرط پر اتفاق کیا ہے کہ اس کو میرے کمرے سے دور رکھا جائے گا اور مجھے وہاں نہیں بلایا جائے گا۔ جب تک کہ واقعی کوئی اہم بات نہ ہو، جو بہت کم ہوتی ہے۔"

(کچھ اپنے بارے میں)

غلام ہمت آنم کہ زیر چرخ کبود
زہر چہ رنگ تعلق پذیرد آزاد است[1]

رشید حسن خاں دسمبر ۱۹۲۵ء میں روہیل کھنڈ کے شہر شاہجہاں پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد امیر حسن خاں محکمہ پولیس میں معمولی ملازم تھے۔ روہیلوں کی نسلی خصوصیات، جس کے بنیادی عناصر بے خوفی، راست گوئی اور خودداری تھے، رشید حسن خاں کے مزاج میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ والد کے کردار کی استقامت بھی ان کو ورثہ میں ملی۔ وہ اعتراف کرتے ہیں:

> ''گھر کے اس ماحول نے جذبۂ عدم مفاہمت اور کھرے پن کو بڑھاوا دیا اور بے جھجک بات کہنے کی عادت ڈالی اور ادبی تحقیق کے عمل میں اس ابتدائی تربیت سے بہت مدد ملی...... پٹھان مصلحت اندیشی سے عموماً نا آشنا ہوتے تھے، منافقت سے اور ریاکاری سے خاصے دور رہا کرتے تھے۔ اکثریت کا احوال یہی تھا۔'' (کچھ اپنے بارے میں)

رشید حسن خاں کی عمر نو برس کی ہوئی تو باپ نے، انگریزی تعلیم سے نفرت کے باعث، انہیں مدرسہ بحرالعلوم (شاہجہان پور) میں پڑھنے بٹھا دیا۔ چند سال بعد جب ملک میں عدم تعاون کی تحریک چلی تو امیر حسن خاں نے پولیس کی ملازمت چھوڑ دی اور گھر بیٹھ گئے۔ قلیل پنشن میں گزارا کیسے ہوتا۔ نتیجہ یہ کہ رشید حسن خاں درس نظامی کی تکمیل نہ کر پائے اور صرف چودہ سال کی عمر میں حصول معاش کی خاطر فوج کی آرڈیننس کلودنگ فیکٹری میں ملازمت کر لی۔ جنگ عالم گیر کا زمانہ تھا۔ یہاں انہوں نے مزدوروں کو ان کے حقوق دلوانے کے لیے منظم کرنا شروع کیا۔ چنانچہ جنگ ختم ہونے کے بعد ۱۹۴۶ء کے آغاز میں نوکری سے جواب مل گیا۔ دو تین سال چھوٹے موٹے کام کیے۔ بعد ازاں مدرسہ فیض عام میں عربی پڑھانے کی خدمت تفویض ہوئی۔ جب کچھ عرصہ گزرا تو طلبہ کے مطالبے پر مہتمم مدرسہ نے ان سے ڈاڑھی رکھنے کا تقاضا کیا۔ زبردستی تو پٹھان جنت میں جانے پر بھی آمادہ نہیں ہوتا لہٰذا اڑ گئے۔ آخر یہ طے پایا کہ وہ درس نظامی کی جماعت کو نہیں پڑھائیں گے بلکہ منشی اور مولوی کے طلبہ کو پرائیویٹ امتحان کی تیاری کرائیں گے۔ اسی اثنا میں خاں صاحب منشی اور دبیر کامل (ہمارے ہاں ادیب فاضل) کے امتحان پاس کر چکے تھے۔ ۱۹۵۲ء میں وہ اسلامیہ ہائر سیکنڈری سکول (شاہ جہان پور) میں اردو اور فارسی کے استاد مقرر ہو گئے۔ چند سال بعد انہیں دہلی یونیورسٹی کی لائبریری میں ملازمت مل گئی اور اگست ۱۹۵۹ء میں اسی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں بطور ریسرچ اسسٹنٹ ان کا تقرر ہو گیا۔

شاہ جہان پور سے دہلی آنے کے بعد خاں صاحب کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے ساتھ ساتھ تحقیق و تدوین کی جانب توجہ مبذول کی۔ مکتبہ جامعہ، دہلی نے ان کے مرتبہ بعض متن شائع کیے۔ چنانچہ ۱۹۶۴ء میں "باغ و بہار"، ۱۹۶۵ء میں "مثنوی گلزار نسیم" اور ۱۹۶۶ء میں "مثنوی سحر البیان" چھپ کر سامنے آئیں۔ ۱۹۶۹ء میں مکتبہ جامعہ والوں نے "معیاری ادب" کے نام سے ایک اشاعتی منصوبہ کا آغاز کیا۔ اس سلسلے میں کوئی تیس کتابیں شائع ہوئیں۔ ان میں سے جہاں تک مجھے علم ہے، گیارہ خاں صاحب کی محنت کا نتیجہ تھیں مثلاً "مقدمہ شعر و شاعری"، "موازنہ انیس و دبیر"، "حیات سعدی"، "دیوان درد"، "مثنوی گلزار نسیم" (دوسری اشاعت) اور "گزشتہ لکھنؤ"۔ بعض شعرا کے کلام کے انتخاب تھے جیسے انیس و دبیر، نظیر اکبر آبادی، ناسخ اور سودا، ایک انتخاب مضامین شبلی کا تھا۔

۱۹۷۲ء تک بارہ تیرہ برس کے اس عرصے کو خاں صاحب کی تحقیقی مصروفیات کا عبوری دور کہا جاسکتا ہے کیونکہ متذکرہ بالا کاموں میں تدوین کا وہ اعلیٰ معیار نظر نہیں آتا جس کے لیے آگے چل کر خاں صاحب کا نام ضمانت قرار پایا۔ یوں بھی یہ کتابیں سستے ایڈیشنوں کی حیثیت رکھتی تھیں اور طلبہ کی ضرورت پوری کرنے کی غرض سے عجلت میں چھاپی گئی تھیں۔ خاں صاحب جیسا اپنی راہیں خود تلاش کرنے والا شخص ان مطبوعات کے معیار سے مطمئن نہیں ہوسکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عرصہ بعد انہوں نے ان میں سے بعض کتابوں کی از سر نو تدوین کی، مثلاً "باغ و بہار" (۱۹۹۲ء)، "گلزار نسیم" (۱۹۹۵ء) اور "سحر البیان" (۱۹۹۷ء)۔ خاں صاحب پرانے متون کی جستجو میں جس استقامت کا ثبوت دیتے تھے اس کا اندازہ ان سطور سے کیا جاسکتا ہے جو انہوں نے ۲۵ جولائی ۱۹۹۵ء کو پروفیسر نیر مسعود رضوی کے نام ایک خط میں لکھی تھیں:

> "صبر کی توفیق رفیق رہے تو پھر ہر نسخہ مل جاتا ہے اور ہر کام ہو جاتا ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ فلاں چیز ملی نہیں، اس میں اکثر کم توجہی کو دخل ہوتا ہے یا پھر اس کو کہ طلب صادق نہیں ہوتی اور آدمی کام کو جلد تر کرنا بلکہ بھگتانا چاہتا ہے۔ میں نے 'باغ و بہار' کے سلسلے میں ہندی مینول کی تلاش میں مکمل بیس سال تک صبر کیا اور تلاش کرتا رہا۔ آخر کو مل گیا جبکہ سب کو اس کا یقین آچکا تھا کہ وہ ناپید ہو چکا ہے۔ جب تک وہ مل نہیں گیا 'باغ و بہار'

کے متن کو مرتب نہیں کیا......"

(سہ ماہی "اردو ادب" دہلی، جنوری - مارچ ۲۰۰۷ء)

وہ حافظ محمود شیرانی کو تحقیق کا معلم اوّل اور علامہ امتیاز علی عرشی کو تدوین کا معلم اوّل تسلیم کرتے تھے۔ "باغ و بہار" کی ۱۹۹۲ء والی اشاعت مولانا عرشی کے نام معنون کرتے ہوئے یہ الفاظ ان کے قلم سے نکلتے ہیں:

"اردو میں تدوین کے معلم اوّل مولانا امتیاز علی عرشی (مرحوم) کی یاد میں
جن کی شفقت بھری باتوں، پرخلوص تنبیہوں اور مثالی تحریروں سے میں
نے تدوین کے آداب سیکھے ہیں۔" (ذرہ آفتاب تابانیم)

خاں صاحب کے دوسرے معیاری کاموں میں "فسانۂ عجائب"، "مثنویات شوق"، "مصطلحات ٹھگی" اور "کلیات جعفر زٹلی" وغیرہ شامل ہیں جو فن تدوین میں ان کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ تحقیق اور اصول تحقیق ان کا دوسرا میدان تھا۔ املا، تلفظ اور فرہنگ کے موضوعات پر بھی خاں صاحب نے نہایت وقیع کام اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ فن تنقید کے دائرے میں ان کی دو کتابوں یعنی "تلاش و تعبیر" اور "تفہیم" کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

دہلی یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر ۱۹۹۰ء میں خاں صاحب شاہ جہاں پور چلے گئے تھے اور پوری تندہی سے اپنے علمی مشاغل میں مصروف تھے کہ ۱۹۹۱ء کے موسم بہار میں دل کا سخت دورہ پڑا۔ ذیابیطس اور بلند فشار خون اس کے لوازمات میں تھے۔ صاحب فراش ہو گئے۔ ذرا طبیعت سنبھلی تو علاج کی خاطر دہلی آنا جانا شروع ہوا۔ پھر اسی سلسلے میں بمبئی کے سفر ہونے لگے۔ مہینوں وہاں قیام رہتا تھا۔ ان مصائب کے باوجود انہوں نے علمی کام کا تسلسل ٹوٹنے نہیں دیا بلکہ سچ پوچھیے تو اس کی رفتار تیز کر دی۔ زندگی کے آخری برسوں میں انہوں نے متعدد منصوبے مکمل کیے۔ بالآخر وقت موعود آپہنچا اور ایک ایسا شخص جس نے اپنی پوری زندگی علم و ادب کی خدمت کے لیے وقف کر رکھی تھی نہ جانے کتنی خواہشوں اور ارادوں کو دل میں لیے خاک کا پیوند ہو گیا۔

رشید حسن خاں صاحب سے میری صرف دو ملاقاتیں ہوئیں البتہ ان سے خط کتابت کا سلسلہ کوئی ربع صدی پر محیط رہا۔ وہ بڑی دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے علمی مضامین میں جتنی ثقاہت اور متانت ہوتی ہے اتنی ہی ان کے مزاج میں لطافت اور نفاست تھی۔ لہجہ اتنا مہذب

اور دھیما جیسے کوئی کانوں میں رس گھول رہا ہو۔ کچھ ایسا ہی فرق ان کی علمی تحریروں اور ان کے خطوط کے اسلوب میں تھا۔ اپنے مضامین کی زبان کے بارے میں وہ بڑے محتاط تھے اور نہایت مناسب اور برمحل زبان نہ صرف لکھتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی اس کی تاکید کرتے تھے۔ اس کے برخلاف اپنے مکاتیب میں وہ ایسی شیریں اور شگفتہ زباں استعمال کرتے تھے کہ لطف آجاتا تھا اور ان کے خط بار بار پڑھنے کو جی چاہتا تھا۔ ان کے خطوں سے آئندہ صفحات میں آنے والے اقتباسات میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔

خاں صاحب سے میری مراسلت کا آغاز ۱۹۸۰ء کے وسط میں ہوا۔ چند ماہ بعد اکتوبر کے پہلے ہفتے میں حافظ محمود شیرانی کی صدسالہ تقریب ولادت کے انعقاد کی تیاریاں تھیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی، مجلس یادگار حافظ محمود شیرانی کے صدر تھے۔ ان کے ایما پر جن اہل علم کو اس تقریب میں شرکت کرنے اور اظہار خیال کرنے کے لیے دعوت دی گئی ان میں رشید حسن خاں کا نام بھی شامل تھا۔ میں نے یہ خط شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے پتے پر روانہ کیا۔ موسم گرما کی تعطیلات کے باعث خاں صاحب کو خط تاخیر سے ملا۔ اس کا جواب انہوں نے ۴ اگست کو تحریر کیا۔ لکھا تھا:

''سب سے پہلے میں شکریہ ادا کرتا ہوں یادآوری کا۔ شیرانی صاحب مرحوم پر مضمون لکھنا میرے لیے باعث سعادت ہوگا۔ میں ان کو اپنا معنوی استاد سمجھتا ہوں اور میں کیا، میرا خیال ہے کہ اس نسل نے تحقیق سیکھی ہی انہی سے ہے۔ میں نے اپنے ایک مضمون میں ان کو اردو میں تحقیق کا معلم اوّل لکھا تھا۔''

بعد ازاں وقت کی تنگی کا شکوہ تھا اور یہ تاکید کہ آئندہ خط شعبہ اردو کے بجائے گائیر ہال (دہلی یونیورسٹی) کے پتے پر لکھا جائے۔

۳ ستمبر ۱۹۸۰ء کو میرا دوسرا خط ملنے پر انہوں نے اسی دن اس کا جواب لکھا:

''صاحب! مضمون ضرور لکھوں گا اور وہ آپ تک پہنچے گا بھی اور ستمبر ہی میں پہنچے گا لیکن میرے پاس کوئی ایک کتاب بھی نہیں۔ اگر آپ 'مضامین شیرانی' بھیج دیں تو عین عنایت ہو۔ عابدی صاحب کو مکمل سیٹ مل گیا۔ آپ احتیاطاً دو بنڈل بنائیں اور رجسٹرڈ بھیجیں......''

یہ مکتوب انہوں نے خانم ممتاز مرزا کے ہاتھ بھیجا جو دہلی سے کراچی آ رہی تھیں۔ میں نے اپنے سابقہ خط میں خاں صاحب کے نام کے ساتھ ''پروفیسر ڈاکٹر'' کے الفاظ لکھ دیے تھے۔ اس خط میں اس کی تردید میں یہ الفاظ لکھے:

''ہاں صاحب، میں نہ پروفیسر ہوں نہ ڈاکٹر، اس لیے اس کلمۂ خطاب سے مجھے محروم رکھیے۔ اور بہت سے اس کے مستحق ہیں۔''

خانم ممتاز مرزا نے کراچی سے خاں صاحب کا خط میرے نام روانہ کرتے ہوئے اس کی پشت پر درج ذیل عبارت کا اضافہ کیا تھا:

''ایک بات اپنی جانب سے عرض کرنا چاہتی ہوں۔ خاں صاحب بے حد خواہش مند ہیں آنے کے لیے مگر اخراجات سفر خود برداشت کرنا ان کے لیے ممکن نہیں۔ وہ یہ بات ہرگز آپ کو (یا کسی اور کو) نہ لکھیں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ رفت و آمد کے تمام اخراجات آپ لوگ برداشت کریں، تبھی وہ آسکیں گے اور میری نظر میں مناسب اور واجب بھی یہی ہے۔ گستاخی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ خاں صاحب کے خط میں اس بات کا تذکرہ نہ فرمائیں ورنہ وہ مجھ پر خفا ہوں گے۔ خاکسار ممتاز مرزا''

بات معقول تھی اور ہمارا ارادہ بھی یہی تھا تاہم بدقسمتی سے اس ارادے کا اظہار دعوتی خط میں نہ ہو پایا تھا۔ فوراً خاں صاحب کو مطلع کیا گیا لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ ''مقالات حافظ محمود شیرانی'' کی جلدیں جو خاں صاحب کو بھیجی گئی تھیں ان کے پہنچنے میں بھی تاخیر ہوئی اور یوں خاں صاحب لاہور والی تقریب میں شریک نہ ہو سکے۔ البتہ قاضی عبدالودود صاحب کے ایما پر ۳۰-۳۱ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو پٹنہ میں ہونے والے محمود شیرانی سیمینار میں وہ شامل ہوئے اور اپنا مضمون ''شیرانی کی تاریخی اہمیت'' پڑھا۔ اس کی ایک نقل انہوں نے اپنے ۲۳ فروری ۱۹۸۱ء کے گرامی نامے کے ساتھ مجھے روانہ کی۔ لکھا تھا:

''سب سے پہلے میں آپ سے معذرت خواہ ہوں کہ نہ تو سیمینار میں آسکا اور نہ 'مقالات شیرانی' کی رسید بروقت بھیج سکا۔ آپ کی عنایت کے مقابلے میں جب اپنی کوتاہیوں پر نظر کرتا ہوں تو سخت انفعال ہوتا ہے۔

اس کے باوجود کہ تاخیر حد سے زیادہ ہوئی، آپ کے حسن اخلاق اور خوئے کریمانہ سے توقع ہے کہ درخور عفو سمجھا جاؤں گا...... پٹنے کے شیرانی سیمینار میں جو مضمون میں نے پڑھا تھا اس کی نقل ہم رشتہ ہے۔ میں ممنون ہوں گا اگر آپ میری روش کے برعکس اور اپنے انداز و اخلاق کے مطابق رسید سے نوازیں گے۔"

رسید میں نے فوراً روانہ کردی لیکن مراسلت کا باقاعدہ سلسلہ قائم نہ رہا۔ ایک تو میں ۱۹۸۱ء سے ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی نگرانی میں اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے پر مصروف ہو گیا دوسرے یہ خیال بھی رہتا تھا کہ خاں صاحب کا وقت بہت قیمتی ہے اور اسے رسمی خط کتابت میں ضائع نہیں ہونا چاہیے۔ اتفاق سے دسمبر ۱۹۸۱ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) کی دعوت پر میرا دہلی جانا ہوا تو میں خاں صاحب سے ملنے دہلی یونیورسٹی پہنچا۔ خاں صاحب شاہ جہان پور گئے ہوئے تھے اس لیے ملاقات نہ ہو سکی۔ پھر ایک عرصے بعد لاہور میں ان سے بڑی ڈرامائی ملاقات ہوئی۔

جولائی ۱۹۸۷ء کا غالباً دوسرا ہفتہ تھا۔ میں معمول کے مطابق شیخوپورہ سے پنجاب یونیورسٹی لائبریری گیا جو ابھی اپنی پرانی عمارت میں تھی۔ دوپہر کا وقت اور سخت گرمی کا موسم تھا۔ اورینٹل سیکشن کی خنک اور نیم تاریک فضا میں سید جمیل رضوی صاحب اپنی کرسی پر جمے بیٹھے تھے۔ ان سے سلام دعا ہوئی تو انہوں نے اپنے دھیمے لہجے میں کچھ کہا۔ مجھے صرف اتنا سمجھ میں آیا: "...... حسن ...... صاحب آئے ہوئے ہیں۔" حسن کے لفظ سے میرا ذہن ڈاکٹر اقتدا حسن صاحب کی طرف منتقل ہوا جن سے ایک عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ میں نے ہال پر نظر ڈالی جو قریب قریب خالی تھا۔ وسط میں شمالی دیوار کے قریب ایک صاحب کتابوں کی لمبی قطار میز پر سجائے مطالعہ میں منہمک تھے۔ میز پر ایک لیمپ روشن تھا جس کی روشنی زیر مطالعہ کتاب تک محدود تھی۔ ان صاحب کا چہرہ شیڈ کی اوٹ میں تھا۔ یوں بھی میں باہر کی تیز دھوپ سے اندر آیا تھا اور آنکھیں ابھی اس نیم روشن ماحول کی عادی نہ ہوئی تھیں۔ بہرحال میں لپک کر ان صاحب کے پاس پہنچا اور بے تکلفی سے سلام کھینچ مارا۔ انہوں نے چونک کر سلام کا جواب دیا۔ مصافحے کے بعد ہمارے درمیان یہ مکالمہ ہوا:

"آپ سے تو بڑی مدت بعد ملاقات ہوئی۔ اتنے عرصے کہاں رہے؟"

''میرے خیال میں تو اس سے پہلے میری آپ سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔''

''جب آپ سمن آباد میں رہتے تھے تو میں اور خورشید یوسفی صاحب آپ سے ملا کرتے تھے۔''

''لیکن میں تو سمن آباد میں کبھی نہیں رہا۔''

''جن دنوں آپ اٹلی سے واپس آئے تھے......''

''میں اٹلی گیا ہی نہیں تو واپس آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

بہر حال اتنا کافی تھا۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کی ذہنی حالت پر شبہ ہو رہا تھا۔ میں اپنا سا منہ لے کر رضوی صاحب کے پاس آیا اور انہیں صورتحال بتائی۔ وہ مسکرا کر بولے: ''میں نے اقتدا حسن صاحب نہیں رشید حسن خاں کہا تھا۔'' یہ سنتے ہی میں پلٹا اور جا کر عرض کیا: ''معاف کیجیے، مجھے غلط فہمی ہوئی تھی۔ میرا نام مظہر محمود شیرانی ہے۔'' خاں صاحب اچھل کر کھڑے ہو گئے اور اس گرم جوشی سے مجھے گلے لگایا کہ جی خوش ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ ''نقوش'' کے محمد طفیل نمبر کی تقریب رونمائی میں آئے تھے اور اب واپسی کی تیاری ہے۔ دیر تک بڑی محبت سے باتیں کرتے رہے۔ پھر میں نے ان کے کام میں حارج ہونے کے خیال سے اجازت چاہی۔

اس کے چند سال بعد ایک بار پھر خاں صاحب کا لاہور آنا ہوا۔ تاریخ تو یاد نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ مجھے ان کا پیغام ملا تھا کہ اگلے دن نو بجے وہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کا مجموعہ کتب دیکھنے جائیں گے۔ اگر میں بھی وہاں پہنچ سکوں تو ملاقات ہو سکتی ہے۔ غرض میں کوئی دس بجے ''الوقار'' پہنچ گیا۔ چند علم دوست حضرات موجود تھے۔ دو اڑھائی گھنٹے کی دلچسپ صحبت رہی۔ وہ دوپہر کے کھانے پر کہیں مدعو تھے۔ ''الوقار'' سے اکٹھے نکلے۔ جی پی او کے چوک پر میں اترا تو خاں صاحب گاڑی سے نکلے اور معانقے کے بعد مجھے رخصت کیا۔

پہلی ملاقات کے بعد دہلی سے ان کا ۳۱ جولائی ۱۹۸۷ء کا تحریر کردہ گرامی نامہ موصول ہوا:

> ''برادرم! آپ سے ملاقات کا نقش دل پر تازہ ہے۔ بہت جی خوش ہوا آپ سے مل کر اور باتیں کر کے۔ میرے دل سے دعا نکلتی ہے کہ خدائے پاک آپ کو ہمیشہ شاد کام و کامران رکھے۔
>
> ''میں یہاں بہ عافیت پہنچ گیا تھا مگر آتے ہی بعض نجی الجھنوں میں پھنس گیا (اور یہ کوئی نئی بات نہیں، ہم سب کا مقدر ہے) یوں اس خط کے لکھنے

میں خاصی تاخیر ہوئی۔ اس کی معذرت۔

"آپ کی محبت اور آپ کے خلوص کا معترف ہوں۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ اب مجھے آپ کے تحقیقی مقالے کا انتظار ہے جو خاصے کی چیز ہوگا اور ہم سب کے لیے معلومات بخش۔

"مجھے اپنا دعا گو سمجھیے، یاد رکھیے اور میری کوتاہ قلمی اور کاہلی کو نظر انداز کرتے رہیے۔"

اس کے بعد میں وقتاً فوقتاً انہیں اپنی خیریت سے آگاہ کرنے لگا۔

فروری ۱۹۹۰ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ نے شیرانی سیمینار کا اہتمام کیا تو میرا پھر دہلی جانا ہوا۔ خاں صاحب ملازمت سے وظیفہ یاب ہو چکے تھے اس لیے ملاقات سے پھر محروم رہا۔ وہ اپنے وطن گئے ہوئے تھے۔ بعض ادھورے کاموں کی تکمیل کی غرض سے گائیر ہال کا کمرہ ابھی ان کی تحویل میں تھا۔ یوں دہلی آتے جاتے رہتے تھے۔

جون ۱۹۹۳ء میں میرے مقالے کی پہلی جلد شائع ہوئی تو میں نے ایک نسخہ ان کی خدمت میں روانہ کیا لیکن اس کی رسید تک موصول نہیں ہوئی۔ اس پر مجھے غصہ آیا اور میں نے انہیں خط لکھنا بند کر دیا۔ پھر جب ۱۹۹۵ء میں دوسری جلد چھپی تو یہ بھیجنے سے پہلے احتیاطاً دہلی کے پتے پر خط لکھا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ وہ فروری ۱۹۹۶ء میں گائیر ہال والا کمرہ چھوڑ چکے ہیں۔ کئی ماہ بعد نومبر ۱۹۹۶ء میں ان کا دہلی آنا ہوا تو حسن اتفاق سے میرا وہ عریضہ انہیں مل گیا۔ اس کا جواب انہوں نے واپس شاہ جہاں پور جا کر ۲۵ نومبر کو لکھا۔ خط کا آغاز یوں ہوتا تھا:

"یہ آپ کی محبت ہے اور پر خلوص تعلق خاطر ہے کہ آپ کے دل میں میری یاد محفوظ ہے اور یاد رکھتے ہیں اور یاد بھی کرتے ہیں۔ توقع کرتا ہوں کہ وضع داری کا یہ انداز برقرار رہے گا اور ظاہر ہے کہ ایسی فرمائش یا درخواست ہر ایک سے نہیں کی جا سکتی۔ ہر شخص پٹھان نہیں ہوتا اور ہر پٹھان بھی اپنی روایتوں کا امین نہیں ہوتا۔"

اس کے بعد مقالے کی پہلی جلد کے بارے میں لکھا تھا:

"ارے بھائی! آپ کے تحقیقی مقالے کی پہلی جلد مجھے نہیں ملی، واللہ باللہ

نہیں ملی۔ کیا ہوئی؟ معلوم نہیں۔ اسے کہیں سے میرے لیے تلاش کیجیے اور اس دوسری جلد کے ساتھ بھیجیے۔ اس لطف خاص کے لیے میں بہت ممنون ہوں گا۔ آپ کے مقالے سے وہ باتیں بھی معلوم ہو سکیں گی جن سے ہم میں سے بیشتر بے خبر ہیں لیکن جن کا علم ضروری ہے...... میں آپ کے خط کی اور مقالے کی دونوں جلدوں کی راہ دیکھوں گا۔"

خط کے آخر میں ایک دلچسپ اضافہ یہ تھا:

"اور ہاں احمد ندیم قاسمی صاحب کو بھی میرے نئے پتے سے مطلع کر دیجیے۔ میں نے ان کو تین خط لکھے، جواب ایک کا بھی نہیں ملا۔ صبر کر کے بیٹھ رہا۔ معلوم نہیں وہ مجھ غریب سے اس قدر کیوں ناراض ہیں۔ آپ ہی ذرا میری سفارش کریں۔"

میں نے عندالملاقات قاسمی صاحب سے شکوہ کیا تو پتا چلا کہ انہیں خاں صاحب کا صرف تیسرا اور آخری مکتوب کچھ عرصہ پہلے ملا ہے جس کے جواب میں ان کی علالت کے باعث تاخیر ہوئی۔ بہر حال یہ معاملہ رو براہ آ گیا۔

میں نے اپنے مقالے کی دونوں جلدیں خاں صاحب کو ارسال کر دیں۔ پیکٹ کے وزن میں گنجائش دیکھ کر شیخوپورہ کالج کے مجلّے "مرغزار" کے دو شمارے بھی ساتھ رکھ دیے جن میں میری اپنی اور بعض دوسرے ساتھیوں کی ریٹائرمنٹ کے موقعوں پر پڑھے گئے مضامین اور خود ریٹائر ہونے والوں کے خطبات شامل تھے۔ رسید کے طور پر ان کا ۲۸ دسمبر ۱۹۹۶ء کا نوشتہ ملا:

"محبّ مکرم...... آپ کا بھیجا ہوا رجسٹرڈ پیکٹ ملا...... اس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ میں مقالے کو بہت شوق اور دلچسپی کے ساتھ پڑھوں گا اور استفادہ کروں گا۔ سب سے بڑھ کر مسرت اس کی ہے (اور اس پر فخر بھی ہے) کہ آپ نے روش زمانہ کے خلاف اپنے گھر کی اس روایت کی پاسداری کی جس کا تعلق ادب و تحقیق سے بھی ہے اور احباب نوازی سے بھی۔ اب یہ 'پرانا پن' بس مرحوم ہونے ہی والا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس وقت تک میں بھی اپنے عظیم آباد سے ادھر کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔

دھوپ اب دیوار سے تیزی سے اترنے لگی ہے۔''

آخری دو فقرے پڑھ کر میری آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔ مقالہ ضخیم ہونے کی وجہ سے ابھی انہوں نے نہیں پڑھا تھا تاہم ''مرغزار'' کے پرچوں پر نظر ڈال لی تھی۔ اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

''...... بے تکلف عرض کرتا ہوں کہ یہ اچھا کالج میگزین ہے۔ ایک بات خاص کر کہنے کی ہے کہ مختلف حضرات نے اپنے ساتھیوں کے ایسے دلچسپ، ہلکے پھلکے لیکن روشن خاکے لکھے ہیں کہ پڑھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ آپ کی تقریر خاص طور پر پسند آئی۔ شگفتگی اس کی ہر سطر سے چھلکی پڑتی ہے......''

بعدازاں پرچوں میں شامل بعض منظومات کے بارے میں تجزیاتی انداز میں تعریف وتنقید کی گئی تھی۔ خط کا اختتام ان سطور پر ہوتا تھا:

''میں آپ کی نوازش کا ایک بار پھر اعتراف کرتا ہوں۔ شیرانی صاحب کو میں استاذ الاساتذہ مانتا ہوں اور اپنا معنوی استاد کہ میں نے تحقیق کے سلسلے میں بہت کچھ ان کی تحریروں سے حاصل کیا ہے۔ اس اعتبار سے آپ میرے لیے مخدوم زادے ہوئے۔ میری طرف سے پرخلوص آداب قبول کیجیے۔ اگر کبھی کبھی خطوں سے نوازتے رہیں تو خوب ہو۔ اس شہر میں جو علمی لحاظ سے ویرانہ ہے اور یہاں ایک بھی ہم نفس نہیں، بس مخلصین کے خطوں سے طبیعت بہلتی ہے۔''

ظاہر ہے کہ انہیں دہلی کی علمی محفلوں اور وہاں کے کتب خانوں سے محرومی کا احساس ستاتا ہوگا۔ میں نے سوچا کہ آئندہ ان کو برابر خط لکھتا رہوں گا اور ہلکی پھلکی تحریریں ان کا دل بہلانے کی غرض سے بھیجتا رہوں گا۔

۱۹۹۷ء کے اوائل میں وہ علاج کے سلسلے میں بمبئی چلے گئے اور وہاں کئی ہفتے قیام کر کے واپس شاہ جہان پور لوٹے اور ۴ اپریل کو میرے خط کا جواب لکھا۔ چھوٹی چھوٹی بہت سی باتیں تھیں مثلاً:

''غالب سیمینار میں آپ آنے والے تھے۔ یہ غالب انسٹی ٹیوٹ والوں نے بتایا تھا۔ اس کے بعد کچھ نہیں معلوم ہوا۔ بڑا اشتیاق تھا یہاں آپ سے

ملاقات کرنے کا۔ لاہور کی ملاقات تو بہت سرسری رہی تھی...... ایک ہلکا سا امکان اس کا ہے کہ دسمبر میں نیاز فتح پوری لیکچر کے سلسلے میں کراچی جانا ہو۔ اگر ادھر گیا تو لاہور بھی ضرور آؤں گا اور آپ کو پہلے سے مطلع کروں گا۔"

ایک اطلاع یہ بھی تھی:

"مجلہ 'سیارہ' (لاہور) کا خاص نمبر میرے پاس اب آیا ہے۔ اس میں 'تدوین کلام اقبال' کے عنوان سے میرا مضمون شامل ہے...... ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے استدراک کے ساتھ۔ یہ تحریر پہلے شاید آپ کی نظر سے نہ گزری ہو۔ اگر وہاں 'سیارہ' کا یہ شمارہ دستیاب ہو تو ایک نظر دیکھ لیجیے گا۔"

ابھی انہوں نے میرے مقالے کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ بمبئی جاتے ہوئے وہ اسے شاہ جہان پور میں چھوڑ گئے تھے۔ مجھے فکر اس بات کی تھی کہ اس میں بعض مقامات پر میں نے خاں صاحب کے نقطہ نظر سے اختلاف کیا تھا۔ مثلاً نظریہ پنجاب میں اردو کے بارے میں (ص ص ۲۲۳-۲۲۴)، شیرانی صاحب کے تدوینی اصولوں سے متعلق (ص ص ۴۸۳-۴۸۴) اور تحقیقی نتائج کی پیشکش میں موزوں اسلوب کے موضوع پر (ص ص ۱۰۰۳-۱۰۰۴)۔ میں اس تناظر میں ان کے ردعمل کا منتظر تھا۔ بالآخر اپنے یکم جون ۱۹۹۷ء کے مکتوب میں انہوں نے بدیں الفاظ مقالے کے بارے میں اظہار خیال کیا:

"مقالے کی دونوں جلدیں ملی تھیں۔ ان کی رسید میں نے بھیج دی۔ ان کو پڑھ بھی لیا۔ بے تکلف عرض کرتا ہوں کہ آپ نے توضیحات کو بہت سلیقے کے ساتھ شامل کیا ہے اور تشریحات خوب کی ہیں۔ جہاں تک حالات کا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ آپ کے مقالے ہی کو اس سلسلے میں دستاویزی حیثیت سے سامنے رکھا جائے گا۔"

بعدازاں اختلافی معاملات پر بڑے مہذب اور فراخ دلانہ انداز میں یوں اظہار رائے کیا:

"دیکھیے بھائی! علمی معاملات میں اختلاف تو ضرور رہیں گے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سب لوگوں نے یا تو پڑھنا چھوڑ دیا ہے یا غور کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اس لیے اصل بات یہ نہیں کہ اختلافات ہیں یا نہیں؟

اصل بات یہ ہے کہ اس مقالے سے معلومات میں بہت اضافہ ہوتا ہے
اور متعدد مسائل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور یہ بڑی بات ہے۔ آج کل جو
تحقیقی مقالے لکھے جاتے ہیں وہ بطور عموم کم رتبہ ہوتے ہیں اور اپنے لکھنے
والوں کی طرح بے تہ ہوتے ہیں اور خفیف الحرکاتی کے ترجمان۔ آپ
کے مقالے نے تحقیقی مقالے کی روایت کو برقرار رکھا ہے۔"

میں نے غالب انسٹی ٹیوٹ کے بارے میں کوئی بات پوچھی ہوگی۔ اس کے جواب میں لکھا تھا:

"غالب انسٹی ٹیوٹ کا احوال معلوم نہیں اور وہاں جانے کی نوبت بھی
شاید ہی آئے۔ سفراب ہوتا نہیں...... کراچی آنا بھی بس عالم خیال میں
خوشگوار لگتا ہے۔ آسکوں گا یا نہیں، اس کی بابت کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

ان یاس آمیز خیالات کے باوجود اُن کا حوصلہ قابل داد تھا اور ان کے ذہن میں تدوین کے
بعض منصوبے موجود تھے۔ اسی خط میں لکھتے ہیں:

"میں نے آج کل مثنوی میر حسن (سحر البیان) کی تدوین کا خاکہ بنایا
ہے۔ ذرا کمر سیدھی ہو جائے تو کام شروع کروں۔ کیا کوئی قدیم خطی نسخہ
یعنی ۱۲۲۵ھ تک کا آپ کی نظر میں ہے؟...... جو نسخے ترقیمے یا تاریخ سے
خالی ہوں، وہ بھی میرے لیے بے کار ہیں۔ اس سلسلے میں آپ جو مدد
کریں گے اس کے لیے بہت احسان مند رہوں گا اور بے حد شکر گزار۔"

میرا ایک مضمون "علامہ اقبال اور حافظ محمود شیرانی کے روابط" کے عنوان سے سہ ماہی
"اقبال" (جنوری ۱۹۹۷ء) میں چھپا تھا۔ میں نے یہ شمارہ خاں صاحب کی خدمت میں بھیجا۔ اس
کے بارے میں اپنے ۴ جولائی ۱۹۹۷ء کے مکتوب میں رقم طراز ہیں:

"محبی! مقالہ موصول ہوا تھا۔ بے حد دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔ اس سے
میری معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہوا۔ ان دونوں اساطین شعر و ادب
کے متعلق ایسے بعض واقعات پڑھنے کو ملے جو کہیں اور شاید ہی مل سکیں اور
آپ نے جس شگفتہ انداز میں اس کو لکھا ہے، اس کی جس قدر تعریف کی
جائے کم ہے۔ خوش ذوقی ہر جگہ کارفرما ہے مگر عبارت میں شاعرانہ انداز

کہیں نہیں اور یہ بڑی خوبی ہے......''

رامپور میں اکبر علی خاں عرشی زادہ کا دل کا دورہ پڑنے سے آناً فاناً انتقال ہوا تو خاں صاحب نے یقیناً اس کا اثر قبول کیا تاہم ان کا بلند حوصلہ متزلزل نہیں ہوا۔ اس بارے میں نیّر مسعود رضوی صاحب کو لکھتے ہیں:

''عرشی زادہ کا ایسا اچانک انتقال ہوا ہے کہ جی دہل کر رہ گیا۔ موت کا جھونکا پڑھا تھا، اس کا عمل اب معلوم ہوا۔ سچ ہے یہ دنیا فانی ہے مگر تدوین کا کام کرنے والوں کے لیے یہ سوچنا گناہ ہے۔ اس لیے میں بھی نہیں سوچتا۔ ہاں اپنے آپ خیال آجائے وہ اور بات ہے۔ صبا اکبرآبادی کا یہ شعر کل پڑھا۔ حسن تعبیر سے دل پر نقش ہوگیا:

بھیڑ تنہائیوں کا میلہ ہے
آدمی آدمی اکیلا ہے

اور نظر گورکھپوری کا یہ شعر:

میلے کی بھیڑ راس نہ آئی فقیر کو
جھولی میں چند خواب تھے جانے کہاں گرے''

(نوشتہ ۲۳ ستمبر ۱۹۹۷ء)

علاج معالجے کے سلسلے میں انہوں نے ۱۹۹۷ء کے آخر میں ایک طویل عرصہ پھر بمبئی میں بسر کیا۔ نیاز فتح پوری لیکچر میں بھی نہ آسکے۔ ۳ جنوری ۱۹۹۸ء کے میرے نام خط میں لکھتے ہیں:

''محب مکرم! آپ کا خط یہاں آگیا تھا مگر میں بمبئی میں تھا۔ کئی مہینے کے بعد واپسی ہوئی ہے۔ میرا آنا نہیں ہوسکا۔ ویزا کی مشکلیں ہمت توڑ دیتی ہیں......آپ کی یاد اکثر آتی ہے۔ میں یہاں ٹھیک ہوں جس قدر اس عمر میں اور اس دور میں کوئی مجھ جیسا شخص ٹھیک رہ سکتا ہے۔ آپ کی قسمت کا احوال کیا ہے۔ آج کل مشغلہ کیا ہے۔''

اس خط میں انہوں نے ایک فرمائش بھی کی:

"میرا بہت جی چاہتا ہے کہ آپ اختر شیرانی مرحوم کی سوانح عمری لکھ دیں۔ بہت غلط فہمیاں ہیں۔ آپ جو کچھ لکھیں گے وہ تحقیقی ہوگا اور غیر معتبر روایتوں سے خالی۔ اب یہ کام نہ ہوا تو پھر نہیں ہو سکے گا اور آپ سے بہتر اور کون لکھ سکے گا۔"

انہی دنوں خاں صاحب کو ایک اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ یہ کہ گردن پر ایک ابھار سا نمودار ہوا اور ساتھ ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا۔ انہیں ۲۱ مئی کو بمبئی جانا تھا۔ خیال تھا کہ وہیں اس نئی تکلیف کا معائنہ و معالجہ بھی ہو جائے گا۔ تاہم ۱۲ مئی کو انہیں دل کا ایک اور دورہ پڑا اور وہ صاحب فراش ہو گئے۔

مجھے یہ تشویش رہتی تھی کہ خاں صاحب کے مالی حالات تسلی بخش نہیں ہیں، اوپر سے مرض قلب کا مہنگا علاج۔ خدا جانے کیسے بسر اوقات کرتے ہوں گے۔ لیکن ان کی خودداری سے ڈر لگتا تھا اس لیے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ خود اپنی بردباری اور استقامت کے باعث اس کا اظہار کر ہی نہیں سکتے تھے۔ اب نیّر مسعود صاحب کے نام ان کے خطوط شائع ہوئے ہیں تو ایک خط پڑھ کر میرے دل پر چھریاں ہی چل گئیں۔ انہیں ۱۹۹۷ء میں بمبئی کے معالجوں نے انجیو گرافی کرانے کا مشورہ دیا تھا لیکن مالی وسائل نہ ہونے کے سبب وہ اس مشورے پر عمل نہ کر سکے۔ ۱۹۹۸ء میں جب حکومت ہند کی طرف سے ان کو نقد رقم پر مشتمل انعام دیا گیا تو اخراجات کی سبیل پیدا ہوئی۔ یہ انکشاف انہوں نے نیّر مسعود رضوی صاحب کے نام ۴ جون ۱۹۹۸ء کے مکتوب میں کیا:

"بمبئی میں جس ڈاکٹر سے مشورہ کرتا ہوں اس نے پچھلی بار انجیو گرافی کا مشورہ دیا تھا مگر وہ کیسے ہو پاتی۔ اب کے جب بمبئی جاؤں گا تو یہ کام بھی دوسرے کاموں کے ساتھ ساتھ ہو جائے گا کہ اب پہلے والی مشکل نہیں رہے گی۔ اس انعام سے سب سے بڑا فائدہ مجھے یہی پہنچے گا۔" (اردو ادب)

؎ اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

اگست و ستمبر ۱۹۹۸ء میں وہ بمبئی میں مقیم رہے۔ گردن کی گلٹی میں معالجوں کو سرطان کے

اثرات کا شبہ ہوا۔ چنانچہ اس کا علاج بھی ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ماہ ستمبر کے آخر میں وہ شاہجہان پور لوٹے۔

''مثنوی سحرالبیان'' کے بعد ان کا ارادہ ''امراؤ جان ادا'' کی تدوین کا تھا لیکن اس کے مخطوطات کی فراہمی میں حائل مشکلات کے پیشِ نظر یہ ارادہ ترک کرنا پڑا البتہ وہ ''مصطلحات ٹھگی'' اور ''دیوان جعفر زٹلی'' پر مصروف رہے۔

۱۳ ستمبر ۱۹۹۹ء کے خط میں انہوں نے اپنی نئی کتاب ''تدوین، تحقیق، روایت'' کی اشاعت اور اس کا ایک نسخہ مجھے بھجوانے کی اطلاع دی۔ انہی دنوں میں نے ''مقالات حافظ محمود شیرانی'' کی نویں جلد ان کی خدمت میں ارسال کی۔ اس کی رسید ۳۰ دسمبر ۱۹۹۹ء کے خط سے ملی:

> ''مقالات شیرانی'، جلد نہم کا تحفہ ملا۔ آپ کے اس التفات خاص اور اس یاد آوری اور اس کرم فرمائی کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ حسن اتفاق سے یہ جلد ایسے وقت میں آئی ہے جب میں 'دیوان جعفر زٹلی' کو مرتب کرنے کا خاکہ بنا رہا ہوں۔ اس میں جعفرؔ سے متعلق ایک تحریر، جسے پہلے کہیں پڑھ چکا تھا مگر اب دسترس میں نہیں تھی، شامل ہے اور اس سے مجھے مدد ملے گی۔''

پھر میری ہمت افزائی کی خاطر لکھتے ہیں:

> ''آپ جس تعلق خاطر کے ساتھ اس سلسلے کی تکمیل میں مصروف ہیں یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ آپ اگر اس کام کو نہ کرتے تو کوئی نہ کرتا۔ نام سب لیتے ہیں مرحوم کا مگر عملی طور پر کوئی کچھ کرنے کے لیے تیار نہیں۔ آپ نے دراصل ان کے خلف الصدق ہونے کا نقش مرتسم کر دیا ہے، ہم سب کے ذہنوں میں اور دلوں پر۔''

اس مکتوب کے آخر میں ٹھگوں کی زبان پر کام کرنے کے سلسلے میں سلیمن کی انگریزی کتاب ''رامسیانہ'' کی ضرورت کا اظہار کیا تھا جو انہیں نہیں مل سکی تھی۔ یہ مطبوعہ کتاب پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود تھی۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب نے خاں صاحب کو اس بات سے مطلع بھی کر دیا تاہم انہیں جلد ہی ''رامسیانہ'' کا ایک نسخہ دہلی سے دستیاب ہو گیا جس کی اطلاع مجھے ان

کے ۷ فروری ۲۰۰۰ء کے خط سے ملی۔ اس خط کے آخر میں لکھتے ہیں:

''ہاں ٹونک جانے کا دعوت نامہ کئی مہینوں سے رکھا ہوا ہے۔ جانا تو ضرور چاہتا ہوں کہ وہاں اپنے معنوی استاد اور تحقیق کے استاذ الاساتذہ کی دائمی آرام گاہ پر حاضر ہو کر ہدیۂ عقیدت پیش کر سکوں۔ شاید اپریل کے اواخر میں جانا ہو۔ موسم گرم ہو گا مگر کیا کیا جائے، مارچ میں مجھے بہ غرض علاج بمبئی میں رہنا ہے۔''

خاں صاحب اپنی شفقت کی بنا پر قریب قریب ہر خط میں مجھے سلسلۂ مراسلت جاری رکھنے کی تاکید کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اس خط کا آخری فقرہ بھی یہ تھا:

''ازراہ لطف خط فوراً لکھیے۔''

اس اثنا میں شیخوپورہ کالج کے مجلّے ''مرغزار'' کا ۱۹۹۹ء کا شمارہ آ چکا تھا۔ میں نے یہ پرچہ انہیں بھیجا تو ۲۷ اپریل ۲۰۰۰ء کو جواب میں لکھا:

''مرغزار' کا تحفہ ملا۔ اس عنایت کے لیے شکر گزار ہوں۔ اس میں آپ کی بے حد شگفتہ اور پر معنی تحریر پڑھی۔ جی بہت خوش ہوا۔ اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی۔''

۹ ستمبر ۲۰۰۰ء کو میرے والد کی ۵۲ ویں برسی کے موقع پر حیدر آباد (سندھ) کی بعض ادبی انجمنوں نے اختر شیرانی اکیڈمی کراچی کے تعاون سے لطیف آباد کے بھٹائی ہال میں ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ اس کے مقالات والے اجلاس میں، میں نے بھی ایک طویل مضمون پڑھا جو بعد میں احمد ندیم قاسمی صاحب نے مجلس ترقی ادب (لاہور) کے رسالے ''صحیفہ'' (اپریل، جون ۲۰۰۱ء) میں چھاپ دیا۔ چونکہ خاں صاحب مجھے اختر صاحب پر کتاب لکھنے کا مشورہ دے چکے تھے اس لیے میں نے اس مضمون کے عکس ان کی خدمت میں روانہ کیے۔ اس کی رسید میں ۱۲ جولائی ۲۰۰۱ء کو رقم طراز ہیں:

''آپ کے اس لطف خاص کے لیے منت پذیر ہوں۔ اختر صاحب والا مضمون پڑھ کر میری معلومات میں اضافہ ہوا اور آپ کے حسن بیان کا ایک بار پھر قائل ہو گیا۔ سبحان اللہ!''

آخر میں ان کے محبت بھرے جذبات سے مملو یہ جملے تھے:

''آپ جس خلوص اور اپنائیت کے ساتھ یاد کرتے ہیں اور یاد رکھتے ہیں اس کا نقش دل پر مرتسم ہے۔ اب ایسے یاد رکھنے والے اور لحاظ خیال کرنے والے کم سے کم ہیں۔ آپ کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے......''

اس کے بعد پاک بھارت تعلقات کی خرابی کا ایک طویل دور آیا جس میں کم و بیش اڑھائی سال تک ڈاک کی ترسیل بھی ممکن نہ رہی۔ ادھر خاں صاحب کی بیماریاں شدت پکڑتی گئیں۔ ان کے معالجوں نے انہیں سفر کرنے سے بلکہ زیادہ چلنے پھرنے سے بھی منع کر دیا۔ نیز پیس میکر لگوانے کا مشورہ دیا۔ اس آخری بات پر انہوں نے عمل نہیں کیا اور دواؤں پر اکتفا کرتے رہے۔ ممکن ہے یہاں بھی ان کی مالی مشکلات آڑے آئی ہوں۔ اسی عرصے میں ان کے تین شاہکار یعنی ''مصطلحات ٹھگی''، ''کلاسیکی ادب کی فرہنگ'' (جلد اوّل) اور ''زٹل نامہ'' شائع ہوئیں۔ ''زٹل نامہ'' کے کچھ نسخے امریکہ میں مقیم ایک علم دوست شخصیت الحاج عبدالوہاب خاں سلیم کے توسط سے لاہور میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کو ملے جن میں سے ایک پر میرا نام بھی تھا۔

خدا خدا کر کے ڈاک کا سلسلہ جاری ہوا تو میں نے خاں صاحب کو عریضہ لکھا جس کا جواب انہوں نے ۴ مارچ ۲۰۰۴ء کو دیا۔ لکھا تھا:

''ایک زمانے کے بعد آپ کا خط پا کر جو مسرت ہوئی اس کو بیان نہیں کر سکتا۔ خدا آپ کو خوش رکھے کہ وقت ما خوش کر دی۔ کتاب آپ تک پہنچ گئی۔ اس سے اطمینان ہوا۔ اب اس کے پڑھنے والے کم ہی نہیں، بہت کم رہ گئے ہیں اور یہی احوال ہے ایسی دوسری کتابوں کا۔ بہر طور مجھ جیسے لوگ اور کچھ تو کر نہیں سکتے سو یہی کیے جاتے ہیں...... ہاں نویں جلد مل گئی تھی۔ 'زٹل نامے' میں ایک جگہ اس کا حوالہ بھی دیا ہے میں نے۔ خدا کرے کتاب آپ کو پسند آ جائے۔ بقول آپ کے، شمالی ہند میں لسانی ارتقا کی یہ دستاویزی یادداشت ہے۔ یوں شاید کام کی کتاب ثابت ہو۔ مقالات کی آخری جلدیں جب بھی چھپیں مجھے حسب سابق یاد رکھیے گا۔''

اپنی صحت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرا احوال یہ ہے کہ دوبار حملۂ قلب سے دوچار ہونے کے بعد بے حال ہو کر رہ گیا ہوں۔ پروسٹیٹ کی تکلیف الگ۔ گھٹنا بے کار سا ہو گیا ہے۔ یوں چل نہیں پاتا بس چند قدم چل لیتا ہوں مگر ابھی ہاتھ کو بھی جنبش ہے اور آنکھوں میں بھی دم ہے اور قلم کی سیاہی (روشنائی) بھی خشک نہیں ہو پائی ہے۔ یوں سب کچھ برقرار ہے اور بہتر ہے، اور چاہیے بھی کیا (آپ بھی تو ہمارے قبیلے ہی کے فرد ہیں)۔''

طرح طرح کے امراض میں گھرے ہونے کے باوجود خاں صاحب کی استقامت اور اپنے مقصد سے لگن قابل تحسین تھی۔ کراچی میں مشفق خواجہ صاحب بھی ان دنوں علیل تھے۔ ان کے بارے میں لکھا تھا:

''مشفق خواجہ کا حال احوال برابر معلوم ہوتا رہتا ہے۔ خدا کرے جلد تر وہ صحت کلی حاصل کر لیں۔ ان کا دم بھی غنیمت ہے۔''

خط کے اختتام پر خدا حافظ لکھ کر جانے کیا خیال آیا کہ اس کے بعد قلابین میں ان سطور کا اضافہ کیا:

''اللہ حافظ نہیں کہ اس میں نسائی صوتیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ خدا جانے وہاں والوں کے دل میں کیا سمائی ہے کہ ایک عمدہ کلمے کو بدل ڈالا۔ اہل پنجاب کے لہجے سے تو اس کی توقع ہو نہیں سکتی تھی۔ کیا لہجے کی کارفرمائی کی اب وہاں کوئی حیثیت باقی نہیں رہی؟ تو پھر خدا کی پناہ کو بھی اللہ کی پناہ کہنا چاہیے تاکہ نزاکت آواز کی تکمیل ہو جائے۔''

دراصل لہجے کی صلابت کا لحاظ بھی خاں صاحب کے پختون پس منظر کا تقاضا تھا۔

اتنے عرصے بعد خاں صاحب کا یہ دلچسپ خط آنے پر مجھے خوشی تو ہوئی لیکن ساتھ ہی ان کی صحت کی دگرگوں حالت پر تشویش بھی ہوئی لیکن بندگی بے چارگی کے مصداق سوائے دعا کے کیا کیا جا سکتا تھا سو وہی کرتا رہا۔

میں نے مشفق خواجہ صاحب کی فرمائش پر عبدالرشید ٹھٹھوی کی تالیف ''معربات رشیدی''

کی تدوین نو اور اردو ترجمہ کیا تھا۔ اس کا قصہ یہ تھا کہ پروفیسر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم نے یہ رسالہ ترتیب دے کر طبع کرایا تھا۔ پھر انہوں نے مقدمہ کی تیاری میں اتنی دیر کی کہ پریس والوں کی لاپروائی سے مطبوعہ متن ضائع ہو گیا۔ صدیقی صاحب کی وفات کے ایک عرصہ بعد اس گم شدہ متن کے چند نسخے نیز مقدمہ کی تیاری پر مشتمل کچھ بکھرے ہوئے نامکمل کاغذات مرحوم کے فرزند محمد مسلم صدیقی صاحب نے رشید حسن خاں صاحب کی تحویل میں دے دیے۔ انہوں نے انہیں سنبھال کر رکھا۔ مسلم صدیقی صاحب کے انتقال کے بعد جب پاکستان سے مسلم صدیقی صاحب کے بھتیجے سہیل صدیقی کا ادھر جانا ہوا تو خاں صاحب نے وہ تمام چیزیں ان کے حوالے کر دیں۔ انہوں نے واپسی پر ان چیزوں کو خواجہ صاحب کے سپرد کر دیا اور پھر اس کام کا قرعۂ فال میرے نام نکلا۔ بالآخر تکمیل کے بعد خواجہ صاحب نے اسے ادارۂ یادگار غالب (کراچی) کے زیر اہتمام ۲۰۰۳ء میں شائع کیا اور حسب معمول اس کا ایک نسخہ خاں صاحب کو بھیج دیا۔

میں نے خاں صاحب کے متذکرہ بالا خط کا جواب لکھتے ہوئے برسبیل تذکرہ ان سے پوچھ لیا کہ کیا انہیں ''معربات رشیدی'' مل چکی ہے۔ اس کے جواب میں ۲۷ مارچ ۲۰۰۴ء کو تحریر کردہ اپنے مکتوب میں ابتدائی باتوں کے بعد لکھتے ہیں:

> ''ارے صاحب! 'معربات رشیدی' کا نسخہ مجھے مل گیا تھا۔ ایسا عمدہ کام کیا ہے آپ نے کہ بے ساختہ جی چاہا کہ اس پر کاش میرا نام لکھا ہوتا! یہ کام میں نے کیا ہوتا! جی خوش ہو گیا۔ منتشر اوراق کو ایسی اچھی شکل میں منتقل کر دینا کمال نہیں، کرشمہ ہے۔ زندہ باد۔
>
> ''ضمنی طور پر ایک فیصد ثواب کا مستحق میں نے اپنے آپ کو بھی ٹھہرا لیا کہ ان اوراق کو بحفاظت رکھا اور پھر متعلقہ فرد تک پہنچا دیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر کچھ نہ ہوتا۔ کاش صدیقی صاحب زندہ ہوتے!''

خاں صاحب جیسے پائے کے آدمی کا یہ انداز تحسین کسی منتہی کے لیے بھی باعث افتخار ہو سکتا تھا چہ جائے کہ مجھ جیسے مبتدی کے لیے۔ کلاہ گوشۂ دہقاں بہ آفتاب رسید والا مضمون تھا۔ تعریف کا یہ وہی انداز تھا جس میں مولانا حسرت موہانی نے احمد ندیم قاسمی صاحب کے ایک شعر کی داد دی تھی۔ محولہ بالا اقتباس کے آخری جملے خاں صاحب کی بچوں جیسی معصومیت اور مسرت کے

آئینہ دار ہیں۔

خاں صاحب کے خط میں اس کے بعد آنے والی سطور بھی نہایت دلچسپ اور فکر انگیز ہیں:

"بھائی! یہ جو بڑے لوگ تھے، ان کے یہاں علم کی زیادتی نے ایک گوشہ مراق کے لیے بھی بنا دیا تھا۔ کسی نہ کسی شکل میں یہ بہتوں کے یہاں کارفرما رہا ہے۔ صدیقی صاحب کا احوال بھی یہی تھا۔ نتیجتاً کسی کام کو مکمل نہیں کر پاتے تھے۔ قاضی صاحب کے یہاں اس کی ایک دوسری صورت تھی۔ تکمیل ان کے یہاں بھی راہ دیکھتی رہ جاتی تھی۔ نو من تیل جمع ہوتا ہی نہیں تھا جو رادھا ناچے۔ کیسا یگانہ روزگار شخص اور کیسے ناتمام کاموں میں پوری عمر گزار دی۔ ہاں ہم جیسے معنوی تلامذہ کی تربیت ضرور کر گئے۔ وہ روایت ساز بھی تھے، ایک اعتبار سے اور توسیع روایت کا مشکل کام بھی کیا انہوں نے (روایت ساز تو اصلاً شیرانی صاحب تھے) مگر ذہن میں خوف رہتا تھا کہ لوگ اعتراض کریں گے اور یوں ایک ذہنی حصار میں پناہ گزیں رہتے تھے۔ ہاں صاحب! آپ تو بڑی شگفتہ نثر لکھتے ہیں۔ کیوں نہ بزرگان تحقیق کے اس مراق پر ایک انشائیہ نما تحریر لکھ دیں، عمدہ موضوع ہے۔ دلچسپ تحریر مرتب ہو جائے گی۔ وہاں بھی تو ایسے ایک دو بزرگوار رہے ہوں گے۔"

یہ کوثر میں دھلی ہوئی زبان اور یہ سحر کار اسلوب سہل ممتنع کہلانے کا مستحق ہے۔ اس کے باوجود وہ سراہ رہے ہیں میرے انداز تحریر کو جسے ان کی عظمت کے سوا اور کیا نام دیا جا سکتا ہے۔

بعد ازاں اپنی صحت کے بارے میں بدیں الفاظ اطلاع دیتے ہیں:

"میرا احوال تولہ ماشہ رہتا ہے۔ ابھی سانس باقاعدہ چل رہی ہے اور اچانک دل کی رفتار بگڑ گئی۔ ڈاکٹر نے گھر سے باہر نکلنے پر سختی کے ساتھ پابندی لگا دی ہے۔ بایاں گھٹنا بے کار سا ہو گیا ہے، یوں بھی چل نہیں پاتا، بس قلم چلے جاتا ہے اور یہاں میں بے اختیار ہوں۔ دوسرے

ہارٹ اٹیک کے بعد سے احوال ٹھیک نہیں رہتا، اور ٹھیک رہے گا بھی کب تک، ۷۰ برس ہونے کو آئے ہیں، بس اب ختم سفر میں کچھ ہی دیر ہے، خیر اسے بھی دیکھ لیں گے۔ پٹھان کا پوت نہ ڈرتا ہے نہ دبتا ہے، ہاں بھرنے بھگتنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اس آنے والے بزرگوار سے بھی نپٹ لیا جائے گا اور نپٹ کیا لیا جائے گا، وہ کارروائی تو یکطرفہ ہوگی۔ تو وہ بھی ہو جائے۔"

موت کے بارے میں خاں صاحب کے تیور پٹھانوں کی نفسیات کے عین مطابق تھے۔ اس نثرپارے میں امراض کی کشاکش، اپنے کام سے لگن اور شخصی انا کا بڑا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے "زٹل نامہ" میں کمپوزنگ کی اہم اغلاط کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کی درستی کی ہدایت کی ہے۔ مکتوب کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے: "خدا کرے آپ بہ عافیت ہوں اور کرکٹ نہ دیکھ رہے ہوں۔"

خاں صاحب کا میرے نام آخری مکتوب ۱۸ اپریل ۲۰۰۴ء کا نوشتہ ہے۔ یہ خط میرے لیے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ یوں کہ اس میں انہوں نے میری خوب سرزنش کی ہے۔ اس مناسبت سے یہ مجھے ان تمام مکاتیب سے زیادہ عزیز ہے جن میں وہ تعریفوں سے میری ہمت افزائی کیا کرتے تھے تاہم اس خط کے مندرجات پیش کرنے سے پہلے اس قضیے کا پس منظر بتانا ضروری ہے۔

سب جانتے ہیں کہ خاں صاحب نے اردو املا کے موضوع پر کتنا کام کیا ہے اور صدیوں سے ہماری املا میں شامل اغلاط کی تصحیح پر کتنا زور دیا ہے۔ میری کمزوری یہ ہے کہ ان تمام خامیوں کا احساس ہونے کے باوجود میرا قلم، شاید عجلت کے باعث اسی املا پر کاربند رہتا ہے جس کی شروع سے عادت پڑی ہوئی ہے۔ مشفق خواجہ صاحب دوستانہ انداز میں مجھے ٹوکتے تھے مگر وہ کہتے ہیں نا کہ سوتے کو تو جگایا جا سکتا ہے، جاگتے کو کون جگائے۔ میں تفنناً خواجہ صاحب سے کج بحثی بھی کر لیتا تھا اور وہ مجھے ناقابل اصلاح سمجھ کر چپ ہو جاتے تھے۔ لیکن خاں صاحب کا معاملہ دوسرا تھا۔ میرا ماتھا تو اسی وقت ٹھنکا تھا جب ۲۰۰۱ء کے وسط میں انہوں نے خواجہ صاحب کو ہدایت کی تھی کہ وہ خاں صاحب کی املا کے موضوع پر تحریر کردہ بعض کتابیں مجھے بھجوائیں۔ بایں ہمہ خاں صاحب

نے بڑے صبر کا مظاہرہ کیا اور طویل عرصے تک میری روایتی املا کو برداشت کرتے رہے۔ پر بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی آخر میری شامت آ ہی گئی۔

زیرِ نظر خط کا آغاز یوں ہوتا ہے:

''خط کل ہی ملا۔ شکر گزار ہوں۔ کئی دن سے طبیعت ٹھیک نہیں۔ مفصل خط آئندہ۔''

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پھر وہ مجھ سے دلی اُنس کی بنا پر رہ نہ سکے اور میری اصلاح کا فریضہ ادا کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس خط کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں بڑے مہذب اور محبت بھرے انداز میں میری توجہ اصل موضوع کی طرف مبذول کرائی ہے:

''بھائی! میں آپ کی بہت قدر کرتا ہوں، بہت عزیز رکھتا ہوں، بہت مانتا ہوں اور بہت قائل ہوں۔ یوں جی چاہتا ہے کہ جب آپ مجھے خط لکھیں تو اس طرح کہ ہر لفظ اپنی جگہ نگینہ ہو یعنی صورتاً۔ لفظوں کو عبارت میں کھپانے کا سلیقہ آپ کو وراثت میں ملا ہے اور اس پر جتنا فخر اور ناز کیا جائے کم ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر یہ بھی ہو کہ عروسِ جمیل کے لباسِ حریر پر کوئی سلوٹ نہ ہو تو خوب تر ہو۔''

اس کے بعد دوسرے حصے میں، جو طویل ہے، میری املا میں موجود عمومی اغلاط پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے اہم اقتباسات میں مختصراً درج کرتا ہوں:

''آپ ہمیشہ انشااللہ لکھتے ہیں۔ اس خط میں بھی یہی ہے۔ میں ان شاءاللہ لکھنا بہتر سمجھوں گا۔ یہاں ہمزہ جزوِ فعل ہے (شاءَ) الف لام تو ترکیبی ہے......''

''دیئے (د ی ء ے)۔ یہ تین حرفی لفظ ہے (د ی ے) دیے۔ اسی طرح کیے، جیے، پیے، سیے، لیے، حرفِ اوّل مکسور ہو تو اس کے بعد لازماً 'ے' آئے گی...... مفتوح ہوگا تو ہمزہ آئے گا۔ نئے، گئے۔''

''رائے۔ صحیح راے...... رائے تو چار حرفی لفظ بن گیا۔ جائے، لائے، پائے چار حرفی لفظ ہیں۔ ہاے، واے، راے، چاے وغیرہ تین حرفی لفظ

ہیں۔''

''شخصیات، ضیاع...... بھائی! ص اور ض کے ساتھ شوشہ جزوحرف ہے۔ دوسرے حرف کا جوڑ کا شوشہ اس کے بعد آئے گا۔ صبا، صیاد، صبح، ضیاع، شخصیات۔''

''انہیں...... برادر! یہ تو بڑے غضب کی بات ہے 'انھیں' لکھیے، میر کا مصرع: سرہانے میر کے کوئی نہ بولو...... یہ بحر سے خارج ہوگیا، بے وزن ہوگیا۔ سرھانے لکھیں گے تب وزن میں آئے گا۔ یہی احوال انہیں اور انھیں کا ہے۔''

خط کا تیسرا حصہ بھی مجھ پر ان کی شفقت اور محبت کے جذبات سے مملو ہے:

''آپ کہیں گے کہ اچھے ناصح ناداں سے پالا پڑا ہے، کہے چلے جاتے ہیں، نہ خیال نہ لحاظ۔ یوں معذرت طلبی کے ساتھ اس تحریر کو ختم کرتا ہوں۔ کبھی کبھی بے اختیار جی چاہتا ہے کہ جو بہت عزیز ہو، اس سے سب کچھ کہہ دیا جائے، سو یہ اسی بے اختیاری کے عالم میں لکھا گیا۔ اسے کالعدم سمجھیے۔ میرے اندر بھی بعض بری عادتیں جاگزیں ہیں۔ یہ بھی انہی میں سے ایک ہے۔ مزید معذرت۔ خط لکھیے۔''

میں نے انہیں اس کے جواب میں اظہار تشکر پر مبنی عریضہ لکھا لیکن جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا، یہ میرے نام ان کا آخری خط تھا۔ پھر ان کی طبیعت گرتی چلی گئی اور بالآخر ۲۶ فروری ۲۰۰۶ء کو نہ جھولی میں بچے ہوئے خواب باقی رہے نہ خواب دیکھنے والا۔ سب کچھ مٹی میں مل گیا۔ خاں صاحب کی وفات کی تفصیلات تو مجھے معلوم نہیں تاہم مجھے یقین ہے کہ دم واپسیں اگر ان کے ہوش وحواس قائم تھے تو انہوں نے کمال حوصلے اور بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ فرشتۂ اجل کا استقبال کیا ہوگا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کے رخصت ہونے کے بعد جب میں کچھ لکھتا ہوں تو املا کے بارے میں مرحوم کے مقرر کردہ اصولوں کا خاص خیال رکھتا ہوں کیونکہ مجھے علم ہے کہ اب وہ شخص دنیا میں نہیں رہا جو مجھ سے دلی محبت کی بنا پر میری اصلاح کا خواہش مند رہتا تھا۔

آخر میں وہ قطعہ تاریخ درج کرتا ہوں جو میں نے ان کی وفات کی خبر سن کر موزوں کیا تھا:

آخر کو چھلک گیا ایاغ تحقیق
تاراج کیا خزاں نے باغ تحقیق
تحقیق کی آبرو تھی اس کے دم سے
اب کس کو رشید سا دماغ تحقیق
جب "دم" (۴۴) دیا "آہ" (۶) بھر کے ہاتف نے کہا
"افسوس بجھا آج چراغ تحقیق"

۲۰۴۴-۴۴+۶=۲۰۰۶ء

حاشیہ

۱- ''میں اس شخص کی ہمت کا غلام ہوں جو اس نیلے آسمان کے نیچے ہر اس چیز سے آزاد ہے جس سے کسی تعلق کا شائبہ ہو سکتا ہے۔''

سانجھی بھئی چودیس

احمد ندیم قاسمی (۱۹۱۶ء-۲۰۰۶ء)

۱۹۵۷ء میں انگریز کمپنی کے خلاف برعظیم کے باشندوں کی جدوجہد (۱۸۵۷ء) کو سو سال پورے ہوئے تو اس کی یاد منانے کا موقع تھا۔ میں ان دنوں جامعہ پنجاب میں ایم اے (تاریخ) کا طالبعلم تھا۔ اس صد سالہ یادگار کی تقریبات منانے میں حکومت پاکستان نے بڑی سرد مہری کا مظاہرہ کیا کیونکہ یہاں کے حکمران ان لوگوں کے اخلاف تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں جی جان سے انگریزوں کی خدمت کی تھی۔ ہمارے ایک استاد نے کلاس میں لیکچر دیتے ہوئے آزادی خواہوں کی تمام مساعی کو اس بنا پر رد کر دیا کہ اس زمانے میں ہمارے ہاں قوم پرستی کا احساس ہی پیدا نہ ہوا تھا۔ اس رویے پر مجھے دکھ ہوا، چنانچہ میں نے اس موضوع پر ایک مفصل مضمون لکھ ڈالا۔ پھر اس کو چھپوانے کا خیال آیا۔ ان دنوں احمد ندیم قاسمی صاحب روزنامہ ''امروز'' کے مدیر تھے۔ ان کا نام شروع سے کان میں پڑتا رہا تھا بلکہ ان کی ابتدائی دو کتابیں ''دھڑکنیں'' اور ''بگولے''، جن پر انہوں نے ۶ جون ۱۹۴۲ء کو دستخط کیے تھے، گھر میں موجود تھیں اور آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ گرمی کی چھٹیاں ہونے والی تھیں لہٰذا میں نے وہ مضمون ڈاک کے ذریعے مدیر ''امروز'' کے نام ارسال کر دیا اور خود لاڑکانہ روانہ ہو گیا جہاں کچھ دنوں بعد مجھے قاسمی صاحب کا ''امروز'' کے پیڈ پر ۵ جولائی ۱۹۵۷ء کا نوشتہ موصول ہوا۔ لکھا تھا:

''برادر عزیز و مکرم، سلام مسنون۔ حیرت ہے کہ آپ لاہور میں مقیم رہے مگر ایک بار بھی ملاقات نہ ہوئی۔ بہرحال آپ نے یاد کیا۔ اس کے لیے

میں آپ کا تہ دل سے ممنون ہوں...... مجھے اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہا کیجیے۔ آپ کو شاید اس امر کا پورا پورا احساس نہیں کہ میرے دل میں اپنے اختر کے تمام متعلقین کی کتنی عزت ہے۔

آپ کا مخلص احمد ندیم''

تعطیلات کے اختتام پر جب میں لاہور آیا تو ''امروز'' کے دفتر جا کر ان کی خدمت میں حاضری دی۔ اس طرح ٹوٹ کر ملے کہ میں حیران رہ گیا اور پھر یہ تعلق خاطر مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔

آئندہ سال ۱۹۵۸ء میں ایم اے (تاریخ) کے فائنل امتحان سے فراغت پا کر میں پھر لاڑکانہ چلا گیا۔ نتیجہ نکلا تو ۹ اکتوبر کو انہوں نے مجھے کامیابی پر مبارکباد کا خط روانہ کیا، اس کے آخر میں لکھا تھا:

''مجھے اپنی زندگی سے وابستہ سمجھیے کہ بے لوث اور پر خلوص تعلقات کے بارے میں، میں بہت ضدی قسم کا انسان ہوں۔ مجھے آپ کے مستقبل سے بہت گہری دلچسپی ہے، اس لیے اگر میں کسی امداد و تعاون کے قابل سمجھا جاؤں تو یہ میری خوش نصیبی ہوگی۔ کبھی لاہور آئیں تو مجھ سے ضرور مل لیا کیجیے کہ یہ آپ کا احسان ہوگا۔

آپ کا بھائی ندیم''

مبارکباد کے جواب میں، میں نے انہیں شکریہ کا خط لکھا تو ۱۹ اکتوبر کے مکتوب میں پھر لکھتے ہیں:

''مجھے ہمیشہ اپنے اتنا ہی قریب سمجھیے جتنا آپ کا کوئی قریبی عزیز ہو سکتا ہے، اس لیے کہ آپ کے مجھ پر اور میرے آپ پر چند حقوق ہیں اور میرے دل میں آپ کے سارے گھرانے کا احترام ہے۔''

جب ایوب خاں کے دور میں حکومت نے پروگریسو پیپرز پر قبضہ جمایا تو قاسمی صاحب نے ''امروز'' کی ادارت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس پر انہیں گرفتار کر لیا گیا اور جب کچھ عرصے بعد رہا ہوئے تو معاشی اعتبار سے فارغ تھے۔ ۱۹ مئی ۱۹۵۹ء کو نسبت روڈ والے مکان سے لکھتے ہیں:

''پیارے بھائی۔ سلام محبت۔ میں ان دنوں قطعی بیکار ہوں...... بزنس میرے بس کا روگ نہیں ورنہ کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کر دیتا۔ بہرحال...... حالات سے میں نے بہت کم شکست کھائی ہے، اس لیے میری جدوجہد ہمیشہ جاری رہتی ہے...... آپ پر اتنے بڑے اور اتنے معزز گھرانے کی ذمے داریاں ہیں اور مجھے بے انتہا حیرت (اور مسرت) ہوتی ہے کہ آپ کتنی استقامت سے ان ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہوتے رہتے ہیں۔ خدا آپ کو مزید برکت دے۔''

سچ پوچھیے تو زندگی کے مسائل کے حل کی جدوجہد میں وہ جس طرح میری ہمت بندھاتے تھے اس سے مجھے بڑا سہارا ملا۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء سے اگست ۱۹۵۹ء تک کا عرصہ میں نے ٹونک میں چھوڑی ہوئی آبائی جائیداد کے کلیم کی ایڈجسٹمنٹ وغیرہ کی مصروفیات میں گزارا اور ستمبر ۱۹۵۹ء میں لاہور آ کر اورینٹل کالج میں ایم اے (فارسی) کے دوسرے سال کی کلاس میں داخلہ لے لیا۔ میں وولنر ہاسٹل میں رہتا تھا۔ ماہ ستمبر کے اختتام پر مجھے سخت بخار نے آلیا۔ یکم اور پانچ اکتوبر کو وہ مجھے ڈاکٹر یحییٰ فاروقی صاحب کے مطب (بالمقابل میو ہسپتال) لے کر گئے۔ اسی موقع پر میری بڑی بہن پروین اختر صاحبہ سے، جو عمر کوٹ میں رہتی تھیں، ان کی خط کتابت کا آغاز ہوا۔ میرے تندرست ہونے کے بعد ان کا یہ معمول ہو گیا کہ ہفتے عشرے میں عصر یا مغرب کے بعد میرے پاس تشریف لاتے، گھنٹہ پون بیٹھتے اور چائے کی ایک پیالی پیتے۔ ایک دن آئے تو کلائی پر گھڑی نہیں تھی۔ میں نے پوچھا تو بتایا: ''صبح غسل کرتے ہوئے اتاری تو فرش پر گر کر شیشہ ٹوٹ گیا۔ ہائی کلاس واچ کمپنی میں مرمت کے لیے دے آیا ہوں۔'' یہ رولیکس کی آئسٹر پرپیچول آٹومیٹک گھڑی تھی جو انہوں نے چند سال قبل ایک وفد کے ساتھ چین جانے پر ہانگ کانگ سے خریدی تھی۔ اتفاق سے میرے پاس رولیکس پریسیشن کی چابی والی طلائی گھڑی تھی۔ میں نے وہ اتار کر پیش کر دی کہ آپ کو وقت دیکھنے میں دقت ہوگی۔ کہنے لگے: ''اور آپ کیا کریں گے؟'' میں نے کہا: ''مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ دن کو کالج کی گھنٹی اور رات کو قریبی گرجے کا گھڑیال میرے لیے کافی ہیں۔'' اگلے ہفتے آئے تو جیب سے میری گھڑی نکال کر دی۔ ساتھ ہی بولے: ''مظہر بھائی، آپ کی گھڑی تو بڑی قیمتی ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا: ''آپ کو کس نے

بتایا؟'' کہنے لگے: ''جب میں ہائی کلاس والوں سے اپنی گھڑی لے کر باندھنے کی غرض سے آپ کی گھڑی اتارنے لگا تو ان کے منیجر نے مجھے کہا، آپ وہ گھڑی اتار کر یہ گھڑی باندھ رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا: ''کیوں؟ اس میں کیا خاص بات ہے؟ یہ تو چابی سے چلتی ہے۔'' بولا: ''اس سے کیا ہوتا ہے؟ اس کی قیمت میں آپ جیسی تین چار گھڑیاں آسکتی ہیں۔''

کیا محبت کے آدمی تھے۔ میری اس چھوٹی سی بات سے اتنے متاثر ہوئے کہ یہ قصہ پروین بہن کو لکھ بھیجا۔ ان کا جواب آنے میں تاخیر ہوئی تو ۷ فروری ۱۹۶۰ء کو یاد دہانی کے خط میں لکھتے ہیں:

> ''اس دوران میں تمھیں ایک اور خط بھی لکھا تھا جس میں اپنی گھڑی کے ٹوٹنے اور عزیزی مظہر کے ایک نہایت پیارے اقدام کا ذکر تھا...... وہ مجھ سے اتنا پیار کرنے لگے ہیں اور اتنی اپنائیت سے ملتے ہیں کہ خدا کی قسم سینہ فراخ ہو جاتا ہے۔''

میرا ایم اے (فارسی) کا امتحان ہو رہا تھا کہ ان کی ہمشیرہ یعنی ظہیر بابر صاحب کی والدہ علالت کے بعد لاہور کے ایک ہسپتال میں وفات پا گئیں۔ ان کی میت انگہ لے جائی گئی۔ مجھے اگلے روز اخبار سے علم ہوا تو میں نے تعزیت کا تار دیا اور آخری پرچہ دیتے ہی اپنے دوست بشیر صاحب کو ساتھ لے کر انگہ پہنچ گیا۔ دو راتیں قیام کرنے کے بعد واپسی ہوئی۔ اس سے ان کو طمانیت کا احساس ہوا۔ فرماتے تھے: ''آپ کے آنے سے میری بڑی ڈھارس بندھی بلکہ میرا سر فخر سے بلند ہو گیا۔''

ستمبر ۱۹۶۰ء میں امتحان کا نتیجہ نکلا۔ قاسمی صاحب کے ایما پر طفیل ہوشیار پوری صاحب، سی ایم صادق، ڈائریکٹر تعلیمات کے پاس گئے اور میرا تقرر عارضی بنیاد پر گورنمنٹ ڈگری کالج مظفر گڑھ میں ہو گیا۔ اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں وہاں پہنچا۔ ۲۷ اکتوبر کو ملتان میں ایک مشاعرہ تھا جس میں وہ بھی مدعو تھے۔ یہ اطلاع دیتے ہوئے ۲۲ تاریخ کے خط میں لکھتے ہیں:

> ''اگر اس مشاعرے میں آیا تو مظفر گڑھ ضرور پہنچوں گا اور ایک دن آپ کے پاس بسر کروں گا...... آپ بہت یاد آتے ہیں اس لیے کہ آپ میرے دل کے بہت قریب ہیں۔''

وہ مشاعرے میں پہنچ گئے۔ میں اور میرے ساتھی اگلے روز دوپہر کے کھانے پر مظفر گڑھ میں ان کے منتظر رہے لیکن وہ نہیں پہنچے۔ پھر ان کا ملتان سے دیا ہوا تار ملا کہ انہیں بہ امر مجبوری لاہور واپس جانا پڑ رہا ہے۔ لاہور سے ۲ نومبر کو خط لکھا:

''میں کیوں نہ آسکا؟ اس کی وجہ زبانی ہی عرض کی جاسکتی ہے۔ بہرکیف آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آپ کے پاس حاضر ہونے کی راہ میں کوئی ناقابل عبور رکاوٹ ہی حائل ہوگی...... میں آپ کے علاوہ آپ کے عزیز دوستوں سے بھی عاجزانہ معافی چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے آپ نے میرے حاضر نہ ہوسکنے کی وجہ کا ذرا سا اندازہ ضرور لگا لیا ہوگا۔''

دراصل معاملہ وہی سی آئی ڈی کے تعاقب کا تھا اور وہ ہم سرکاری ملازمین کو کسی مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔

انہیں یہ فکر رہا کرتی تھی کہ میں اپنی کوئی تکلیف یا ضرورت تکلفاً ان سے پوشیدہ نہ رکھوں۔ چنانچہ ایک نہایت جذباتی خط (مکتوبہ ۲۸ جنوری ۱۹۶۱ء) میں اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

''یہ سب کچھ محض اس لیے لکھا ہے کہ اس دوران میں جب کبھی کسی قسم کی ضرورت محسوس کریں تو مجھے غیر کبھی نہ سمجھیں اور ایک لمحے کی بھی جھجک محسوس نہ کریں۔ عین ممکن ہے کہ زندگی کے کسی آئندہ مرحلے پر مجھے بھی آپ کی مدد کی ضرورت پڑے، اس لیے آپ اب جھجکیں گے تو میں بھی جھجکوں گا اور میں ایسا نہیں چاہتا۔''

دراصل یہ انہوں نے محض مجھے مائل کرنے کے لیے لکھا تھا ورنہ انہیں میری کیا ضرورت ہو سکتی تھی۔

بعض دیگر عوامل کے علاوہ، ان کی محبت کی کشش تھی جس کے باعث میں نے لاڑکانہ سے نقل مکانی کا فیصلہ کیا اور ۱۹۶۲ء کے موسم گرما کی تعطیلات ختم ہونے سے قبل دادی جان، والدہ اور چھوٹے بھائی کو شیخوپورہ منتقل کر دیا اور خود اپنی ملازمت پر مظفر گڑھ پہنچ گیا۔ اس موقع پر انہوں نے میرے نام اپنے ۱۰ ستمبر کے خط میں لکھا:

''اللہ تعالیٰ آپ کو اس نئی ہجرت کے بعد آرام و سکون نصیب کرے۔

میری دعائیں ہمہ وقت آپ کے ساتھ ہیں۔''

دسمبر ۱۹۶۲ء کے تیسرے عشرے میں مظفر گڑھ کے ادب دوست ڈپٹی کمشنر، سید محمد عسکری تقوی امروہوی نے ایک دھوم دھامی مشاعرے کا اہتمام کیا جس میں پاکستان کے اکثر نمایاں شعرا نے شرکت کی۔ اس موقع پر میں نے قاسمی صاحب سے، جوش صاحب سے ملانے کی درخواست کی۔ رات ایک بجے کے قریب جب جوش صاحب پنڈال میں پہنچے تو میں قاسمی صاحب کی ہدایت کے مطابق سٹیج پر پہنچ گیا۔ تعارف ہونے پر جوش صاحب بولے: ''بیٹا! خدا غریق رحمت کرے، تمہارا باپ ہمارا بڑا اچھا دوست تھا۔'' اس موقع پر معروف مزاحیہ شاعر سید محمد جعفری صاحب بھی بڑی محبت سے ملے اور پوچھا: ''آپ نے اپنے ابا کی کتاب 'پھولوں کے گیت' دیکھی ہے جو بچوں کے لیے لکھی گئی تھی؟'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔ کہنے لگے: ''اس میں ایک نظم 'شریر لڑکا' کے عنوان سے بھی ہے۔'' میں نے کہا: ''جی ہاں، وہ مجھے زبانی یاد ہے۔'' بولے: ''وہ انہوں نے بطور تفنن مجھ پر لکھی تھی۔'' اس انکشاف پر میں بے اختیار ہنس پڑا۔ نظم یوں شروع ہوتی ہے:

جعفری اک شریر لڑکا ہے　　　پڑھنے لکھنے سے جی چراتا ہے

اور اس میں یہ شعر بھی ہے:

بد بلا نے وہ گل کھلائے ہیں　　　سارے ہمسائے تنگ آئے ہیں

اگلے دن لیہ میں مشاعرہ تھا چنانچہ علی الصباح خاص خاص شعرا ادھر روانہ ہو گئے۔

۱۹۶۳ء کے آغاز میں، قاسمی صاحب کے ایما پر میں نے اپنے محکمے کے نام مظفر گڑھ سے شیخوپورہ تبادلے کی درخواست بھجوا دی اور انہی کی مساعی کے نتیجے میں بالآخر مجھے گورنمنٹ انٹر کالج، شیخوپورہ تبدیل کر دیا گیا۔ اس کا فائدہ تو یہ ہوا کہ ہفتے عشرے میں لاہور کا چکر لگنے پر ان سے ملاقات ہونے لگی اور نقصان یہ کہ ہمارے درمیان خط کتابت کا سلسلہ عندالضرورت رابطے تک محدود ہو گیا۔ اس اثنا میں انہوں نے اپنا اشاعتی ادارہ ''کتاب نما'' قائم کیا، نیز ''فنون'' کا اجرا ہوا۔ خدیجہ مستور صاحبہ کا ناول ''آنگن'' کتاب نما نے چھاپا تھا۔ میں نے دادا جان کی معروف کتاب ''پنجاب میں اردو''، جس میں ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے ضروری ضمائم اور مختصر حواشی کا

اضافہ کیا تھا، اشاعت کے لیے پیش کی۔

میری نسبت لاڑکانہ میں ہوئی تھی۔ جولائی ۱۹۶۴ء میں شادی طے پائی۔ وہ لاڑکانہ تو نہ جا سکے لیکن بعد میں اپنی طرف سے نیڈوز ہوٹل میں عصر کی چائے کا اہتمام کیا جس میں بہت سے احباب نے شرکت کی۔

۴ مارچ ۱۹۶۵ء کو ہمارے کالج کا سالانہ مشاعرہ تھا۔ میری درخواست پر قاسمی صاحب، عابد علی عابد صاحب، قتیل شفائی صاحب اور طفیل ہوشیار پوری صاحب جیسے معروف شعرا کو لے کر شیخوپورہ آئے اور یوں اس معمول کے مشاعرے کو یادگار بنا دیا۔

وہ جب بھی کسی تقریب سے شیخوپورہ آتے تو میرے غریب خانے پر تشریف لا کر میری عزت افزائی کرتے۔ اگر کوئی رات کا مشاعرہ ہوتا تو شب بسری بھی کر لیتے۔ ۱۹۶۵ء کی موسم گرما کی تعطیلات میں نے لاڑکانہ میں گزاریں اور حماقت یہ کی کہ ان کو خیریت سے مطلع بھی نہ کیا۔ آخر ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ ۵ ستمبر کو شیخوپورہ کے پتے پر خط لکھا:

> ''پیارے بھائی۔ محبت۔ کہیں آپ مجھ سے خفا تو نہیں ہیں۔ یہ میری نالائقی اور بدبختی ہے کہ ان دنوں نہ آپ کے پاس آ سکا نہ خط لکھ سکا۔ دراصل میں ان دنوں بڑی مشکلوں میں گرفتار ہوں اور ارادہ ہے کہ ۱۲ تاریخ تک 'فنون' پوسٹ کرنے کے بعد چند گھنٹوں کے لیے آپ کے پاس آ کر ان مشکلوں کے بارے میں مشورہ کروں، یہ تو خیر بعد کی بات ہے...... آپ بہت دنوں سے تشریف نہیں لائے...... اس وجہ سے سخت پریشان ہوں...... میں تو آپ کو ان اپنوں میں شمار کرتا ہوں، جن کے دم سے زندہ رہنے سے جی اکتاتا نہیں ہے...... مجھے آپ کی زندگی کے ایک ایک لمحے سے دلچسپی ہے اور یہ دو مہینے تو میرے لیے بڑے کربناک بن کر رہ گئے ہیں۔''

۶ تاریخ کو جنگ ستمبر کا آغاز ہوا اور میں لاڑکانہ میں محصور ہو کر رہ گیا۔ آخر جنگ کے اختتام پر واپس آ کر ان کی خدمت میں حاضر ہو سکا۔

نومبر۔ دسمبر ۱۹۶۵ء میں ایسا اتفاق ہوا کہ دو تین بار حاضری کے باوجود ان سے ملاقات نہ ہو

پائی، اس پر معذرت خواہانہ انداز میں ۳ جنوری ۱۹۶۶ء کو لکھتے ہیں:

"پیارے مظہر بھائی۔ دعا اور محبت۔ میری بدقسمتی ہے کہ پچھلے ڈیڑھ دو مہینے سے آپ سے کھل کر کوئی بات ہی نہ ہو سکی۔ میں شیخوپورہ بھی نہ آسکا اور آپ یہاں آئے تو نہ مل سکا۔ اب جی چاہتا ہے کہ عید کے بعد ایک مکمل دن آپ کے ساتھ گزاروں۔ تشنگی سی محسوس ہو رہی ہے۔"

۱۹۶۶ء کے موسم بہار میں اچانک میرا تبادلہ ملتان ہو گیا جس سے میں بہت گھبرایا۔ لاہور جا کر قاسمی صاحب کو بتایا تو وہ بھی پریشان ہو گئے۔ مجھے ساتھ لے کر مصطفیٰ زیدی صاحب کے پاس پہنچے جو ان دنوں لاہور کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ وہ بڑے تپاک سے ملے اور ڈائریکٹر تعلیمات کو فون کر کے تبادلہ منسوخ کرنے کو کہا۔ چنانچہ مجھے شیخوپورہ انٹر کالج سے شیخوپورہ ڈگری کالج میں تبدیل کر دیا گیا۔

اس کالج میں بھی ایک معیاری مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس کی صدارت حکیم نیّر واسطی صاحب نے کی تھی لیکن یہ بعد کی بات ہے یعنی ۱۹۶۷ء کے ربع اوّل کی۔ اس کی کامیابی بھی قاسمی صاحب اور ان کے دوست شعرا کی مرہون منت تھی۔

پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کی وفات کے بعد مئی ۱۹۷۴ء میں قاسمی صاحب مجلس ترقی ادب کے ناظم مقرر ہوئے۔ میرا مجلس کے ساتھ سید امتیاز علی تاج صاحب کے وقت سے تعلق تھا کیونکہ میں مجلس کے لیے "مقالات حافظ محمود شیرانی" کے سلسلے کی تدوین کر رہا تھا۔ اس کی چھ جلدیں شائع ہو چکی تھیں۔ قاسمی صاحب کی نظامت کے دوران میں طویل وقفوں سے اس سلسلے کی ساتویں، آٹھویں اور نویں جلدیں اشاعت پذیر ہوئیں۔ اس تاخیر کا باعث مجلس کی سقیم مالی حالت تھی۔ میرا پی ایچ ڈی کا مقالہ "حافظ محمود شیرانی اور ان کی علمی و ادبی خدمات" بھی دو جلدوں میں مجلس ہی نے چھاپا تھا۔ اس کی اشاعت پر قاسمی صاحب کو بطور ناشر، علی گڑھ سے مشہور فاضل ڈاکٹر مختارالدین احمد صاحب کا تہنیتی خط موصول ہوا، جس پر وہ بڑے خوش ہوئے۔ وفات سے ذرا پہلے انہوں نے "مقالات حافظ محمود شیرانی" کی دسویں اور آخری جلد کی طباعت کی منظوری بھی تحریری طور پر دے دی تھی۔

۱۹۹۵ء میں ملازمت سے میری سبکدوشی کے موقع پر گورنمنٹ کالج شیخوپورہ کی بزم ادب و ثقافت کا نام تبدیل کر کے "بزم شیرانی" رکھ دیا گیا تھا۔ اس کے انچارج پروفیسر شبلی صاحب کی

خواہش تھی کہ بزم کے باقاعدہ افتتاح کے لیے قاسمی صاحب کو دعوت دی جائے۔ میں پہلے تو ندیم بھائی جان کی زحمت کے خیال سے شبلی صاحب کو ٹالتا رہا۔ جب ان کا اصرار بہت بڑھ گیا تو ایک دن میں نے ندیم صاحب سے ذکر کر دیا۔ وہ فوراً آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ ۱۴ جنوری ۱۹۹۶ء کو کالج کے ہال میں ایک بھرپور تقریب ہوئی جس کے آخر میں قاسمی صاحب نے صدارتی خطاب کیا۔ اس خطاب میں انہوں نے اختر شیرانی مرحوم کی محبت کے تناظر میں چند ماہ تک عرب ہوٹل میں کھانا کھانے کا ذکر بھی کیا۔ یہ قصہ قاسمی صاحب نے اس سے کوئی تیس برس قبل میری موجودگی میں میرے دوست اشتیاق حسن خاں کو سنایا تھا۔ اس تمام عرصے میں میں نے اسے اپنے سینے میں محفوظ رکھا تا آنکہ خود انہوں نے یہ ایک بھرے جلسے میں کہہ سنایا۔ بعد میں کسی جگہ میں نے پڑھا کہ وہ یہ واقعہ ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ لاہور کے کسی ادبی اجلاس میں بیان کر چکے تھے۔ خدا لگتی بات یہ ہے کہ ان کے بار بار اس علی الاعلان اعتراف سے اختر شیرانی کی خورد نوازی کے ساتھ ساتھ قاسمی صاحب کی اخلاقی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔

ندیم صاحب کا گاؤں انگہ وادی سون میں سکیسر جانے والی سڑک کے دائیں جانب والے پہاڑی سلسلے پر ایک پرفضا جگہ واقع ہے۔ اس کے ماحول کی جھلکیاں ان کے افسانوں میں جابجا دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے والد مادی سے زیادہ روحانی دنیا کے آدمی تھے۔ ندیم صاحب کے بڑے بھائی کا نام محمد بخش قاسمی اور خود ان کا احمد بخش قاسمی تھا۔ عرفیت احمد شاہ تھی، جس سے بعض اہل قلم کو ان کے سیّد ہونے کا گمان ہوا۔ وہ اعوان قبیلے کی ایک شاخ قسمال (مقامی زبان میں قاسم سے صفت نسبتی) سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ قسمال کا اردو متبادل قاسمی ان کے نام کا جز ٹھہرا۔ بچپن میں یتیمی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی محرومیوں اور نارسائیوں نے ندیم کو درد کی وہ دولت عطا کی جو انسان کا سب سے قیمتی اثاثہ ہے اور اسی درد کی بدولت ان کو وہ حساس دل اور دیدۂ بینا ودیعت ہوئے جو ایک بڑا فنکار بننے کے لیے شرط لازم کی حیثیت رکھتے ہیں:

سب حجابات نظر دل کے نہ دُکھنے تک تھے
درد چمکا تو اندھیرا بھی نہ رہنے پایا

اس شخص نے اپنی دردمندی کو وسعت دے کر بنی نوع انسان کے مظلوموں اور محکوموں کے

دکھوں پر محیط کر دیا اور پھر جیتے جی اس جذبے سے ایک لمحے کو بھی دست کش نہ ہوا۔ جب وہ حصول تعلیم کے سلسلے میں لاہور پہنچے تو حسن اتفاق سے انہیں یہاں ایسے لوگوں کی صحبت میسر آئی جس نے اس زرکانی کو کندن بنا دیا۔ اختر شیرانی سے ندیم نے شعروادب سے زیادہ مہرووفا اور شرم وحیا کا سبق لیا۔ دونوں میں ایک اور قدر مشترک سیم وزر کو خزف ریزوں سے زیادہ وقعت نہ دینے کا رویہ تھا۔ اختران سے بے حد محبت کرتے تھے اور یہی حال ندیم کا تھا بلکہ مجھ سے ندیم کی شدید محبت کو بھی اس سابقہ محبت کی توسیع سمجھنا درست ہوگا۔

مولانا عبدالمجید سالک کی صحبت میں ندیم نے بہت سی دوسری خوبیوں کے ساتھ ضرورت مندوں کے کام آنے کی عادت سیکھی۔ میں نے کبھی نہ دیکھا کہ کسی نے ندیم صاحب کو کوئی کام بتایا ہو اور انہوں نے اس کے لیے مخلصانہ کوشش سے پہلوتہی کی ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی سعی مشکور ہو یا نا مشکور۔ ان مساعی کی کہانی طویل بھی ہے اور سبق آموز بھی، جس کی تفصیلات بیان کرنا نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی مناسب۔ میں صرف ایک چھوٹا سا واقعہ درج کرتا ہوں۔

کراچی کا ایک شخص جو خاصا اچھا مصور تھا، لاہور میں کوئی چھوٹی موٹی ملازمت کرتا تھا۔ ایک دن وہ اپنی پینٹنگ لے کر قاسمی صاحب کے پاس آیا اور کہا کہ کراچی میں میری والدہ سخت علیل ہیں اور میری جیب خالی ہے۔ اگر اس تصویر کے پانچ سو روپے مل جائیں تو میری مشکل آسان ہو جائے گی۔ یہ کہتے ہوئے اس بھلے مانس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ قاسمی صاحب نہایت غیور واقع ہوئے تھے لیکن جب کسی غریب کا کام ہوتا تو سب کچھ بھول جاتے تھے۔ چنانچہ اس سے تصویر لے لی اور اگلے روز آنے کو کہا۔ اس کے جانے کے بعد اپنی تمام مصروفیات چھوڑ کر تصویر اٹھائی اور سیدھے سعید سہگل کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ موصوف نے بڑی آؤ بھگت کی لیکن تصویر خریدنے سے معذرت کر دی۔ یہ وہاں سے نکل کر میاں ممتاز دولتانہ کے ہاں پہنچے۔ انہوں نے بھی بڑی خاطر کی۔ یہ حرف مطلب زبان پر لائے البتہ قیمت کا تذکرہ نہیں کیا کہ یہاں سے بھی مایوسی نہ ہو۔ خیال تھا کہ جو کچھ بھی ملے گا اس میں اپنے پاس سے رقم ملا کر اس شخص کی ضرورت پوری کر دوں گا۔ دولتانہ صاحب نے تصویر پسند کی اور اپنے ملازم کو بلا کر ڈرائنگ روم میں آویزاں کرنے کو کہا۔ پھر اٹھ کر گئے اور ایک ہزار روپیہ لا کر ندیم صاحب کو پیش کر دیا۔ اگلے روز جب تصویر کا مالک آیا اور انہوں نے اس کی توقع سے دوگنا رقم اسے دی تو اس کی آنکھوں سے مسرت

کے آنسو جاری ہو گئے۔ فرماتے تھے کہ صنعت کار نہیں پسیجا، جاگیردار بروئے کار آیا۔ یہ اشارہ پرانے جاگیرداری نظام میں فن کاروں کی سر پرستی والی روایات کی طرف تھا۔

مجھے یہ اعتراف کرنے میں مطلق عار نہیں کہ ندیم صاحب کی اس کار برآری اور خدمت گزاری کی صفت سے سب سے زیادہ میں نے فائدہ اٹھایا اور ان سے، ''کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ'' کے مصداق ایسے ایسے ادبی اور غیر ادبی کام لیے کہ اب سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ ملا کی دوڑ مسجد تک، ان سے نہ کہتا تو کس سے کہتا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی بے غرضی اور خلوص کے باعث زیادہ تر کام حسب منشا ہو جاتے تھے۔ کسی کے کلام کی اشاعت، کسی کی کتاب پر فلیپ، کسی ضرورت مند شاعر یا ادیب کی مالی امداد، کسی کی چھوٹی موٹی نوکری کی سفارش، کسی کتاب کی تقریب رونمائی میں شمولیت، کسی مفت کے مشاعرے میں شرکت یہ تو معمول کی باتیں تھیں۔ معاملہ کہیں آگے پہنچا ہوا تھا۔ اس کا اندازہ لگانے کے لیے میں دو واقعات مختصراً عرض کرتا ہوں۔

ضلع سیالکوٹ کے میرے ایک مہربان کا انٹرمیڈیٹ پاس لڑکا گھر سے ناراض ہو کر چلا گیا اور فوج میں سپاہی بھرتی ہو گیا۔ ایک عرصے تک تو پتا ہی نہ چلا۔ اس وقت علم ہوا جب وہ ای ایم ای کی ٹریننگ لے کر باقاعدہ تعینات ہو گیا۔ گھر والوں نے واپس لانا چاہا۔ وہ نوجوان بھی آمادہ تھا مگر اب کمبل نہیں چھوڑتا تھا۔ اس سلسلے میں اس کے والد نے مجھ سے بھی اعانت طلب کی۔ ای ایم ای کا صدر دفتر کوئٹہ میں تھا۔ پہلے تو میں نے ندیم صاحب کو اس کام کے لیے موزوں نہ سمجھتے ہوئے اپنے بعض مہربان فوجی افسروں سے درخواست کی۔ اکثر نے کانوں پر ہاتھ رکھے۔ بعض نے اپنی سی کوشش بھی کی لیکن کارگر نہ ہوئی۔ آخر تھک ہار کر سارا معاملہ ندیم صاحب کے گوش گزار کیا۔ انہوں نے معروف شاعر عطا شاد بلوچ کے نام رقعہ لکھ کر دیا جو ان دنوں آرٹس کونسل کوئٹہ کے ڈائریکٹر تھے۔ وہاں جانا میرے بس کا روگ نہیں تھا چنانچہ عزیزی عبدالقیوم کو وہ رقعہ دے کر کوئٹہ بھیجا۔ واپسی پر اس نے بتایا کہ جب میں نے عطا شاد صاحب کو ان کے دفتر میں وہ رقعہ پہنچایا تو وہ لفافے پر ندیم صاحب کا نام دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور رقعہ اپنے سر پر رکھ لیا۔ کچھ دیر اسی حالت میں ندیم صاحب سے عقیدت کا اظہار کرتے رہے۔ پھر بیٹھ کر رقعہ پڑھا۔ رقعہ لانے پر میرے ممنون ہوئے، خاطر مدارات کی، دو چار جگہ فون گھمائے۔ ای ایم ای کے بڑے افسر، پھر امان اللہ گچکی، سیف اللہ پراچہ وغیرہ۔ اتفاق سے کسی سے رابطہ نہ ہو سکا۔ مجھے کہنے لگے، ندیم صاحب کی خدمت

میں میرا دست بستہ سلام عرض کرنا اور کہنا کہ آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔ غرض یہ کہ کچھ ہی دن بعد وہ نوجوان ڈسچارج ہو کر اپنے گھر پہنچ گیا۔

دوسرا واقعہ بالکل مختلف نوعیت کا ہے۔ ایک دن میں اپنی زرعی اراضی پر پھر رہا تھا۔ اچانک گاؤں کا ایک ضعیف آدمی، غریب عالم نامی، میرے پاس آیا اور زار و قطار رونے لگا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کی لڑکی کی شادی گزشتہ سال ضلع سرگودھا کے کسی چک میں ہوئی تھی۔ اب اس کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے۔ اس کے شوہر نے برادری کی کسی پرانی رنجش کا بدلہ لینے کی خاطر بیوی اور بیٹے کو گھر سے نکال دیا اور اب وہ باپ کے گھر آ بیٹھی ہے۔ اس صدمے نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ میں نے بڑے میاں کو تسلی دی۔ گھر واپس آ کر سوچتا رہا کہ اس نجی معاملے میں اس بھلے آدمی کی کیونکر مدد کی جا سکتی ہے۔ کوئی صورت نظر نہ آئی تو ندیم صاحب سے استمداد کی ٹھانی۔ دوسرے روز لاہور جا کر انہیں ساری کتھا سنائی۔ انہوں نے فوراً ہی سرگودھے کے ایک چک کے کسی بڑے زمیندار، ملک صاحب (افسوس کہ ان کا نام بھول چکا ہوں) کے نام رقعہ لکھ دیا۔ میں نے وہ رقعہ بابا غریب عالم کو پہنچا دیا اور خود نچنت ہو کر بیٹھ رہا۔ دو ہفتے بعد اس سے ملاقات ہوئی تو تفصیلات کا علم ہوا۔ بابا رقعہ لے کر ملک صاحب کے گاؤں پہنچا۔ شام کا وقت تھا اور ملک صاحب کسی کام سے شہر گئے ہوئے تھے۔ بابا دوسرے لوگوں کے ساتھ ڈیرے پر ٹھہر گیا۔ رات گئے ملک صاحب واپس آئے۔ اس نے رقعہ پیش کیا۔ ملک صاحب نے تفصیل معلوم کی اور اطمینان دلایا۔ اتفاق سے لڑکی کا سسرالی گاؤں اور ملک صاحب کا گاؤں ایک ہی تھانے کی حدود میں تھے۔ صبح ناشتے کے بعد ملک صاحب نے بڑے میاں کو ساتھ لیا اور جیپ میں تھانے پہنچے۔ وہاں سے پولیس بھیج کر بڑے میاں کے داماد کو بلوایا اور آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ کیا جواب دیتا، بغلیں جھانک کر رہ گیا۔ ملک صاحب نے کہا: ''خیریت چاہتے ہو تو جا کر اپنی بے قصور بیوی اور بچے کو لے آؤ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا اور یاد رکھنا کہ وہ غریب عالم کی بیٹی نہیں میری بیٹی ہے۔'' بڑے میاں جب تک زندہ رہے مجھے دعائیں دیتے رہے جو میں ندیم صاحب کی طرف منتقل کر دیتا تھا۔

۱۹۸۰ء میں جب دادا جان کی صد سالہ تقریب ولادت منانے کا منصوبہ بنا تو اس کے لیے مجلس یادگار حافظ محمود شیرانی کے نام سے ایک انجمن تشکیل دی گئی، جس کے صدر ڈاکٹر وحید قریشی صاحب تھے۔ ندیم صاحب کو حکیم نیر واسطی اور ڈاکٹر سید عبداللہ کے ساتھ انجمن کے سرپرست کی

حیثیت دی گئی۔ اس کاغذی عہدے کے باوجود عملی طور پر انہوں نے سب سے زیادہ تگ و دو کی اور لاہور، کراچی اور اسلام آباد ایک کر دیے۔

ندیم صاحب کے گہرے دینی پس منظر نے ان کے قدموں میں تمام عمر لغزش نہیں آنے دی۔ ان کی مشہور نعت کا یہ شعر اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے:

پورے قد سے جو کھڑا ہوں تو یہ تیرا ہے کرم
مجھ کو جھکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا

قول و فعل کی ہم آہنگی ان کا خاصہ رہا۔ جس بات کو حق سمجھا اس کا کھل کر اعلان کیا۔ اسی بنا پر ان کی شخصیت اور ان کے کلام میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا۔ وہ اپنے دین، اپنے ملک اور اپنی تہذیبی اقدار پر کسی سمجھوتے کے قائل نہ تھے۔ انہوں نے پہلی باقاعدہ نظم مولانا محمد علی جوہر جیسے بطل حریت کی وفات پر کہی تھی جو سید حبیب کے روزنامہ ''سیاست'' میں شائع ہوئی۔ استعمار دشمنی کا یہ وطیرہ تاحین حیات قائم رہا۔ دوسری جنگ عالمگیر کے زمانے میں بڑے بڑے نامی گرامی ادیب اور شاعر، ترقی پسندوں اور مذہب پرستوں کی تخصیص سے قطع نظر، انگریزی سرکار کی فوج کے شعبہ اطلاعات اور جنگی پروپیگنڈا کے محکمے میں ملازم ہو کر اپنے ہم وطن نوجوانوں کو جنگ کا ایندھن بناتے رہے لیکن ندیم اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے پر آمادہ نہ ہوا۔ اسی اصول پرستی کے باعث وہ دائیں اور بائیں دونوں بازوؤں کی سنگ زنی کا نشانہ بنا:

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

وہ اپنی خوش اخلاقی کے باعث معمولی لوگوں کی بے ضرر خواہشات کو کبھی رد نہیں کرتے تھے لیکن جب کسی معاملے میں ان کے عقائد پر زد پڑتی تو بڑی سے بڑی شخصیت اور پرانے تعلقات کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ایک واقعہ میرے سامنے کا ہے۔ تاریخ یاد نہیں۔ سال غالباً ۱۹۷۴ء یا ۱۹۷۵ء تھا۔ میں مجلس ترقی ادب کے دفتر میں ان کے پاس بیٹھا تھا کہ عبدالکریم چپڑاسی نے آ کر اطلاع دی کہ فیض صاحب آئے ہیں۔ اتنے میں فیض صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ قاسمی

صاحب نے اٹھ کر استقبال کیا۔ ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد فیض صاحب نے کہا: ''ہم آپ کے پاس اس لیے آئے ہیں کہ ہم روس پاکستان دوستی کی انجمن بنا رہے ہیں۔ آپ اس میں ہمارا ساتھ دیں۔'' قاسمی صاحب چند لمحے کے سکوت کے بعد یوں گویا ہوئے: ''فیض صاحب! ابھی تو سقوط مشرقی پاکستان کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا اور ہمارے ملک کو دولخت کرنے میں بھارت کے بعد سب سے زیادہ حصہ روس کا ہے۔ میری غیرت تو یہ گوارا نہیں کرتی کہ میں اس ملک کے ساتھ دوستی کا تصور بھی کروں جس کے ہاتھ ہمارے وطن کے خون سے آلودہ ہیں۔'' فیض صاحب یہ جواب سن کر تھوڑی دیر توقف کے بعد اٹھ کر خاموشی سے چلے گئے۔

اسلام اور ہادی اسلام سے ندیم کی محبت کا اندازہ ان کی بلند پایہ نعتوں سے ہوتا ہے جن میں صمیم قلب کے ساتھ اظہار عقیدت کیا گیا ہے۔ دنیا طلبی اور ریاکاری کی بنیاد پر ایسے شاہکار وجود میں نہیں آیا کرتے۔ ''فنون'' کے آخری پرچے میں ان کی پانچ اشعار پر مشتمل ایک مختصر نعت چھپی ہے جس کا شعر ذیل مجھے بے حد پسند ہے:

درونِ سینہ مدینہ اٹھائے پھرتا ہوں
کہ ایک پل بھی گوارا نہیں جدائی تری

ندیم صاحب نہایت خوش مزاج اور زندہ دل انسان تھے۔ شعر و ادب اور صحافت میں ان کے بلند مرتبے نیز ان کے حسن اخلاق کے باعث دفتر ''فنون'' اور مجلس ترقی ادب میں ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ بڑے چھوٹے ہر قسم کے لوگ آتے۔ بعض نو وارد بلاوجہ وقت کے ضیاع کا سبب بھی بنتے لیکن ان کے ماتھے پر شکن نہ پڑتی۔ خندہ پیشانی سے گفتگو کرتے، ہنستے ہنساتے، پرانے دلچسپ واقعات پوری جزئیات کے ساتھ سناتے۔ ان واقعات کو جمع کرنے سے ایک نہایت دلچسپ کتاب مرتب ہو سکتی تھی۔ میں دو ایک پر لطف قصے درج کرتا ہوں۔ یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب ندیم صاحب رہا ہو چکے تھے اور فیض صاحب ابھی اسیر تھے۔ مولانا حسرت موہانی لاہور آئے ہوئے تھے۔ ایک روز ایک ادبی اجلاس میں اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے غزل کی تین قسمیں بتائیں عارفانہ، عاشقانہ اور فاسقانہ۔ اس پر کسی نے سوال کیا کہ مولانا آپ کی غزلیں کون سی قسم سے تعلق رکھتی ہیں۔ مولانا نے فوراً جواب دیا: ''فاسقانہ۔''

اس سے اگلے روز قاسمی صاحب کو بیگم ایلس فیض کا فون آیا: ''میں مولانا کو گھیر گھار کر گھر تو لے آئی ہوں لیکن یہ ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ آپ فوراً آ جائیں تا کہ کچھ دیر تک ان سے باتیں کی جا سکیں۔'' یہ پہنچے تو مولانا، فیض صاحب کے پر تکلف ڈرائنگ روم میں فرش پر پھسکڑا مارے بیٹھے تھے۔ بیگم فیض، مولانا کو ان کے حوالے کر کے چائے وغیرہ کا انتظام کرنے گئیں۔ دونوں صاحبان کے درمیان سلام کے تبادلے کے بعد مکالمے کا آغاز ہوا، مولانا نے اپنی باریک سی آواز میں پوچھا:

''آپ کی تعریف؟''

''جی مجھے احمد ندیم قاسمی کہتے ہیں۔''

مولانا (کچھ سوچتے ہوئے): ''تم تو شاعر ہو!''

''جی ہاں، کچھ کہہ لیتا ہوں۔''

''تو پھر سناؤ۔''

''مولانا! میں شاعر تو ہوں لیکن آپ کے سامنے سنا نہیں سکتا۔ آپ سے سننا چاہتا ہوں۔''

''اس میں حرج ہی کیا ہے؟ تم سناؤ ہم بھی سنائیں گے۔''

قاسمی صاحب کے ذہن میں ایک دن پہلے کی ''فاسقانہ'' والی بات تازہ تھی۔ چنانچہ بقول خود اسی زمرے کی ایک غزل سنانے لگے جس کا مطلع ہے:

شام کو صبح چمن یاد آئی
کس کی خوشبوئے بدن یاد آئی

مولانا دھیرے دھیرے جھومتے رہے۔ جب یہ شعر پڑھا گیا:

یاد آئے ترے پیکر کے خطوط
اپنی کوتاہی فن یاد آئی

تو مولانا چہک کر بولے: ''یہ شعر تم نے کیسے کہہ لیا۔'' قاسمی صاحب استعجاب آمیز استفہامیہ نظروں سے مولانا کو تکنے لگے۔ مولانا نے ذرا توقف کے بعد کہا: ''یہ تو ہمیں کہنا چاہیے تھا۔'' یہ واقعہ سن کر

میں نے قاسمی صاحب سے عرض کیا کہ ایک شاعر دوسرے شاعر کو اس سے بڑا اخراج تحسین پیش نہیں کر سکتا۔

منٹو کی بے خودی و ہوشیاری کا ایک واقعہ بھی دلچسپ ہے۔ جگر مراد آبادی لائل پور کاٹن مل کے مشاعرے سے فارغ ہو کر لاہور آئے تو ان کے اعزاز میں ایک عشائیے کا اہتمام ہوا۔ بہت سے شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ منٹو بھی موجود تھے۔ پایان مستی کا عالم تھا۔ اثنائے گفتگو ان کا فن زیر بحث آیا۔ جگر صاحب کہنے لگے: ''منٹو صاحب تو افسانے کے گورو ہیں۔'' منٹو نے یہ فقرہ سنا تو میز کی دوسری طرف سے ہاتھ بڑھا کر جگر صاحب کی داڑھی تھام لی اور بولے: ''یہ گورو نانک کے ہوتے ہوئے مجھے گورو کیوں کہا جا رہا ہے؟''

طالب آملی کا شمار مغلیہ دور کے سر برآوردہ شعرا میں ہوتا ہے۔ اس وقت تک اس کا دیوان مرتب نہ ہوا تھا۔ میں نے اس کی تدوین کا ارادہ کیا۔ دیوان طالب آملی کا ایک قلمی نسخہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے پاس بھی تھا جو میں دیکھنا چاہتا تھا۔ قاسمی صاحب سے ذکر کیا تو وہ ایک سہ پہر کو صوفی صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ صوفی صاحب کے ''شغل'' کا وقت تھا۔ انہوں نے دو گلاسوں میں تھوڑا تھوڑا مشروب ڈال کر ایک قاسمی صاحب کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے کہا: ''صوفی صاحب! آپ کو پتا ہے کہ میں اس نعمت سے محروم ہوں۔'' صوفی صاحب بولے: ''بہت اچھا کرتے ہو۔ یہ کمبخت بڑی بری چیز ہے۔ ایک بار منہ لگ جائے تو جان نہیں چھوڑتی۔'' ساتھ ہی دونوں جام چڑھا گئے۔ جب ذرا سرور ہوا تو دوسری بار دو پیگ تیار کیے۔ قاسمی صاحب کو صلا کی۔ انہوں نے پہلے والا جواب دیا۔ صوفی صاحب کہنے لگے: ''کمال ہے۔ تم شاعر ہونے کے باوجود اس سے اجتناب کرتے ہو۔ بھئی دنیا میں ایک ہی تو نعمت غیر مترقبہ ہے......''

قاسمی صاحب نے کہا: ''حضرت! ابھی تھوڑی دیر پہلے تو آپ کہہ رہے تھے کہ اس سے بچنا بڑی اچھی بات ہے۔'' صوفی صاحب نے بڑے استعجاب سے پوچھا: ''یہ بات میں نے کہی تھی؟'' قاسمی صاحب نے اثبات میں جواب دیا تو صوفی صاحب بولے: ''میں ایسی غلط بات کہہ ہی نہیں سکتا۔ کتابت کی غلطی ہو گئی ہو گی۔''

میں نے اپنے غیر معروف لوگوں پر لکھے گئے، خاکوں کے مجموعے کا نام ''بے نشانوں کا نشاں'' رکھا تو اس ضمن میں قاسمی صاحب سے مشورہ طلب کیا۔ سن کر مسکرائے اور بولے: ''مظہر

بھائی! اگر کتاب کا کوئی اچھا نام سوجھے تو جب تک کتاب چھپ نہ جائے، کسی کو بتانا نہیں چاہیے۔"
پھر یہ پرانا قصہ سنایا: "ایک بار میرے افسانوں کا ایک مجموعہ چھپ کر تیار تھا لیکن کوئی اچھا نام نہیں سوجھ رہا تھا۔ اتفاق سے انہی دنوں اے حمید صاحب آئے اور کہنے لگے: 'میں نے اپنی کہانیوں کے تازہ مجموعے کا نام 'در و دیوار' تجویز کیا ہے۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟' میں نے کہا: 'بہت اچھا نام ہے۔' کچھ دیر بعد اے حمید صاحب اٹھ کر گئے تو میں فوراً اپنے ناشر کے پاس پہنچا اور کہا کہ میری کتاب کا نام 'در و دیوار' رکھ دو۔ کتاب چھپ گئی۔ اس کے بعد اے حمید صاحب سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگے: 'قاسمی صاحب! یہ آپ نے کیا کیا؟' میں نے کہا: 'یہ آپ کو سبق سکھایا گیا ہے کہ اچھے نام کی ایک راز کی طرح حفاظت کرنی چاہیے۔ امید ہے آئندہ آپ محتاط رہیں گے۔"

قاسمی صاحب کو لطائف بیان کرنے میں کمال حاصل تھا۔ ان کی صحبت میں بیٹھ کر وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا تھا۔ قتیل شفائی صاحب اور ان کے بعد عطاالحق قاسمی صاحب کی موجودگی میں تو محفل پورے جوبن پر ہوتی۔ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے کہا ہے:

ایک ہے چھوٹا قاسمی، ایک بڑی سرکار
روز جمائیں محفلیں، روز سجے دربار

مجھ پر ان کا لطف و کرم تو ہمیشہ رہا۔ ایم اے فارسی کے نصاب کی چند کتابیں بازار میں دستیاب نہیں تھیں۔ اس وقت کا تذکرہ میں نے ان سے کیا تو انہوں نے اپنے ذاتی مجموعے سے بعض کتابیں مجھے عطا کر دیں۔ ان میں ایس ایم اکرام صاحب کا مرتبہ انتخاب "ارمغان پاک" بھی تھا۔ اس پر پنسل سے انگریزی میں یہ عبارت درج ہے:

"Passed by D.I.G., C.I.D. vide letter no.7941 A.I.S.B. dated 31-05-1951 Sd."

گویا یہ ان کتابوں میں شامل تھی جو ان کی سیفٹی ایکٹ کے تحت (مئی تا نومبر ۱۹۵۱ء) اسیری کے دوران انہوں نے گھر سے منگوائی تھیں۔

مزید برآں انہوں نے مجھے اجازت دے رکھی تھی کہ ان کی ذاتی کتابوں میں سے جو بھی

درکار ہو میں بلا تکلف لے سکتا ہوں۔ میرے پسندیدہ ترین فارسی غزل گو نظیری کا ایران میں مطبوعہ دیوان، صادق نسیم صاحب نے ۲۸ اگست ۱۹۶۳ء کو کوئٹہ میں انہیں پیش کیا تھا۔ یہ بھی انہوں نے میرے حوالے کر دیا۔ طالب آملی کا ضخیم کلیات میرے ایرانی دوست آقای طاہری شہاب نے مرتب کر کے شائع کر دیا اور اس کا ایک نسخہ مجھے بھی بھیجا۔ لہٰذا میں اس کی تدوین کا ارادہ ترک کر چکا تھا۔ اتفاق سے جنوری ۱۹۶۹ء کے اوائل میں قاسمی صاحب کا پشاور جانا ہوا۔ وہاں ان کے کسی ارادت مند نے ایک نفیس قلمی نسخہ ان کے نذر کیا۔ یہ نظیری اور طالب آملی کے کلام کا طویل انتخاب ہے جو طالب آملی کے حین حیات کیا گیا تھا۔ معطی نے ۹ جنوری کو اس پر یہ الفاظ لکھے:

''بڑی ہی عقیدت اور خلوص کے ساتھ جناب ندیم کی خدمت میں۔'' (دستخط ناخوانا ہیں)۔ قاسمی صاحب نے واپس لاہور آ کر چند دن بعد ہی یہ قیمتی نسخہ درج ذیل عبارت لکھ کر مجھے عنایت کر دیا:

''برادرِ عزیز و مکرم مظہر محمود شیرانی کی نذر...... کہ یہ گراں بہا مجموعہ ان کی تحویل میں رہے گا تو مجھے اطمینان ہوگا کہ اسے صحیح مقام ملا۔ احمد ندیم۔ ۱۴ جنوری ۱۹۶۹ء''

اس کے علاوہ وہ لکھنے لکھانے میں میری حوصلہ افزائی کا فریضہ بھی بجا لاتے تھے۔ بعض شخصیات پر میرے تحریر کردہ مضامین انہوں نے ''فنون'' کے مختلف شماروں میں شائع کیے۔ جب یہ ختم ہو گئے تو ۳۰ نومبر ۲۰۰۱ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

''جس کام میں آپ مصروف ہیں وہ یقیناً نہایت اہم ہے۔ وہ مکمل ہو لے تو اس کردار نگاری کی طرف توجہ دیجیے جس کے چند خوبصورت نمونے 'فنون' میں درج ہو چکے ہیں۔''

بعض اوقات وہ اپنے نجی معاملات میں بھی مجھ سے مشورہ طلب کر لیتے تھے جو میں اپنی بساط کے مطابق پیش کر دیتا تھا۔ ۱۹۸۰ء میں حکومت پاکستان نے انہیں ستارۂ امتیاز دینے کا اعلان کیا۔ وہ فوجی حکومت سے ایوارڈ لینے میں متردّد تھے۔ ایک روز میں حاضر خدمت ہوا تو اتفاق سے کوئی اور شخص موجود نہ تھا۔ کہنے لگے: ''آپ بڑے موقع سے آئے ہیں۔ ایک اہم معاملے میں آپ سے صلاح لینی ہے۔'' جب اصل بات بتائی تو میں نے تعجب سے پوچھا: ''آپ اس بارے مجھ سے مشورہ طلب کر رہے ہیں؟'' بولے: ''جی ہاں! آپ کو شاید اندازہ نہیں کہ میں آپ کی

رائے کو کتنی اہمیت دیتا ہوں۔" میں کچھ دیر خاموش رہا پھر ہمت کر کے عرض کیا: "یہ ایوارڈ آپ اپنے ملک کے سربراہ سے ہی وصول کریں گے نا، جس کو برسر اقتدار لانے میں آپ کا کوئی دخل نہ تھا۔ لوگ تو دشمن ملکوں سے بھی انعام حاصل کر لیتے ہیں۔ اگر آپ انکار کر دیں گے تو اس کے نتائج پر بھی غور کر لیجیے۔ اب وہ جوانی کا دور نہیں ہے جب آپ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے کے قابل تھے۔ اگر خود پر نہیں تو اپنے گھر والوں، عزیزوں اور محبوں پر رحم کیجیے۔ زندگی میں کبھی ایمان کے تیسرے درجے پر بھی اکتفا کرنی پڑتی ہے۔" میری گزارشات سن کر بولے: "میرے اہل خانہ کا بھی یہی مشورہ ہے جو آپ نے دیا ہے۔" غرض انہوں نے ایوارڈ وصول تو کر لیا لیکن طوعاً و کرہاً۔

زندگی کے آخری برسوں میں ندیم صاحب کو دمے کے مرض نے بڑی اذیت دی۔ اس کے باوجود ان کا حوصلہ قابل داد تھا۔ وقفے وقفے سے ہسپتال میں داخل ہونا پڑتا جہاں خاص قسم کے انجکشن لگائے جاتے۔ اس سے وقتی طور پر طبیعت سنبھل جاتی اور وہ اپنے فرائض منصبی ادا کرنے پر مستعد ہو جاتے۔ وہ اپنے بلند اخلاق کے باعث ملاقاتیوں کا اٹھ کر استقبال کرتے تھے۔ میرے ساتھ بھی یہی سلوک مرعی رکھتے۔ آخر آخر میں علالت کے سبب اٹھتے ہوئے تکلیف ہوتی تھی تو میں ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی لپک کر ان کا ہاتھ تھام لیتا اور اٹھنے نہ دیتا تھا۔ ثقل سماعت بھی لاحق ہو گیا تھا جس سے فون پر گفتگو ممکن نہ رہی۔ ہاں ضرورت پڑنے پر خط لکھ دیتے تھے۔ "فنون" کے شمارہ ۱۲۴ میں میرا مضمون "دیا کہاں گئے وے لوگو" چھپا تو اس کا ایک پورا صفحہ غائب تھا۔ اس پر انہوں نے ۳۰ جولائی ۲۰۰۵ء کو مجھے معذرت کا خط لکھا اور رہ جانے والے صفحے کی نقل طلب کی تا کہ آئندہ شمارے میں شائع ہو سکے۔ میں نے خط کا جواب دینے کے بجائے خود حاضری دینا مناسب سمجھا۔ ماہ اگست میں دو بار جانا ہوا لیکن ملاقات نہ ہو سکی۔ پھر ان کا ۳ ستمبر کا تحریر کردہ مکتوب ملا۔ لکھا تھا:

> "برادرم عزیز و مکرم۔ سلام مسنون۔ ایک عریضہ بھجوا چکا ہوں جس میں آپ کے کرداری خاکے کے صفحات غلط جڑنے کی معذرت کی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ اگر آئندہ شمارے میں وضاحت کرنا چاہیں تو مجھے اپنی تحریر بھجوا دیں۔ اسے ہر صورت میں درج کروں گا۔"

خط کے آخر میں یہ فقرے تھے جنہیں پڑھ کر میری آنکھیں نم ہو گئیں:

"میری صحت بدستور ہے مگر مقابلہ کیے جا رہا ہوں۔ دیکھیے کب تک؟"

''فنون'' کے اگلے پرچے میں انہوں نے میرے مضمون کا چھوٹ جانے والا حصہ شائع کیا اور ''حرف اوّل'' میں بدیں الفاظ معذرت کی: ''فنون' شمارہ ۱۲۴ میں ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کی کردار نگاری کے ایک موضوع 'دیا کہاں گئے وے لوگوا' کی کاپیاں جوڑنے میں پیسٹر سے ایک کوتاہی ہو گئی جس کی وجہ سے متذکرہ مضمون کو گزند پہنچا۔ اس کے لیے ادارہ 'فنون' قارئین کرام اور ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی سے معذرت کے ساتھ درج ذیل تحریر کے ذریعے اس فروگذاشت کے ازالے کی کوشش کر رہا ہے۔'' اس کے ذیل میں وہ باقی ماندہ حصہ درج کیا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ 'فنون' کا صرف ایک اور شمارہ (نمبر ۱۲۶) نکال پائے جو نومبر ۲۰۰۵ء سے مارچ ۲۰۰۶ء تک کے عرصے پر محیط تھا۔

اپریل سے جولائی ۲۰۰۶ء کے اوائل تک کے تین ماہ امید و بیم کی کیفیت میں گزرے۔ بالآخر ۱۰ جولائی کی صبح کو وقت موعود آ پہنچا اور یہ بلبل شیریں مقال اپنی منزل کو پرواز کر گیا۔

ندیم بھائی جان نے پہلی ملاقات سے لے کر دم واپسیں تک مجھے اتنا پیار دیا اور میرے ایسے ناز اٹھائے کہ کوئی حقیقی بڑا بھائی تو کیا شاید باپ بھی بیٹے کے نہ اٹھاتا ہو۔ ان سے میرے نیازمندانہ اور برادرانہ مراسم کا شجر سایہ دار کوئی نصف صدی تک سرسبز و شاداب رہا۔ ان کے جانے سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے چاروں کھونٹ اندھیرا چھا گیا ہو۔ اس روز جب میں نے آخری بار ان کا چہرہ دیکھا تو بے اختیار امیر خسرو کا وہ دوہا یاد آیا، جو انہوں نے حضرت نظام الدین اولیا کے وصال کے بعد کہا تھا:

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چودیس

کیا عمارت "قضا" نے ڈھائی ہے

پروفیسر عبدالوحید قریشی (۱۹۲۵ء - ۲۰۰۹ء)

۲۷ شوال ۱۴۳۰ھ (۱۷ اکتوبر ۲۰۰۹ء) کو عصر کے وقت میرے اساتذہ کے سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی ٹوٹ گئی، اس کہکشاں کا آخری ستارہ راہیٔ منزل عدم ہو گیا، ایک ہنگامہ پرور زندگی اپنے اختتام کو پہنچ گئی، ایک توانا اور گمبھیر آواز موت کے سناٹوں میں کھو گئی۔

پروفیسر ڈاکٹر عبدالوحید قریشی مرحوم سے میری نیازمندی پوری نصف صدی پر محیط ہے یعنی ستمبر ۱۹۵۹ء میں اورینٹل کالج میں داخلے سے لے کر ان کے سانحۂ ارتحال تک۔ وہ اقبالیات کی تدریس کے لیے اسلامیہ کالج (سول لائنز) سے اورینٹل کالج آیا کرتے تھے۔ جواں سال، خوش پوش، بلند آواز، جسم ابھی مائل بہ فربہی تھا۔ کلاس میں داخل ہوتے ہی حاضری لینے کے بعد زیرنظر موضوع کے خاص نکات پر مبنی ایک کاغذ سامنے رکھ لیتے اور بے تکان بولنا شروع کر دیتے۔ لیکچر سے فارغ ہوتے ہی اسلامیہ کالج لوٹ جاتے۔ جو طلبہ پرچے سے متعلق کسی عنوان پر کچھ لکھ کر دکھانا چاہتے ان کی کاپیاں ساتھ لے جاتے اور اگلے دن درستی کے بعد واپس کر دیتے۔ اس محدود وقت میں کسی طالبعلم کے لیے ان کا قرب حاصل کرنا امر محال تھا۔

ستمبر ۱۹۶۰ء میں ایم اے کا نتیجہ نکلا تو میں اپنے بعض دوسرے اساتذہ کی طرح ان کی خدمت میں بھی، سمن آباد والے مکان پر حاضر ہوا۔ بڑے خوش ہوئے۔ دوران گفتگو کہنے لگے: "بھئی میرے پرچے میں تو آپ ہی کے نمبر سب سے زیادہ تھے۔" میں نے تعجب سے پوچھا: "آپ کو کیسے پتا چلا؟" بولے: "میں آپ کا خط پہچانتا ہوں۔" میرا بطور لیکچرار پہلا تقرر مظفر گڑھ

میں ہوا تھا۔ جب کبھی لاہور آتا ان کی خدمت میں بھی حاضری دیتا۔ میرے بہنوئی مرحوم خورشید احمد خاں یوسفی بھی سمن آباد میں رہتے تھے۔ شام کے وقت ہم دونوں پہنچ جاتے اور دیر تک ان کی گفتگو سے مستفید ہوتے۔ وہاں پاک و ہند کے بعض اہل علم سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ ان میں پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی اور ڈاکٹر مختار الدین احمد جیسے نام بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر صاحب جلد ہی اسلامیہ کالج سے مستقل طور پر یونیورسٹی اورینٹل کالج آ گئے تھے اور یہاں بتدریج صدر شعبۂ اردو اور پرنسپل کے عہدوں تک پہنچے۔ اب ان کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملا۔ بڑی دبنگ شخصیت کے مالک تھے، منضبط استاد اور سخت گیر منتظم۔ فقرے بازی میں طاق اور جوڑ توڑ کے بے تاج بادشاہ تھے۔ قولاً اور عملاً کسی سے شکست کھانا نہیں جانتے تھے۔ اس بنا پر ان کے شاگرد ہی نہیں کالج کے نئے پرانے اساتذہ بھی ان سے کنی کتراتے تھے۔ مولانا نور الحسن خاں تو ان کے کمرے کے آگے سے گزرتے ہوئے اپنے کسی ساتھی سے کہہ دیتے تھے: ''بھائی! یہ غار ثور ہے۔ دبے پاؤں نکل چلو۔'' دراصل ڈاکٹر صاحب کا خاندان محکمہ پولیس سے وابستہ رہا تھا۔ ان کے والد اور دادا نیز بعض قریبی عزیز پولیس افسر رہے تھے۔ اسی ماحول میں ان کی پرورش ہوئی تھی۔ خود رائی ان کے مزاج میں تھی۔ اچھے اچھوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ان کا اپنا قول ہے:

میں اپنی انا کا ہوں پجاری
میں اپنی ہی قبر کا دیا ہوں

ہاں مولوی محمد شفیع صاحب اور ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کا احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ حافظ محمود شیرانی سے انہیں گہری عقیدت تھی جس کا اظہار ان کی باتوں سے ہوتا رہتا تھا۔ ایک بار بڑے دکھ سے کہنے لگے: ''ہماری بدنصیبی دیکھیے۔ شیرانی صاحب کے قیام لاہور کے آخری دنوں میں ہم گوجرانوالہ میں انٹر کے طالبعلم تھے۔ اتنی توفیق نہ ہوئی کہ لاہور آ کر ان کو دیکھ ہی لیتے۔'' مجھ پر ان کی خصوصی شفقت کا اصل سبب بھی حافظ صاحب سے ان کی محبت ہی تھی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ میں اپنے پچاس سالہ تعلقات کے نصف اوّل میں ان سے محتاط رہا۔ بس یوں سمجھیے کہ ''گلستان سعدی'' کی شیر اور سیاہ گوش والی حکایت کی سی کیفیت تھی۔

جن دنوں صدر شعبہ تھے۔ انہوں نے ''حافظ محمود شیرانی اور ان کی علمی و ادبی خدمات'' کے

موضوع پر مجھ سے مقالہ لکھوانے کی ٹھانی۔ میں نے ان کی رہنمائی کی شرط پیش کی۔ مان گئے۔ ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد میں نے سوانحی باب لکھ کر دکھایا۔ خوش ہو کر کہنے لگے: ''اب ایک ایک باب مجھے دکھانے کی ضرورت نہیں۔ پورا مقالہ لکھ ڈالو۔'' اگلا باب لسانیات پر تھا۔ اس نے طوالت پکڑی۔ جب سلسلہ فولز کیپ سائز کے ساڑھے چار سو صفحات سے آگے بڑھا تو میں گھبرا گیا اور ان کی خدمت میں یہ تجویز لے کر حاضر ہوا کہ مقالے کا موضوع ''حافظ محمود شیرانی اور ان کی لسانی خدمات'' تک محدود کر دیں۔ بہت بگڑے۔ کہنے لگے: ''اسے مختصر کرو اور خاکے کے مطابق دس ابواب میں شیرانی صاحب کے سارے علمی پہلوؤں کا احاطہ کرو۔'' یہ بھی کہا: ''اگر تم یہ کام نہیں کرو گے تو پھر یہ کبھی نہ ہو سکے گا۔'' میں اپنا سا منہ لے کر لوٹ آیا۔ اسی تگ و دو میں تین سالہ مدت میں سے صرف چھ ماہ باقی رہ گئے۔ میں نے ان سے میعاد میں ایک سال کی توسیع دلوانے کی درخواست کی۔ بولے: ''یہ ممکن نہیں ہے۔'' میں مایوس ہو کر واپس آ گیا اور کام بند کر دیا۔ کچھ دن گزرے تو ڈاکٹر صاحب کی طرف سے طلبی کے پیغام آنے لگے۔ طوعاً و کرہاً پہنچا۔ کہنے لگے: ''اس مقالے کی تکمیل کے لیے ایک سال کی توسیع قطعاً ناکافی ہے۔ تم نئے سرے سے درخواست دو تا کہ تین سال اور مل سکیں۔'' یہ حل میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ بہر حال ایسا ہی کیا۔ یوں ۲۱۰۰ صفحات پر محیط مقالہ تیار ہوا۔ ان کو دکھایا تو کہا: ''اس کو مختصر کرو۔'' دوبارہ لکھا تو ۱۸۰۰ صفحے بنے۔ حکم ہوا: ''ایک بار اور مختصر کرو۔'' غرض چھ سال کے عرصے میں ۱۵۰۰ صفحات پر مشتمل مقالے کی تکمیل ہوئی۔ ان دنوں وہ مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین تھے۔ میں مقالہ لے کر ایک شام اسلام آباد میں ان کی قیام گاہ پر پہنچا۔ اس بار ان کی مسرت دیدنی تھی۔ فرمانے لگے: ''حافظ محمود شیرانی کی ہمہ گیر شخصیت پر اس سے زیادہ اختصار ممکن ہی نہیں۔ یہ تمہارے تحریر کردہ دس ابواب نہیں دس کتابیں ہیں۔'' یوں میں نے مسلسل چھ برس تک خوف و رجا کے عالم میں رہنے کے بعد اطمینان کا سانس لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب اپنی نگرانی میں مقالہ لکھنے والوں کے منہ میں لقمے ڈالنے کے مطلق قائل نہ تھے۔ ان کی مثال پیراکی کے ان روایتی استادوں کی سی تھی جو پہلے ہی دن کسی نئے شاگرد کو ساتھ لے جا کر دریا میں دھکا دے دیتے تھے اور خود کنارے پر کھڑے اس پر نظر جمائے رکھتے تھے کہ ڈوبنے نہ پائے۔ اسی بنا پر جب اس ملاقات میں انہوں نے مجھ سے سوال کیا: ''یہ بتاؤ اس چھ سالہ مدت میں تمہاری ذہنی استعداد میں کتنا فرق پڑا؟'' تو

میری آنکھوں میں تشکر کے آنسو آ گئے۔ یہ بھی فرمایا: ''شاگردوں کی رہنمائی کے معاملے میں شیرانی صاحب کا بھی یہی طریق کار تھا۔'' قیام اسلام آباد کے دوران میں ڈاکٹر صاحب کے دمے کی شکایت بڑھ گئی تھی۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے بڑے اطمینان اور کسی حد تک فخریہ انداز میں کہنے لگے: ''شیرانی صاحب کو بھی تو یہی مرض لاحق تھا۔'' اس دن کے بعد میرے دل میں ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا تصور بالکل بدل گیا، ذہن پر طاری ان کا خوف جاتا رہا اور کھل کر گفتگو کرنے میں جو جھجک مانع تھی دور ہو گئی۔

عمر کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب کا تن و توش بڑھتا گیا اور سچ پوچھیے تو یہ ان کی پہچان بن گیا تھا۔ ہمیشہ سے سنتے آئے تھے کہ انسان کی جسامت اور اس کی دانش میں بالعکس نسبت ہوتی ہے لیکن وحید قریشی صاحب اس کلیے سے استثنیٰ کی روشن مثال تھے کہ جسیم بھی تھے اور بیدار مغز بھی، گویا قدرت خداوندی کی ایک نشانی تھے۔ چنانچہ میں اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا کہ ہمارے ڈاکٹر صاحب بجا طور پر آیت اللہ کہلانے کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے بڑی بھرپور زندگی گزاری۔ اردو، فارسی اور پنجابی تینوں شعبوں سے ان کا طویل تدریسی تعلق رہا۔ یوں براہ راست اور بیک واسطہ شاگردوں کی تعداد کے اعتبار سے اورینٹل کالج کا کوئی استاد شاید ان سے سبقت نہ لے جا سکے۔ ان کے دوستوں کا دائرہ بھی بڑا وسیع تھا۔ پاکستان اور ہندوستان کے بہت سے صاحبان و طالبان علم سے ان کی مراسلت رہتی تھی۔ ان خطوط کی ایک کثیر تعداد باقاعدہ ترتیب کے ساتھ ان کے پاس محفوظ تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی مخالفت بھی ہوئی۔ ان کے رویے سے کئی لوگ نالاں رہے اور ان سب کی جملہ شکایات بلا جواز نہ تھیں۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ علمی مصروفیات کے دائرے میں ان کے دوست زیادہ تھے اور انتظامی معاملات میں صورت برعکس تھی۔

علمی و ادبی موضوعات پر ڈاکٹر صاحب کا تحریری کام بڑا وقیع ہے۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ اگر وہ اپنے ذہنی قویٰ انتظامی امور اور ان سے متعلق اکھاڑ پچھاڑ میں صرف نہ کرتے تو یقیناً کہیں زیادہ قلمی یادگاریں چھوڑتے۔ ان کی مصروفیات کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ لکھنے پڑھنے، تدریسی ذمہ داریاں نبھانے، منتہی طلبہ کی رہنمائی کرنے اور اپنے دیگر فرائض منصبی ادا کرنے کے ساتھ ساتھ وہ بیک وقت بیسیوں علمی ادبی انجمنوں کے عہدیدار اور رکن ہوا کرتے تھے۔ ایک

صاحب کا، جنہوں نے ایسی انجمنوں اور مجالس کی فہرست تیار کی تھی جن سے ڈاکٹر صاحب کی وابستگی رہی، کہنا تھا کہ ان کی تعداد سو سے اوپر ہے۔

۵ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو حافظ محمود شیرانی کی ولادت کو پورے سو سال ہونے والے تھے۔ ان کی صد سالہ تقریب ولادت منانے کی غرض سے ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے ۱۹۸۰ء کے اوائل میں مجلس یادگار حافظ محمود شیرانی قائم کی۔ پہلے ڈاکٹر سید عبداللہ کو اس کی صدارت پیش کی۔ انہوں نے عدم فرصت کا عذر کیا تو خود یہ ذمہ داری سنبھالی۔ خورشید یوسفی مرحوم اور میں ان کے کارکن تھے مگر ہم دونوں ہی سٹیج کے آدمی نہ تھے، اس لیے شیخوپورہ کے کالج سے میرے رفیق کار اور اپنے شاگرد پروفیسر عبدالجبار شاکر کو، جو بہت اچھے مقرر تھے، بلوا کر مجلس کا معتمد عمومی مقرر کیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، حکیم نیر واسطی اور احمد ندیم قاسمی صاحبان کو سرپرست بنایا۔ غرض یہ کہ اکتوبر ۱۹۸۰ء کے پہلے عشرے میں بڑی کامیاب تقریبات ہوئیں۔ یونیورسٹی سینیٹ ہال، اورینٹل کالج اور اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) میں منعقد ہونے والے جلسوں کے علاوہ لاہور میوزیم میں شیرانی صاحب کی کتابوں اور ان کی ذاتی اشیا کی نمائش ہوئی، رسالوں کے خاص نمبر نکلے، مینارڈ ہال کا نام شیرانی ہال رکھا گیا اور ڈاک کا یادگاری ٹکٹ جاری ہوا۔ ان سرگرمیوں کا مرکز و محور ڈاکٹر وحید قریشی صاحب ہی کی ذات گرامی تھی۔

اسلام آباد سے واپس آکر وہ پہلے بزم اقبال اور پھر اقبال اکیڈمی کے سربراہ رہے۔ اس کے بعد فراغت پا کر خانہ نشین ہو گئے۔ البتہ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کی نظامت اور قائداعظم لائبریری کے مجلّے ''مخزن'' کی ادارت انہوں نے تاحین حیات نبھائی۔ اس اثنا میں وہ سمن آباد والا مکان چھوڑ کر ای ایم ای کالونی منتقل ہو چکے تھے۔ میں نے تو ان کے اس فیصلے پر دبی زبان میں احتجاج بھی کیا لیکن اپنی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ ڈھلتی عمر میں ڈاکٹر صاحب کو دمے کے علاوہ کئی عوارض لاحق ہو گئے۔ سب سے بڑا دکھ یہ تھا کہ چند برس قبل ایک حادثے میں ان کی دونوں ٹانگیں مفلوج ہو گئیں۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر صدمہ بھی ہوتا تھا اور عبرت بھی۔ مگر انہوں نے تمام مصائب کا بڑی پامردی سے مقابلہ کیا۔ کمال یہ تھا کہ ان کے ذہن کی براقی اور آواز کی گھن گرج آخر آخر تک برقرار رہی۔

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کا یہ ایثار ہمیشہ یاد رکھا جائے گا کہ انہوں نے اپنا بیش بہا کتب

خانہ، جوان کا عمر بھر کا اندوختہ تھا اور جس کے حصول کی خاطر ''ہمدرد'' والوں نے نصف کروڑ روپے کی پیشکش کی تھی، بطور عطیہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور کو دے دیا۔ اظہار تشکر کے طور پر یونیورسٹی نے انہیں اپنا استاد ممتاز قرار دیا اور یوں وہ ہفتے میں ایک بار منگل کے دن جی سی یونیورسٹی آنے لگے۔ ہر منگل کو پہر دن چڑھے یونیورسٹی کے دو ملازم ایک بڑی گاڑی میں ان کی قیام گاہ سے انہیں مع ان کی پہیوں والی کرسی کے لے کر آتے اور یہاں تین چار گھنٹے گزارنے کے بعد جب وہ جانا چاہتے تو انہیں واپس لے جاتے۔ میں کچھ عرصے سے شعبۂ فارسی کے اردو فارسی لغت کے منصوبے میں کام کر رہا تھا۔ ہم لوگوں کو یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب نے ہمارے شعبے کی لائبریری میں بیٹھنا پسند کیا جہاں نہ صرف شعبے کا عملہ انہیں گھیرے رکھتا بلکہ لاہور اور بیرون لاہور کے اساتذہ اور دیگر اہل علم ان سے استفادے کے لیے پہنچ جاتے۔ ہر وقت میلہ سا لگا رہتا۔ بڑے خوشگوار ماحول میں علمی باتیں ہوتیں۔ یہاں ڈاکٹر صاحب سب سے ہنسی مذاق کی باتیں کرتے اور اپنے سارے دکھ درد بھول جاتے۔ شعبہ کے صدر ڈاکٹر محمد اقبال ثاقب اور ان کے دو رکنی سٹاف (میڈم طاہرہ یاسمین اور بابر نسیم آسی) کے علاوہ تین سابق صدور شعبہ ڈاکٹر محمد سرور رانا، پروفیسر محمد انور خان وڑائچ اور پروفیسر محمد رفیق بھی وہیں مصروف کار تھے جیسے ایک خاندان کے افراد ہوتے ہیں۔ یہ ایک انوکھا اجتماع تھا کیونکہ عموماً صدر شعبہ کی مثال ایک چھوٹے سے بادشاہ کی ہوتی ہے جس کے لیے کہا گیا ہے: ''دو پادشاہ در اقلیمی نگنجند۔'' ڈاکٹر وحید قریشی اس ماحول پر فریفتہ تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنی سابقہ ملازمتوں کے دوران محکمانہ سیاست میں سرگرم حصہ لینے پر پشیمان ہوں۔ چنانچہ ایک روز جب کسی باہر سے آنے والے شخص نے ان سے پوچھا کہ وہ شعبۂ اردو میں کیوں نہیں بیٹھے تو انہوں نے بے ساختہ کہا: ''نا بھئی نا! وہاں کا ماحول مجھے بالکل نہیں بھاتا۔'' پھر ذرا توقف کے بعد یہ معنی خیز جملہ کہا: ''ہم نے ساری عمر ان باتوں سے کیا کمائی کی۔''

مختصر وقفوں سے قطع نظر دو اڑھائی برس تک ڈاکٹر صاحب کی ہفتہ وار آمد کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس عرصے میں انہوں نے مجھ پر جو شفقتیں نچھاور کیں وہ میں کبھی نہ بھلا سکوں گا۔ ہم سب منگل کے دن کا بڑے اشتیاق سے انتظار کرتے۔ جونہی ڈاکٹر صاحب آتے تو مجھے اپنے کمرے میں اطلاع ملتی۔ کبھی کبھی میں جان بوجھ کر ان کے پاس جانے میں تاخیر کرتا کہ دیکھیں یاد کرتے

ہیں یا نہیں۔ ذرا دیر بعد بلاوا آ جاتا۔ میرا دستور تھا کہ جاتے ہی دست بوسی کے بعد اپنا سر ان کے سینے سے لگا دیتا۔ وہ میرا سر سہلاتے اور کبھی پیٹھ بھی تھپکتے۔ ان کی خواہش ہوتی تھی کہ جتنی دیر وہ شعبہ فارسی میں موجود رہیں میں ان کے پاس بیٹھوں۔ جب ان کے گرد لوگوں کا مجمع ہو جاتا تو میں اپنے کام کے خیال سے کھسک کر اپنے کمرے میں آ جاتا لیکن جونہی انہیں میری غیر موجودگی کا احساس ہوتا فوراً بلوا لیتے۔ ان دنوں وہ مجھے ''شیرانی صاحب'' کے ساتھ ساتھ ''شیرانی بیٹا'' کہہ کر مخاطب کرنے لگے تھے۔ یہ ان کی بے پایاں محبت کا اظہار تھا ورنہ عمر میں وہ مجھ سے صرف دس ایک برس بڑے تھے۔

ایک دن میں خدمت میں پہنچا تو حاضرین سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: ''دیکھو جی! میرے جتنے شاگرد تھے سب کے سب استاد ہو گئے۔ ایک یہ ہے کہ ابھی تک شاگرد ہی ہے۔'' میں نے کہا: ''ڈاکٹر صاحب! ہماری عزت آپ کا شاگرد رہنے ہی میں ہے۔'' ''کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ'' کے مصداق اب میں ان سے ہلکے پھلکے مذاق بھی کر لیتا تھا۔ ایک دن اورینٹل کالج سے شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر ضیاالحسن آئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کو مشورہ دیتے ہوئے کہا: ''آپ کی جو کتاب بھی مکمل ہو اسے فوراً چھپوا دیا کریں۔ اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ ہر سال آپ کی ایک نہ ایک کتاب شائع ہو جایا کرے گی۔ میری عمر جب ساٹھ سال ہوئی تو میری ساٹھ ہی کتابیں چھپ چکی تھیں۔'' اس پر مجھ سے نہ رہا گیا۔ بڑی سادگی سے کہا: ''اس کا مطلب ہے کہ آپ نے پیدا ہوتے ہی کتابیں لکھنا شروع کر دی تھیں۔'' اس پر اتنا ہنسے کہ دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ تھام لیا۔ ایک اور موقع پر میری کوئی بات سن کر انہیں ایسی زوردار ہنسی چھوٹی کہ پیٹ میں بل پڑ گیا۔ بابر نسیم آسی نے دونوں ہاتھوں سے مل مل کر اس بل کو تحلیل کیا۔

جب ڈاکٹر صاحب تھکن محسوس کرتے تو سب ساتھی مل کر ان کی ٹانگیں، بازو اور مونڈھے دابنے لگتے۔ میں نے کئی بار کوشش کی کہ میں بھی اس خدمت میں حصہ لوں لیکن نجانے کیوں وہ مجھے سختی سے روک دیتے تھے۔ میں اصرار کرتا کہ آپ مجھے اس سعادت سے کیوں محروم رکھتے ہیں پر انہوں نے مان کر ہی نہ دیا۔ بابر آسی نے ان کی بڑی خدمت کی۔ جسم میں ہیموگلوبن کم ہو جانے کی صورت میں ڈاکٹر صاحب کو خون کی ضرورت پڑتی رہتی تھی۔ اس کی فراہمی میں بابر بھی سرگرم حصہ لیتا تھا۔ ایک بار ڈاکٹر صاحب ہسپتال میں داخل تھے۔ اچانک خون کی ضرورت پڑ گئی۔ دھان پان

بابر آسی نے بے دھڑک اپنا خون دے دیا۔ چند روز بعد طبیعت سنبھلنے پر جب ڈاکٹر صاحب جی سی یونیورسٹی آئے تو بابر سے کہنے لگے: ''یار! جب سے تیرا خون مجھے لگا ہے میرا دل شرارتیں کرنے کو چاہتا ہے۔''

ڈاکٹر صاحب کا علمی معیار بہت اونچا تھا اس لیے انہیں اپنی سطح سے کم درجے کی تحریریں پسند نہیں آتی تھیں۔ وہ اس اصول پر بھی کاربند تھے کہ شاگردوں کے کاموں کی تعریف سے ان کے بگڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ تاہم قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں میرے بعض کام یقیناً پسند آئے تھے۔ مثلاً میری تدوین نو اور اردو ترجمے کے ساتھ شائع ہونے والی کتاب ''معربات رشیدی'' کے بارے میں ایک دن دوستوں کی موجودگی میں یوں رائے زنی کی: ''میں باوجود کوشش کے اس میں کوئی خامی تلاش نہیں کر سکا۔'' اسی طرح جب میرے تحریر کردہ خاکے ''فنون'' اور ''صحیفہ'' میں چھپے تو وہ انہیں اچھے لگے ہوں گے کیونکہ آگے چل کر انہوں نے ''مخزن'' کے لیے مجھ سے بعض شخصیات پر لکھنے کی فرمائش کی۔ ڈاکٹر ضیاالدین دیسائی، احمد ندیم قاسمی اور رشید حسن خاں پر میری تحریریں اسی فرمائش کا نتیجہ تھا۔ گویا عمر عزیز کے آخری چند برسوں میں، کم از کم میری حد تک، انہوں نے اپنا پرانا اصول ترک کر دیا تھا۔ ممکن ہے یہ سمجھتے ہوں کہ اب اس عمر میں اس کے بگڑنے کی کیا گنجائش باقی رہ گئی ہے۔ بہرحال یہ قدر افزائی، جو ان کی بے پناہ شفقت کی آئینہ دار تھی، میرے لیے ایک قیمتی اثاثے کی حیثیت رکھتی ہے۔ تحدیث نعمت کے طور پر اس کی چند مثالیں میں یہاں درج کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

جب سے ڈاکٹر صاحب نے جی سی یونیورسٹی آنا شروع کیا تھا اس وقت سے برابر مجھے کہتے رہتے تھے کہ میرے کئی کام ادھورے پڑے ہیں۔ تم وقت نکالو اور انہیں مکمل کر دو۔ ان پر میرا اور تمہارا دونوں کا نام آئے گا۔ میں عرض کرتا کہ ڈاکٹر صاحب یہ تو میری عزت افزائی ہے لیکن میں دن بھر یہاں مصروف رہتا ہوں۔ میرے اپنے بعض کام نامکمل حالت میں ہیں۔ اس لغت کے طویل کام سے فراغت ملے تو انشاء اللہ پہلے آپ کے کام کروں گا اور بعد میں اپنے۔ ان کے مسلسل تقاضوں سے شرمندہ ہو کر ایک بار میں نے یہ تجویز پیش کی کہ میں جی سی یونیورسٹی کی ملازمت سے مستعفی ہو کر ان کے اور اپنے ناتمام کاموں پر مصروف ہو جاتا ہوں۔ لیکن اس پر وہ آمادہ نہ ہوئے بلکہ دوسرے دن گھر سے فون کر کے تاکید کی کہ فارسی لغت کا کام چھوڑ کر ہرگز نہ

جانا۔ ان کے کاموں کی تفصیل جاننے کی نوبت بھی نہ آئی، البتہ ایک کے بارے میں علم ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کشن چند اخلاص کے ''تذکرۂ ہمیشہ بہار'' کی تدوین کی تھی جو ۱۹۷۳ء میں انجمن ترقی اردو (کراچی) نے شائع کیا تھا۔ اس کی اشاعت کے بعد ڈاکٹر صاحب کو اس تذکرے کے ایک ایسے نسخے کی اطلاع ملی جو قدیم تر اور زیادہ مفصل تھا۔ انہوں نے اس کی مائیکروفلم منگوائی تاہم اس کی روشنی میں وہ اپنی مرتبہ اشاعت پر نظر ثانی نہ کر سکے۔ وہ یہ کام مجھ سے لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ وفات سے کچھ عرصہ قبل یہ مائیکروفلم مجھے عنایت کرتے ہوئے یہ حسرت آمیز جملہ کہا: ''اب اس تذکرے کا نظر ثانی کردہ ایڈیشن تم اپنے نام سے شائع کرا دینا۔'' اور مجھے دادا جان کی وفات سے قبل ان کی کہی ہوئی الوداعی نظم کا یہ شعر بے اختیار یاد آ گیا:

جاتے ہیں خالی ہاتھ گلستانِ دہر سے
اک سنگِ آرزو ہے جو سینے پہ دھر چلے

ایک بار بابر نسیم آسی ہنستا ہوا میرے پاس آیا۔ میں نے ہنسی کا سبب پوچھا۔ کہنے لگا: ''میں ڈاکٹر صاحب کے مونڈھے داب رہا تھا۔ مجھ سے کہنے لگے: 'تم اپنا ایم فِل کا مقالہ مکمل کر کے، جمع کرانے سے پہلے مجھے دکھا لینا۔' میں نے جواب دیا: 'ضرور سر! بھلا اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔' پھر ذرا رک کر پوچھا: 'تمہارے مقالے کے نگران فلاں صاحب ہیں نا؟' میں نے عرض کیا: 'نہیں سر! میرے نگران تو شیرانی صاحب ہیں۔' یہ سنتے ہی پکار اٹھے: 'بس بس، پھر مجھے دکھانے کی ضرورت نہیں۔' یہ آخری فقرہ انہوں نے جس انداز سے کہا مجھے اس پر ہنسی آ رہی ہے۔''

حافظ شیرازی نے کہا تھا:

اگرچہ عرضِ ہنر پیشِ یار بی ادبی است
زباں خموش ولیکن دہاں پر از عربی است[1]

پتا نہیں شاعر کا یہ دعویٰ کس حد تک درست ہے لیکن ''عرض ہنر پیش استاد'' یقیناً بے ادبی ہے۔ مجھے اپنے اساتذہ کی مہربانی سے جو شُد بُد حاصل ہوئی، ان کے سامنے اس کے اظہار کی کبھی جسارت نہیں کی۔ ہوا یوں کہ ''نصرت نامۂ ترخان'' کی جامعہ کراچی والی اشاعت پر میرا تبصرہ

''فنون'' میں چھپا تھا۔ ایک منگل کو ڈاکٹر صاحب کی محفل میں پروفیسر محمد رفیق صاحب نے کسی سلسلے میں اس کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: ''میں نے تو وہ نہیں پڑھا، مجھے بھی دکھایئے۔'' اگلی باران کی آمد پر میں نے تبصرے کی عکسی نقل پیش کر دی۔ اس میں ضمناً کچھ بے وزن اشعار کی تصحیح بھی کی گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے لیے یہ ایک انکشاف تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ایک ضخیم لیکن مغلوط دیوان کی درستی کا کام مجھے سونپ دیا۔ اس پر میرے کئی ماہ صرف ہو گئے۔ اس عرصے میں میں رفیق صاحب کو چھیڑتا رہتا تھا کہ آپ مجھے پھنسانے پر کمر بستہ رہتے ہیں۔

فارسی کے ایک پرانے اور اہم مخطوطے پر متعدد مہریں ثبت تھیں، جن میں سے بعض بہت مدھم تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے دو کے سوا ساری مہریں پڑھ لیں۔ ایک دن جی سی یونیورسٹی آتے ہی انہوں نے پروفیسر رفیق صاحب کو بلایا اور کہا: ''یہ دو مہریں پڑھنے کے لیے شیرانی صاحب کے پاس لے جائیں۔'' رفیق صاحب نے سابقہ تجربے کے پیش نظر پہلے تو کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر اپنی صفائی پیش کی: ''میں نے آپ کا نام بالکل نہیں لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے از خود آپ کے پاس بھیجا ہے۔'' میں ہنس پڑا اور پوچھا: ''بات کیا ہے؟'' انہوں نے مسئلے پر روشنی ڈالی۔ میں نے کہا: ''میں خود پندرہ پاروں کا حافظ ہوں۔ یہ ملیامیٹ مہریں کیونکر پڑھوں گا؟'' بہر حال جوں توں کر کے دونوں مہریں پڑھیں۔ رفیق صاحب نے موقع غنیمت جان کر غالباً شاہجہانی عہد کی ایک دستاویز کا عکس سامنے رکھ دیا جس پر ایک مدوّر مہر ثبت تھی۔ وہ اس دستاویز کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے ایما پر ''مخزن'' کے لیے ایک مضمون لکھ رہے تھے۔ کہنے لگے: ''یوں تو ڈاکٹر صاحب نے یہ مہر پڑھ لی ہے تاہم آپ بھی ایک نظر ڈال لیں۔'' ڈاکٹر صاحب نے مہر کی عبارت یوں پڑھی تھی:

''حافظ سعد اللہ خلف قاضی افضل حامی شرع رسول اللہ''

میں نے مہر کا نقش دیکھا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ لفظ ''حامی'' کا نمایاں حصہ صرف حا اور میم کی گھنڈی پر مشتمل تھا۔ میں نے رفیق صاحب سے کہا: ''میرے خیال میں یہ لفظ 'حامی' نہیں 'خادم' ہے۔'' بولے: ''آپ یہ کس بنا پر کہہ رہے ہیں جبکہ موجودہ حالت میں یہ دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے؟'' عرض کیا: ''میرا اختلاف اصولی بنیاد پر ہے۔ دنیا کا کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کی حمایت شریعت غرّہ کے لیے کوئی وقعت رکھتی ہے۔ قاضی پڑھا لکھا شخص ہوگا۔ اس سے اس حماقت

کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ یقیناً یہ لفظ خادم ہے۔'' کہنے لگے: ''یہ بات ڈاکٹر صاحب کو بتادوں؟'' میں نے کہا: ''بتانا ہی مناسب ہوگا۔'' وہ گئے اور ذرا دیر بعد آ کر کہا: ''یاد کر رہے ہیں۔'' میں حاضر ہوا تو فرمایا: ''آپ نے تو کمال کر دیا۔'' عرض کیا: ''کیسا کمال؟'' بولے: ''یہ جو آپ نے میری تصحیح کی ہے۔'' میں نے کہا: ''ڈاکٹر صاحب! میں نے تصحیح ہرگز نہیں کی۔ محض اپنا خیال ظاہر کیا ہے۔'' محبت آمیز مسرت سے فرمایا: ''نہیں جی! شاگرد استاد سے بڑھ گیا۔'' میں نے عرض کیا: ''ڈاکٹر صاحب! آپ جو چاہیں کہیں لیکن ہم تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا جو بھی مبلغ علم ہے وہ آپ جیسے اساتذہ کی جوتیاں سیدھی کرنے کا نتیجہ ہے۔''

ڈاکٹر صاحب کے ہر ہفتے یونیورسٹی آنے کا یہ سلسلہ ۲۰۰۷ء کے اواخر میں منقطع ہو گیا۔ ان کی طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی تھی۔ اب ان کا سارا وقت بستر ہی پر گزرتا تھا۔ ہسپتال کے چکر لگتے رہتے۔ ہم لوگ فون پر ان کی خیریت معلوم کرتے رہتے اور کوئی نہ کوئی حاضر خدمت ہوتا رہتا تھا۔ مہینے میں ایک بار شعبۂ فارسی کا عملہ یونیورسٹی کی گاڑی میں ان کے پاس پہنچتا۔ اگر اس معمول میں تاخیر ہوتی تو وہ فون پر تقاضا کرتے: ''بھئی کب آؤ گے۔ میں اداس ہو گیا ہوں۔'' ہم لوگ پہنچتے تو کھل اٹھتے۔ ایک ایک سے حال پوچھتے، علمی مصروفیات کے بارے میں استفسار کرتے، مشورے دیتے، ماکولات و مشروبات سے تواضع کرتے۔ جسمانی عوارض کے ہجوم کے باوجود بلند ہمتی کا یہ عالم تھا کہ ہم لوگوں سے ''مخزن'' کے آئندہ شماروں کے لیے مضامین اور مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کے لیے کتابوں کی فرمائش کرتے۔ مزاج کی شگفتگی بھی برقرار تھی۔

ایک دن ہم حسب معمول اکٹھے گئے۔ اتفاق سے ڈاکٹر خورشید رضوی بھی ساتھ تھے۔ قریشی صاحب دوران گفتگو کسی صاحب کا نام بھول گئے۔ کوشش کے باوجود نام یاد نہ آیا تو متاسفانہ لہجے میں کہنے لگے: ''اب تو دوستوں کے نام بھی بھول جاتے ہیں۔'' خورشید رضوی صاحب بول اٹھے: ''ڈاکٹر صاحب! دشمنوں کے نام تو یاد رہتے ہیں نا؟'' یہ سن کر ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور رضوی صاحب سے مخاطب ہو کر کہا: ''کمال ہے۔ مولویوں کی صحبت میں رہنے کے باوجود آپ کی حس مزاح کا یہ عالم ہے۔''

۲۰۰۹ء کے پہلے چھ ماہ امید و بیم کی کیفیت میں گزرے۔ فون پر گفتگو اور وقتاً فوقتاً ہماری حاضری کا سلسلہ جاری تھا۔ ذرا طبیعت سنبھلتی تو خود فون کر لیتے۔

۲ جولائی کو ہم باجماعت حاضر ہوئے۔ تکلیف کے باوجود ہمیں دیکھ کر بشاش ہو گئے۔ ایک ایک سے باتیں کیں۔ مجھ پر خاص شفقت فرمائی۔ فرمانے لگے: ''شیرانی بیٹے! مجھے تم پر بڑا ناز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے تمھیں کچھ نہیں دیا۔ تم جو کچھ بھی ہو یہ تمہارے خون کا اثر ہے......'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا: ''ڈاکٹر صاحب! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ بچہ اپنے ساتھ کچھ نہیں لاتا۔ سب کچھ اپنے اساتذہ سے حاصل کرتا ہے۔'' اس سے قبل کئی بار میرے مقالات کا مجموعہ تیار کر کے دینے کا تقاضا کر چکے تھے۔ اس روز بھی یہی مطالبہ کیا۔ اس ملاقات میں پہلی بار مجھے ان کی باتوں میں اضمحلال کی جھلک نظر آئی۔

۲۷ اگست کو ڈاکٹر صاحب نے شعبہ فارسی میں مجھے فون کیا۔ لہجے میں مایوسی تھی۔ کہنے لگے: ''میں اپنا کام سمیٹ رہا ہوں۔ تم آؤ اور میرے پاس موجود کتابوں میں سے، جو تمہارے کام کی ہوں، لے جاؤ۔'' اگلے دن میں اور رفیق صاحب پہنچ گئے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ فزیو تھراپی کرانے والا آیا ہوا تھا۔ کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر چابیاں دیں کہ کمرہ کھول کر کتابیں چھانٹ لو۔ کمرے میں مخطوطات اور مطبوعات کے علاوہ رجسٹر اور فائلیں بھی تھیں۔ ہر چیز پر گرد کی دبیز تہ جمی ہوئی تھی۔ ہمارے حوصلے پست ہو گئے۔ روزے میں دھول پھانکنا دشوار معلوم ہوا۔ رفیق صاحب نے تجویز پیش کی کہ یہ کام رمضان کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ کمرہ بند کر کے ڈاکٹر صاحب سے معذرت کی کہ ہم چند روز ٹھہر کر حاضر ہوں گے۔ کچھ دنوں بعد پھر فون آیا جو زیادہ مایوسی کا آئینہ دار تھا۔ فرمایا: ''چھانٹی کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایک بڑی گاڑی لے کر آؤ اور سب کچھ اٹھا لے جاؤ۔'' میں نے جلد آنے کا وعدہ کیا۔

ماہ رمضان ختم ہوا تو رفیق صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی خواہش کی تکمیل کا تقاضا کیا۔ تاہم اس عرصے میں بڑی سوچ بچار کے بعد میں اپنا ارادہ تبدیل کر چکا تھا۔ چنانچہ ایک دن میں نے ان سے دل کی بات کہہ دی۔ میں نے کہا: ''رفیق صاحب! ڈاکٹر صاحب کی مہربانی اپنی جگہ، خدا انہیں تندرستی سے نوازے اور صدوسی سال عمر عطا کرے، میرا ضمیر گوارا نہیں کرتا کہ میں ان کے ہوتے ہوئے ان کی کتابیں سمیٹ لے جاؤں۔ اس سے ان پر بڑا برا نفسیاتی اثر پڑے گا۔ زندگی ان کے لیے بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ مجھے خوب یاد ہے جب دادا جان کے سکوں کا مجموعہ سیٹھ رادھا کرشنا جالان خرید کر لے گیا تھا تو اس کے بعد وہ بالکل لٹے لٹے سے لگتے تھے اور پھر جلد ہی

دنیا کو الوداع کہہ گئے تھے۔ میں ڈاکٹر صاحب کو اس کیفیت میں مبتلا نہیں دیکھ سکتا۔'' بات رفیق صاحب کی سمجھ میں آ گئی۔

اکتوبر کے دوسرے ہفتے کے آغاز میں ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ محترمہ کو دل کا سخت دورہ پڑا اور انہیں ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ اس سے ڈاکٹر صاحب کے دل پر جو گزری اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ۱۱ ستمبر کو جی سی یونیورسٹی لائبریری کے ڈپٹی چیف لائبریرین محمد نعیم صاحب ڈاکٹر صاحب سے ملنے گئے۔ انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب شدید تکلیف میں ہیں۔ بار بار کہہ رہے تھے: ''یا اللہ مجھے معاف کر دے۔ تو کب تک میرا امتحان لے گا؟'' یہ سن کر میرا دل بھر آیا۔ ۱۳ اکتوبر کو ہمارے دیرینہ دوست اور ڈاکٹر صاحب کے عزیز شاگرد پروفیسر عبدالجبار شاکر کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اس سانحے سے بھی وہ متاثر ہوئے۔ ۱۴ اکتوبر کو ان کا شعبہ فارسی میں آخری فون آیا۔ وہ بینک کی جی سی یونیورسٹی برانچ سے چیک بھنانا چاہتے تھے۔ شعبے سے مظہر خان کو بھیجا گیا جو ڈاکٹر صاحب سے چیک لے کر آئے اور پھر رقم پہنچانے گئے۔ ان سے پتا چلا کہ ڈاکٹر صاحب نڈھال ہو چکے ہیں اور چیک پر ان سے بمشکل دستخط کروائے گئے۔

اب وہ فون پر بات کرنے سے بھی قاصر ہو گئے تھے۔ بالآخر ۱۷ اکتوبر کی شام لاہور سے بابر نسیم آسی کا فون آیا کہ وہ سرشوریدہ بالین آسائش پر پہنچ گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

میں سوچا کرتا تھا کہ ہمارے ڈاکٹر صاحب مقبول بارگاہ الٰہی ہیں۔ اسی لیے وہ خالق اکبر انہیں طرح طرح کے عوارض اور صدموں کے ذریعے پاک صاف کر کے اپنے پاس بلانا چاہتا ہے۔

۱۸ اکتوبر کو نماز جنازہ کے بعد جب میں نے ان کے چہرے پر نظر ڈالی تو وہاں ایسا سکون اور طمانیت تھی جو معصومیت کی حدوں کو چھو رہی تھی۔ یہ کیفیت دیکھ کر میرا قیاس یقین کے درجے کو پہنچ گیا۔

میں استاد مرحوم کی یادوں پر مبنی اس داستان کو اپنے موزوں کردہ قطعۂ تاریخ وفات پر ختم کرتا ہوں۔

اوستادِ من آں وحید العصر
چون رواں شد بسوی دار بقا
کرد مارا رہینِ رنج و الم

دستِ شفقت کشید از سرِ ما

وای آں مردِ عرصۂ تحقیق

آہ آں بذلہ سنج و بزم آرا

اندریں عالم غم و اندوہ

دست · افراشتم برای دعا

حق دلیلش کناد ''کاف'' کرم
۲۰

''الف'' اسم ذات باد عصا
۱

گشت تاریخ رحلتش ''یا رب

در بہشتِ بریں بیابد جا''

۱۴۰۹+۲۰+۱=۱۴۳۰ھ

حواشی

۱- ''ہر چند کہ محبوب کے آگے اظہار ہنر کرنا بے ادبی ہے (اس لیے) ہمارا منہ عربی (فصاحت و بلاغت) سے پُر ہونے کے باوجود ہماری زبان خاموش ہے۔''

۲- (۱) ''جب میرے وحید العصر (یکتائے زماں) استاد دار البقا کو روانہ ہوئے۔

(۲) ہمیں رنج و غم میں مبتلا کر گئے (کہ) ہم ان کے دست شفقت سے محروم ہو گئے۔

(۳) افسوس ہے اس تحقیق کے مرد میدان پر (جو) اپنی برجستہ گفتگو سے محفل کی رونق تھا۔

(۴) اس غم واندوہ کی کیفیت میں میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔

(۵) حق تعالیٰ اپنے ''کاف'' کرم کی کشش کو ان کا رہنما بنائے اور اسم ذات (اللہ) کا ''الف'' ان کو عصا کا کام دے۔

(۶) ان کی تاریخ وفات یہ ہوئی کہ الٰہی! وہ بہشت بریں میں داخل ہوں۔

بارہ شخصی خاکوں پر مشتمل زیر نظر کتاب نہ صرف بیسویں صدی کی بارہ اہم شخصیات کی حیات کے مختلف اور رنگارنگ پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے بلکہ خاکہ در خاکہ گذشتہ صدی کے علمی وفکری تسلسل کی داستان ہے۔ کتاب کے مصنف مظہر محمود شیرانی کا تعلق ایسے ہی خانوادے سے ہے جو تین نسلوں سے اس میراث کو لوحِ دل پر محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ ان تحریروں کو پڑھتے ہوئے آپ یہ بھی جان پائیں گے کہ گذشتہ صدی میں ہمارے ہاں ادبی، سیاسی، تعلیمی اور دانشورانہ سطح پر ہر میدان میں مکالمہ کیسے جاری تھا۔

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے بعد اس مکالمہ میں جو ٹھہراؤ آیا اس کی وجہ سے انتہا پسندیوں نے ہمارے ہاں بسیرا کر لیا۔ زیر نظر کتاب کے مطالعے سے آپ یہ بھی جان لیں گے کہ اس دھرتی نے ایسے ایسے لعل وگوہر پیدا کیے جنھیں اختلافات کے ساتھ نباہ کرنا ہی نہیں آتا تھا بلکہ وہ نمود و نمائش سے بھی الگ ہی رہے۔

کوئی وجہ نہیں اگر ہم اپنی علمی وفکری روایت سے خود کو دوبارہ جوڑ لیں اور اختلافات کے ساتھ جینے کا ڈھنگ اپنالیں تو اس بھنور سے نہ نکل سکیں جس میں آج ہم بحیثیت مجموعی گرفتار ہیں۔

خاکے
ISBN 978-969-9473-24-1
9 789699 473241 >
www.ilqapublications.readings.com.pk
Rs. 590

القا پبلیکیشنز
ریڈنگز کا اشاعتی ادارہ
لاہور